

پرتو

قرآنیاتی

حمیری

PAK Society LIBRARY OF
PAKISTAN

ONE SITE ONE COMMUNITY

ایک تاریخی ناول

پرتھال

قمر اجٹالوی

مکتبہ القریش

تذاتی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

فون: 7352835-7231595

حمیلہ

ہملہ حقوق محفوظ ہیں

عبدالحمید قریشی	ناشر
نیز احمد پرنٹرز لاہور	مطبع
کلاسک کمپیوٹرز	کمپوزنگ
500	تعداد
2006ء	سن اشاعت
250/- روپے	قیمت

مکتبہ القریشی لاہور بازار لاہور

انتساب

اپنے دوست اور رفیق شبلی ایم۔ کام کے
نام جو چوبیس سال کے بعد لی۔ کام کے
چنگل ہے رہا ہوئے۔

قمر اجالوی
۱۳ اگست ۱۹۶۱ء

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

مصنف

نیم مارچ ۱۹۳۱ء کو امرتسر (بھارت) کی تحصیل اجتالہ میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں جب نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے۔ پہلا تاریخی ناول ”معرکہ پانی پت“ کے نام سے لاہور میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں وہ خود بھی لاہور آ گئے اور یہاں ایک طرف آنرز ان اردو، آنرز ان فارسی اور آنرز ان عربی کے امتحانات دیئے وہاں دوسری طرف تالیف و تصنیف اور شعر و افسانہ کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا اور ماہنامہ ”عالمگیر“ اور ”خیام“ کے مکتوبوں میں شہرت پائی۔ ۱۹۴۷ء میں ایک دوست کے ساتھ نل کر ماہنامہ ”ساغر“ جاری کیا پھر ہفت روزہ ”انارکلی دنیا“ نکالا۔

۱۹۴۸ء میں انہوں نے روزنامہ ”اسلم“ کی ادارت سنبھالی اور آزادی کشمیر پر دلولہ انگیز ادارے لکھے۔ انہی خیام میں ہفت روزہ ”اداکار“ میں کام کیا ۱۹۵۳ء میں سول اینڈ ملٹری گزٹ لیٹنڈ نے اردو اخبار ”ملت“ جاری کیا تو انہیں مدبر و معاون کی حیثیت سے منتخب کیا گیا اور وہ اپنی منفرد کالم نویسی کے باعث بہت جلد اخباری اور سیاسی حلقوں میں مشہور ہو گئے۔ تین سال کے بعد ”ملت“ بند ہو گیا تو وہ کچھ عرصہ روزنامہ ”سری پاکستان“ میں بطور ادارہ نویس کام کرتے رہے پھر حمید نظامی مرحوم نے اپنے اخبار ”نوائے وقت“ کا مشہور کالم ”سر رہے“ ان کے سپرد کر دیا۔ قمر اجتالوی حمید نظامی کی رحلت تک ”نوائے وقت“ سے منسلک رہے پھر اخبار سے الگ ہوئے۔

آج کل ان کا بیشتر وقت تالیف و تصنیف یا پھر اخبار نویسی میں گزرتا ہے۔ وہ شعر و ادب میں ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں۔

ناشر
محمد علی قریشی

حرف آغاز

تاریخ کے بعض اوراق تاریخ دسیر کے طالب علم کو خود بخود تعینف کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن اردو میں جو تاریخی علی الخصوص ”اسلامی تاریخی ناول“ رائج ہو چکے ہیں ان کو دیکھ کر یہ حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ میں بھی کوئی تاریخی ناول لکھوں۔ ان ناولوں میں تاریخی حقائق ہی کو مسخ نہیں کر دیا جاتا بلکہ عشق و محبت کی بعض فرضی کہانیاں کچھ اس بھوڑے انداز سے تاریخی غلاف میں لپیٹ کر پیش کی جاتی ہیں کہ انہیں تاریخ سے نسبت دیتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ تاریخ بہر حال ایک اہم دل چسپ اور عوامی موضوع ہے۔ جسے افسانوی ادب میں ڈھالنے کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پھر تاریخی ناول نویسی کے مروجہ اسلوب و انداز کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔ ”پرتقال“ میں نے اسی خیال کے تحت لکھی ہے۔ اور اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا ہے۔ یہ تاریخی ناول اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جسے میں نے ایک افادہ مقصد کے تحت شروع کیا ہے۔ میں نے افسانہ کو تاریخ بنانے کی غلطی نہیں کی۔ البتہ تاریخ کو افسانہ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اگر میرے پڑھنے والے اس سلسلہ کو پسند کریں تو مجھے ذیل کے پتے پر اپنے مشورہ سے مستفید فرمائیں۔

قراچا والی

روزنامہ ”مغربی پاکستان“

بیٹن روڈ، لاہور

نگاہ کے جادو

طلسمی آواز

باپوں کی آواز دادی کا سینہ زخمی کرتی ہوئی ابھری جیسے جھیل میں پتھر پھینک دینے سے پانی کی پرسکون سطح پر بے ترتیب لہریں کھڑ جاتی ہیں۔

اُس آواز کے ساتھ ہی سر سبز نیلے پر بیٹھے ہوئے چرواہے کی بانسری کی تان ٹوٹ گئی اُس نے گردن اٹھا کر سامنے نظر دوڑائی۔ دُور مدھکل کے راستے پر دو سوار گھوڑے اُڑائے چلے آ رہے تھے۔ جب وہ درختوں کی اوٹ سے نکل آئے۔ تو چرواہے نے اپنی آنکھوں پر دائیں ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے انہیں دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کی پھر اچانک ایک سمت کو بھاگ نکلا۔

سواروں کی رفتار سے معلوم ہوتا تھا۔ انہیں کوئی غیر معمولی مہم درپیش ہے اور وہ جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتے ہیں اُن کے گھوڑوں کے بدن پسینے میں شرابور تھے اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اس کے باوجود سوار انہیں ایڑ لگانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ سورج نے ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا اور اُس کی روشن کرشمیں درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھیں۔

نیلے کے قریب پہنچ کر جہاں ایک موڑ دو راستوں کو جدا کرتا تھا انہوں نے ایک لخت اپنے گھوڑوں کی لگا میں سمجھ لیں اور ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے دونوں کی نگاہیں پوچھ رہی ہیں اب انہیں کس طرف جانا ہے؟ اُن کی منزل کا راستہ کون سا ہے؟

دونوں سوار نوجوان اور خوش وضع تھے مگر اُن میں سے ایک نوجوان کا لباس اور سر پر کلفی کا نشان صاف ظاہر کر رہا تھا کہ دکن کی بھٹی سلطنت کے دلی عہد شہزادہ حسن خاں کے سوا اور کوئی نہیں۔ دوسرا یقیناً اس کا جاں نثار دوست اور محرم راز رفیق بیگ تھا جو نہ صرف دلی عہد کا دوست بلکہ دربار بھٹی کا ایک معتد دکن تھا۔ یہی وجہ تھی سلطان معظم کی طرف سے اسے سر ہزاری کا منصب حاصل تھا۔ قد و قامت چہرے مہرے اور آنکھوں کی عتالی چمک کے اعتبار سے شہزادہ حسن خاں خاندان بھٹی کی روایتی دلکشی اور شان و شوکت کا مظہر تھا۔

اپنے بہادر باپ کے شانہ بشانہ اُس نے کئی لڑائیوں میں اپنی خادار شکاف کھوار کے جوہر دکھائے تھے اور اس عمر میں کرناٹک کے سورماؤں کے خلاف کئی مرتبہ اس نے شاہی فوج کی کان سنجال کر ثابت کر دیا تھا کہ اپنے باپ کی طرح نوجوان شہزادہ مرد میدان ہے۔ انہی سرکردہ آرائیوں کے صلے میں سلطان نے اُسے دلی عہد کا شرف بخشا تھا۔ حالانکہ سلطان کے شمشیر زن بھائی امیر الامراء احمد خاں خاندان کی موجودگی میں کسی نوجوان شہزادے کا اس منصب پر فائز ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔

احمد خاں خاندان سلطانی فوجوں کا سپہ سالار ہی نہیں بلکہ اُن کے مزاج سے بھی واقف تھا اور خوب جانتا تھا کہ دکن کی ایسے ملک میں جو سورما نرہنوں، کرناٹکی دلیروں اور بیجا نگر کے بہادروں سے گھرا ہوا ہے۔ ہر حکمران کو اپنی تلوار بے نیام رکھنا پڑتی ہے ورنہ حریف انہیں ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے اور اگر گزرتے تمام مہاراجے جانتے تھے۔ احمد خاں جیسے ہوشیار اور عقاب نظر سپہ سالار کی موجودگی میں دکن کے کسی حصے پر حملہ کرنا اپنی موت کو دعوت دیتا ہے۔ عام خیال یہی تھا کہ سلطان فیروز شاہ اپنے بعد احمد خاں ہی کو تاج و تخت کا وارث بنائے گا لیکن جب شہزادہ حسن خاں نے یکے بعد دیگرے دو لڑائیوں میں دشمنوں پر فتح حاصل کر کے اپنی برتری اور عظمت ثابت کر دکھائی تو سلطان نے اُسے دلی عہد نامزد کر دیا اور اپنے بھائی کو اس کے بعد جانشین مقرر کر دیا۔

دکن کے ارد گرد خطروں کے جوہال بچے ہوئے تھے شہزادہ حسن خاں بھی اُن سے غافل نہ تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا اس سرزمین پر حکومت کرنے کے لئے اُسے اپنا ہاتھ کھوار کے قبضے پر رکھنا ہوگا۔ یہی وجہ تھی وہ خود فوجی معاملات کی نگرانی کرنے لگا تھا۔

چند روز مختصر اسے خبر ملی تھی کہ بیگانہ کا مہاراجہ دیوارے اپنے کسی سواروں کے ہمراہ

دو پہلے ٹنگ بھدرا کے کنارے کنارے گشت کر رہا ہے۔ یہ دریا دکن اور بنگال کے درمیان
حد فاصل کا کام دیتا تھا اور اس کے کنارے دشمن کی سرگرمیاں یقیناً نظر انداز نہیں کی جاسکتی
تھیں۔ یہ خبر سننے ہی حسن خاں نے سرحدی ضلع مدگل کے حاکم فواد خاں کو پیغام بھیجا تھا
کہ وہ دیوارے پر نظر رکھے اور خود اپنے فوجی دستے کو لے کر مدگل کی طرف چل پڑا تھا۔
شہزادہ جلد سے جلد مدگل پہنچ جانا چاہتا تھا تا کہ اگر دیوارے کی نیت میں خور و کھے تو
اس کی گوثالی کر سکے، دشمن کو اچانک جا لینے کے شوق میں اس نے اپنے فوجی دستے کو بھی
پیچھے چھوڑا اور رونق یک کے ہمراہ بہت آگے نکل آیا تھا لیکن اب دور ہے پر کھڑا وہ حیران
تھا کہ کون سا راستہ اختیار کرے۔ اس سے پہلے ان دونوں میں سے کسی کو بھی مدگل کا سفر
کرنے کا موقعہ پیش نہ آیا تھا۔

”ہمیں اپنے سپاہیوں کا انتظار کر لینا چاہیے جاننا عالم“ رونق یک نے مشورہ دیا۔

”شہباز خاں اس راستے سے اچھی طرح آگاہ ہے۔“

”لیکن سپاہی بہت دیر سے آئیں گے اور میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔“

”مجبوری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ رونق یک نے اپنے شانے سکڑ لئے۔

”کابلی کا ایک نام مجبوری بھی ہے۔“

یہ کہہ کر شہزادہ حسن خاں نے ابھر ادھر نظریں دوڑائیں اور نیلے کے عقب میں ایک
چرواہے کو ڈھور ڈھگر بھاگتے دیکھ لیا۔ حسن نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چند ہی لمحوں میں اُسے
جالیا چرواہا کسی نامعلوم خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ شہزادے کو دیکھتے ہی وہ ہاتھ باندھ کر
کھڑا ہو گیا۔

”کیا تم بتا سکتے ہو۔ مدگل کو کون سا راستہ جاتا ہے؟“

چرواہے نے فنی میں سر ہلا دیا اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن حسن کو کوئی لفظ سنائی
نہ دے سکا۔ اس نے فطرت کی جنبش سے اندازہ لگایا کہ وہ راستے سے بے خبر ہے۔

”گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟“ شہزادے نے پوچھا۔

”بس کوئی ڈیڑھ گھنٹہ۔“

یہ کہہ کر چرواہا تو گامیوں کے پیچھے چل دیا اور شہزادے نے ناگ موڑ لی۔ وہ سوچ رہا

تھا کہ گاؤں میں جا کر اپنی منزل کا راستہ دریافت کر سکا ہے۔

یہ ہری بھری داوی جہاں ایک طرف اونچے نیچے نیلے اور سرسبز کھیت تھے اور دوسری طرف جنگل کے ساتھ ساتھ سانپ کی طرح بل کھاتی اور رنگتی ہوئی ایک ندی تھی جو ہر مسافر کو دعوت نگاہ دے رہی تھی۔ یوں تو دکن کی سطح مرتفع اور اس کے میدانی علاقے اپنی شادابی و رعنائی کے لئے ہمیشہ سے مشہور ہیں لیکن اس داوی کے بہار آفریں نگارے جنت نگاہ تھے اور جی چاہتا تھا اس کی تازگی اور خوشبو کو دل و نگاہ میں سمو لینے کے لئے آدی یہیں ڈیرا ڈال دے۔

شہزادہ حسن کے سر پر مدگل پہنچنے کی دھن کچھ اس طرح سوار تھی کہ ان زندگی افروز مناظر کی طرف مطلق توجہ نہ دے سکا۔ وہ کسی فکر میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ لوٹ رہا تھا اور اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا۔ سفر کا التوا اس کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔

لیکن اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ سپاہیوں کے پہنچنے تک اُسے مجبوراً رکنا پڑے گا اور کیا معلوم وہ کتنی دیر میں پہنچیں گے؟

وہ اسی سوچ بچار میں گم تھا کہ بچا تک ایک آواز اُسے چونکا دیا ایک سریلی اور مدبھری آواز۔ ایک مدھر گیت کی لے۔ ایک دلکش، بہار آفریں اور سحرور انگیز نغمے کی تان جو جاوہ کی طرح رس گھولتی ہوئی ڈبھری اور ٹھٹھے کی مانند لگتی ہوئی اس کے دل میں اتر گئی۔

اس نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور سحر زدہ حالت میں اپنے کان اس آواز پر لگا دیئے یہ آواز بل کھاتی ہوئی ندی کے اس پار درختوں کے جھنڈ میں گونج رہی تھی اور ایک زنجیر بن کر حسن کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس آواز میں ایک ہوز تھا، جوانی کی تپش تھی، ایک پیغام تھا، ایک بلاوا تھا، حسن نے حیرت پاش نظروں سے درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا اور پھر اس نے اپنے گھوڑے کا زرخ ندی کی طرف موڑ دیا۔

ایک کتاب ایک مضمون

اپنے ہاتھوں سے جہازوں کو بنایا ہوا جب وہ آگے بڑھا تو اس کے قدم ٹھک کر رہ گئے آنکھوں میں چسے بھلی سی کوند گئی۔ اس کے سامنے ایک حسین نور جواں سال دو شیرازہ

شاخوں کے جھرمٹ میں جادو بکھر رہی تھی۔ شہزادہ آواز سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ الہر حسینہ ارد گرد سے بے خبر گانے میں مگھ تھی۔

پھر اچانک گیت کی لے ٹوٹ گئی۔ لڑکی جنگلی ہرنی کی طرح چونک اٹھی اور اپنی ملائم سی نگاہی ساڑھی میں گھڑی بن گئی۔ شاخوں کی اوٹ میں اس نے ایک اجنبی کو گھورتے دیکھ لیا تھا اور اس کی سبھی سبھی سی نگاہیں حسن کی کلفتی پر ٹپک کر رہ گئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی ہے لیکن نامعلوم قوت نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہیں اور یہ نامعلوم قوت شہزادہ حسن کے بھال اور شاعی جلال کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتی تھی۔ حسن آگے بڑھا اور شاخوں کو ہٹا کر لڑکی کے سامنے آ گیا۔ اُن کی نگاہیں چار ہوئیں اور پھر زمین پر آ رہیں۔ دونوں کی قوت گویائی جیسے سلب ہو چکی تھی پھر حسن نے ذرا جرأت سے کام لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”مجھے دیکھتے ہی تم نے گنا کیوں بند کر دیا؟“

حسن نے محسوس کر لیا کہ اُس کی آواز میں لرزش ہے حالانکہ یہی آواز محل میں دُزلہ پیدا کر دیا کرتی تھی اور اسی آواز کو سن کر سپاہیوں کے بدن کانپ جایا کرتے تھے لیکن آج ایک اجنبی لڑکی کے سامنے اس کی آواز خود کانپ رہی تھی۔

لڑکی نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

”تمہاری خاموشی کے ساتھ ہی جیسے کائنات کی گردش ختم ہو گئی ہے۔۔۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں۔“

لڑکی اس مرتبہ بھی خاموش رہی۔

”کیا تمہیں میرا آواز اگلا ہے؟“ حسن اُس کے اور قریب ہو گیا۔

”ہاں۔۔۔“ لڑکی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی لیکن ”نہیں“ کہہ کر اُس نے پھر چپ

سادہ لی اور ساڑھی کا آچل پیٹنے لگی۔

”تمہاری آواز کی کشش مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ ایسی دلکش آواز میں نے پہلے

کبھی نہیں سنی۔ تمہارے نکلے میں جادو ہے۔“

”شکریہ!“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”لیکن تم باتیں کرنے سے ہٹ چکا کیوں رہی ہو؟ ایک مسافر کو اپنی آواز کے جادو سے

مردم نہ رکھو۔" اچانک حسن کو جیسے فنگو کا ذریعہ سوجھ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"پرتھال۔"

"بہتر ہو؟"

"جی۔۔۔۔"

"گوت کیا ہے؟"

"شارا۔"

شہزادہ چونک اٹھا۔ ایک شادری لڑکی اتنا اچھا گاسکتی ہے۔ یہ بات اس کے دہم میں بھی نہ آسکتی تھی۔

"پھر تو تمہارا نام کنڈن دھنا چاہیے تھا۔" شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا پرتھال نام بدلے؟" اب کے لڑکی کے لیے میں بھی ذرا حلقشلی تھی۔

"جیس۔۔۔۔۔ بڑا پیارا نام ہے پرتھال۔ کسم از کسم مجھے تو بہت اچھا لگا ہے اس نام میں

بھی ایک موسیقی ہے۔ نرتال ہے۔"

لڑکی شرمانی گئی۔۔۔۔۔ پھر اس نے اپنی خواب گوں آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی۔

"اور آپ؟"

"میرا نام حسن خاں ہے۔"

"اگر میں غلطی نہیں کرتی تو آپ فیروز آباد سے آئے ہیں؟"

"تمہارا اعزازہ صحیح ہے۔"

"اور۔۔۔۔۔ یہ بھی کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"ممکن ہے یہ قیاس درست نہ ہو۔" حسن نے جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کی کوشش

کی۔ "فیروز آباد میں صرف شاہی خاندان ہی نہیں رہتا اور بھی بے شمار لوگ بستے ہیں۔"

"آپ نے صحیح بات کہی ہے لیکن میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" پھر پرتھال نے

حسن کے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی مچھری پر نکلنے کا یہ نشان صاف بتا

رہا ہے کہ میں اس وقت دکن کے ولی عہد سے ہمکلام ہوں۔"

یہ سب کچھ اتنی غلٹ سے ہوا کہ شہزادہ حسن تقریباً بوکھلا اٹھا۔ پر قتال کے جلوہ حسن میں وہ کچھ ایسا کھو گیا تھا کہ اپنے سر پر شاہی کٹنی کو بھی بھول بیٹھا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مسکرا کر بولا۔

”تمہاری حقیقت شناس نگاہیں تو انعام کی مستحق ہیں۔ واقعی تم نے مجھے پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔“

اور ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر پر قتال کی خوبصورت گردن میں ڈال دیا جو ابھی تک سر جھکائے کھڑی تھی۔ شہزادے کی اس مہربانی سے پر قتال ایک مرتبہ پھر ہرنی کی طرح بدک سی گئی۔ حسن نے اس کے چہرے کی گھبراہٹ بے غائب کی۔

”کیا تمہیں یہ انعام پسند نہیں آیا؟“

”میری کیا مجال ہے کہ شاہی انعام کو ناپسند کروں۔“

”لیکن معلوم ہوتا ہے تم انعام پا کر خوش نہیں ہوئیں۔ کیا میرا اندازہ غلط ہے۔“

”نہیں آپ بجا فرماتے ہیں۔“

”تو پھر میں اس کی وجہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ شہزادے کے لہجے میں تعجب کی

جھلک تھی۔ وہ حیرت پاش نظروں سے پر قتال کی طرف دیکھنے لگا۔

ایک لمحہ رک کر پر قتال کہنے لگی۔ ”شہزادوں کے انعام غریبوں کے لئے کبھی کبھی

بدبختی کا سبب بن سکتے ہیں مہاراج!“

”کیا مطلب؟“

”پر دہلی راجہ کا خواب بن کر آتے اور گزر جاتے ہیں لیکن اپنے پیچھے کچھ ایسی

کہانیاں چھوڑ جاتے ہیں جو انعام پانے والوں کو سانپ بن کر ڈس رہتی ہیں۔“

ابن ایک ہی فخرے میں پر قتال بہت کچھ کہہ گئی تھی۔ ایک پورا افسانہ جسے سمجھنے میں

حسن نے کوتاہی نہیں کی۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ اس کا بھٹا ہوا انعام واقعی ایک ایسی

کہانی کا عنوان بن سکتا ہے۔ جو گاؤں گاؤں پھیل سکتی ہے اور لوگوں کا کیا ہے وہ تو ایک ہی

لفظ کو افسانہ بنا لیتے ہیں۔ تو کیا اسے اپنا انعام واپس لے لینا چاہیے؟

حسن نے ایک لمحہ غور کیا پھر اسے خیال آیا افسانہ حقیقت کا روپ بھی تو دھار سکتا ہے

”انعام بدلے کا طالب نہیں ہوتا۔“

”لیکن ہیئت کرنے والے کو خالی ہاتھ لوٹنا بھی اچھا نہیں۔“

پرتھالی کے ان الفاظ نے حسن کو مبہوت کر دیا اسے محسوس ہوا وہ گفتگو کرنے کا سلیقہ جانتی ہے اور یہ بھی سمجھتی ہے کہ ایک شہزادے کے اظہار محبت کا جواب کن الفاظ میں دینا چاہیے۔ اس سے صاف ظاہر تھا وہ دیہات کی عام لڑکیوں کی طرح گنوار نہیں۔ بلکہ ذہین اور پڑھی لکھی ہے۔ یہ انکشاف حسن کے لئے مسرت کا باعث ہوا۔ وہ بولا۔ ”مگر تم چاہو تو مجھے بھی ایک تحفہ دے سکتی ہو۔“

پرتھالی نے حیران ہو کر پوچھا۔۔۔ ”بھلا ایک غریب لڑکی ایک شہزادے کو کیا تحفہ دے سکتی ہے؟“

اس کے جواب میں حسن نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔۔۔

”اپنے ہونٹوں کی مسکراہٹ۔“

اور غیر اختیاری طور پر پرتھالی کے ہونٹوں پر ایک جگمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس نے شرم کر گردن جھکا لی گویا اس نے شہزادے کو اپنی محبت کا ثمرہ بخش دیا تھا اس کے انعام کا بدلہ چکا دیا تھا۔ حسن کا کپکپاتا ہوا ہاتھ ابھی تک پرتھالی کی ٹھوڑی پر تھا اور وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی انگلیاں ایک ایسی کتاب کا ورق الٹ رہی ہیں جس کا مضمون وہ خود بین گیا ہے۔

بیجانگر کا مسافر

پرتھالی نے جب گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو یہ دیکھ کر ٹھٹھکی گئی کہ جن میں اس کے گورو دیو کا سامان بندھا رکھا ہے اور وہ سفر کی تیاری کر رہے تھے۔۔۔

بوڑھا برہمن گورو رکھتا تھا جو بیجانگر میں اپنے علم و فضل، و عزم و جہاد اور راگ و دیا میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ ایک سال پہلے جب کاشی کی تیرتھ یاترا کے بعد بتاریں سے لوٹا تھا تو اس نے وکن میں بھی کئی مقامات پر لوگوں کو اشیراودی تھی اور پھر مدگل کے اس گاؤں میں اس نے پرتھالی ہی کے گھر قیام کیا تھا۔ بوڑھے سارے نکھیت کی زبان سے وہ یہ بات سن کر

حیران رہ گیا تھا کہ اس کی جواں سال لڑکی پر قتال نہ صرف دکن کی مسلمان عورتوں کی طرح پروے میں رہتی ہے بلکہ اسے گھانے کا بھی بڑا شوق ہے اور اکثر تنہائی میں بیٹھ کر وہ اپنے دل کے تار چھیڑ دیتی ہے۔

گورکھ ناتھ تو فن موسیقی کا استاد تھا۔ اس کے نئے بیجاگر کے راج دربار میں گونجتے تھے اس نے فوراً حکم دیا تھا پر قتال کو میرے سامنے پیش کیا جائے۔ برہمن مہاراج کا حکم کیسے ٹک سکتا تھا۔ پر قتال اس کے چرنوں میں شہادی گئی اور ماں باپ نے ہاتھ باندھ کر بوڑھے برہمن سے درخواست کی وہ اُن کی بیٹی کے لئے پراقتنا کرے۔ گورکھ ناتھ نے جب لڑکی کو بے حجاب دیکھا تو اس کے حسن و جمال پر دنگ رہ گیا پھر اس نے کہا۔

”بیٹی! میں نے سنا ہے تو سنگیت بھی جانتی ہے۔ بھلا مجھے کوئی گانا تو سنا۔“

پھر پر قتال نے ستار سنبھالی اور ایک ایسا گیت چھیڑ دیا۔ جس نے گورکھ ناتھ کے دماغ میں پچھل چلا دی۔ وہ سوچے لگا یہ آواز تو کئی ختمے چکا سکتی ہے۔ اس کے گلے میں جادو ہے۔ ایک ایسا جادو جو راہکاروں اور مہاراجوں کا دل موہ سکتا ہے اور اسی لئے بوڑھے برہمن نے یہ فیصلہ کر لیا وہ پر قتال کو سنگیت کی رانی بنائے گا۔ اسے راگ وڈیا سکھائے گا جب اس نے پر قتال اور اس کے ماں باپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ سب بوڑھے برہمن کے قدموں پر گر پڑے۔

اس دن کے بعد بوڑھے گورکھ ناتھ نے پر قتال کو راگ وڈیا سکھانا شروع کی اور ایک ہی سال کے عرصے میں اس نے سنگیت میں پوری مہارت حاصل کر لی۔

پر قتال اپنے گورو دیو کے سامنے بیٹھ کر جب راگ الاہنا شروع کرتی تھی تو برہمن کا دل سنگیت ساگر کی لہروں پر ڈمک ڈمک ڈولنے لگ جاتا تھا۔ کبھی کبھی پر قتال عری کے کنارے درختوں کے نیچے جھنڈ میں بیٹھ کر بھی اپنے مدھر گیت فضا میں بکھیرتی سارے گاؤں میں اس کے سنگیت اور جادو بھری آواز کا جہ جاتا تھا۔ کئی لوگوں نے ستار کے گھر کے چکر کاٹے تھے اور وہ بھی پر قتال کی خاطر اس کے دروازے پر دولت کے ڈھیر لگانے پر تیار تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں پر قتال کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ وہ کہتیں:

”ستار نے کسی ٹھیکان بیٹی پائی ہے۔ سونے میں تلے گی۔“

لیکن پر قتال پر جیسے ان باتوں کا کوئی اثر نہ تھا، وہ کسی اور ہی دھن میں مگن تھی۔

ان فضاؤں اور ہواؤں سے بہت دور وہ ایک نئی دنیا کے سنے دیکھ رہی تھی اور اُن اُونچے اور نیلے پرتوں کے اس پار جہانک رہی تھی جہاں سورما مہابیر اپنے کندھوں پر کام دیو کی طرح کمانیں لٹکائے گھوم رہے تھے۔۔۔ ہر روز وہ سنی کہ آج فلاں جگہ سے رشتہ آیا ہے آج فلاں زمیندار نے اپنی دولت دینے کا وعدہ کیا ہے۔ آج فلاں ساہوکار نے درخواست بھیجی ہے وہ سب کچھ سنی اور مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ اس مسکراہٹ کا مطلب یہی تو تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس کی قیمت نہیں چکا سکتا۔ کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس کے حُسن کا مختار بن سکے لیکن اُسے اپنی قسمت کے خریدار کا انتظار تھا اور یہ یقین بھی کہ وہ ضرور آئے گا۔ ان اُونچے اور نیلے پرتوں سے بادلوں کے گھوڑے پر سوار اس کے خوابوں کا شہزادہ ضرور اس دھرتی پر اترے گا اور پھر۔۔۔

مگر کوئی نہ جانتا تھا پرتھال کے دل میں کون سا قندہ پرورش پارہا ہے ادھر بوڑھے ماں باپ دن رات شادی کی فکر میں گھلے جا رہے تھے۔ باپ کہتا:

”گورو دیو! آپ ہی اس کو سمجھائیں۔ آخر کہیں نہ کہیں اس کا بیاہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ ہاتھی راجہ مہاراجوں کے دروازوں پر بھی نہیں بندھے رہتے اور میں تو ایک غریب ستار ہوں۔ کنواری کنیا کو کب تک گھر میں بٹھا سکتا ہوں۔ بیٹی کے بوجھ سے تو میری کمر بھی دوہری ہو چلی ہے۔“

لیکن بوڑھا گورو کہتا تھا خاموشی جیسے اس نے لب ہی لئے ہوں یا اس کے سامنے پرتھال کی شادی کا نہیں بلکہ کسی گڑیا کے بیاہ کا ذکر ہو رہا ہو۔ اس نے کبھی اس مسئلے پر اپنے خیال کے اظہار کی ضرورت محسوس نہ کی کبھی بوڑھے لکھت کے سوال کا جواب نہ دیا۔ برہمن کی اس پراسرار خاموشی نے ستار کو ایک نئی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ سوچتا آخر یہ سوال کچھ ایسا ناقابلِ فہم تو نہیں جو گورو دیو کی سمجھ میں نہ آ سکے۔

شادی۔ ایک آسان سا مسئلہ ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ پھر پندت گورو کہتا تھا ستار۔ بوڑھوں پر خاموشی کا تالا کیوں پڑ گیا ہے؟ وہ جواب کیوں نہیں دیتے۔ وہ کیا سوچتے رہتے ہیں۔۔۔ کہاں گم ہو جاتے ہیں؟ اور پرتھال کی شادی کے ساتھ اب پندت گورو کہتا تھا ستار کی پراسرار خاموشی بھی بوڑھے لکھت کے لئے ایک پریشانی بن گئی تھی۔ یہ خاموشی دراصل ہتھوڑی کی ضرب تھی جس نے ستار کے دل میں نئے خطرے کی دھمک بیدار کر دی تھی اور وہ چاہتا تھا

جیسے بھی ہو برہمن کی خاموشی کا بھید معلوم کر لے۔ اسی لئے اس نے کئی بار دریافت کیا تھا۔
 ”مہاراج پر قتال کے بارے میں جب بھی پوچھا جاتا ہے۔ آپ چپ ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ آخر آپ آگیا کیوں نہیں دیتے؟“

لیکن پہلے کی طرح برہمن بدستور خاموش رہا تھا اور آج بوڑھے سار کو حیرت میں چھوڑ کے۔۔۔۔۔ اس کے سوال کا جواب دیتے بغیر اپنی پراسرار خاموشی کا راز اپنے سینے ہی میں چھپائے وہ بیجا نگر کی طرف رخصت ہو رہا تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا اس کی اچانک روانگی کا سبب کیا ہے۔

پر قتال کے قدم دہلیز پر ہی جم کر رہ گئے۔ بوڑھے برہمن نے جو پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں پہن رکھا تھا۔ اس کی پریشانی کو بھانپ لیا اور بولا۔

”آؤ بیٹی! اپنے گورو دیو کو رخصت کرو۔ آج میں بیجا نگر جا رہا ہوں۔“

معلوم ہوتا تھا برہمن بھی پر قتال ہی کا منتظر تھا۔ اس کے آتے ہی وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ پر قتال نے آگے بڑھ کر گورو کے چرن چھو لئے۔

”مگر گورو دیو آپ نے کبھی جاننے کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔ اس اچانک روانگی کا کارن میں نہیں سمجھی۔“

”اری بیٹی۔ میں تو بیجا نگر کا مسافر ہوں۔ کاشی سے لوٹا تو یہاں آٹھ ماہ تک تہیاری عکسیت دے دیا پوری ہو چکی ہے۔ اب مجھے اپنے دیس جانا ہے۔“

”آپ کچھ دن اور بٹھرتے تو اچھا تھا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میرے قیام کے دن پورے ہو چکے۔ اب میں نہیں ٹھہر سکتا لیکن پھر آؤں گا تمہارے جیون کے لئے ایک نیا سناؤں لے کر۔ اس لئے میرا جانا ضروری ہے۔“

”نئے سناؤں“ کا ذکر سن کر بوڑھا کھپت چوٹ اٹھا۔ اب کے جی میں آئی کہ

برہمن کی روانگی سے پہلے وہ اپنا سوال دہرائے اور پوچھے۔

”مہاراج! میرے سوال کا جواب آپ نے آج تک نہ دیا۔ کیا یہ سوال کچھ اتنا ہی

میزا تھا؟“

پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ اس موقع پر یہ سوال شاید مناسب نہیں لیکن برہمن

نے کھپت کے چہرے پر دل کی بات پڑھ لی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

”ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے لکھت! تم نے جو سوال مجھ سے کیا تھا ابھی اس کے جواب کا وقت نہیں آیا۔ کچھ دیر اور انتظار کرو۔“

یہ کہہ کر گورکھ ناتھ نے پرتھال کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُسے اشیرواد دی اور وردوارے سے باہر نکل گیا۔ باہر ایک تیل گاڑی تیار تھی۔ برہمن لپک کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ بیلوں کے گلے میں گھنٹیاں بجا اٹھیں اور گاڑی ہولے ہولے پیچانکر کے راستے پر ہوئی۔ بوڑھا لکھت اور گاؤں کے کچھ لوگ تھوڑی دور تک گاڑی کے ساتھ ساتھ چلے پھر ایک موڑ پر گورکھ ناتھ نے ہاتھ جوڑ کر کیا نمنسکار کیا اور ان سے آخری رخصت لی۔

پرتھال گھر کی دلیز پر کھڑی اپنے گورو دیو کی روانگی کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ آج تو اُسے اپنے استاد سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اسے بتانا تھا کہ وہ جس شہر اوسے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ آگیا ہے۔ اس کی قسمت کا سوداگر اور وہ اس کی نگاہوں کی غمار اس میں ٹل آئی ہے لیکن پیچانکر کا مسافر اس کے دل کی دھڑکنوں کا گیت سنے بغیر اپنے دلش کو چل دیا تھا اور کیا معلوم اب اُس سے کب ملاقات ہو..... پرانے دیس کے مسافر بھلا کب لوٹ کر آتے ہیں۔

پرتھال نے اداس اور بھیگی بھیگی نظروں سے اُس کی سواری درختوں کی اوٹ میں اوجھل ہوتے دیکھی پھر دوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی اور اونٹ سے منہ لیٹ گئی۔ وہ اپنے دل کی بات کس سے کہے کہے بتائے کہ آج وہ بے مول بک آئی ہے۔ کیا ان کوئی اور بھری دیواروں سے..... چھت کی کڑیوں سے..... لکڑی کے ان تختوں سے.....؟ اس گھر میں کوئی بھی تو اس کے دل کی آواز سمجھنے والا نہیں تھا۔ ماں کا دل مٹی کی طرح نرم تھا۔ لیکن وہ دل کے گھاؤ کو نہیں سمجھتی تھی۔ باپ ایک سناٹا تھا اور اس کی نظر مول تول سے آگے نہیں جاسکتی تھی۔ گورو دیو کی روانگی کے بعد پرتھال کچھ دیر جذبات کی آج پر سٹگتی رہی۔ پھر اُس نے ستارہ پنجال لی اور ایک گیت جھیڑ دیا..... ایسے موسیقی پر سنگیت ہی اس کے دل کی بستراری اور پرداز کی بے چینی کو دور کر سکتا تھا۔

رات کی بات

یہ واقعہ رستہ کے سب سپاہیوں کے لئے حیرت و استعجاب کا باعث بنا ہوا تھا کہ

شہزادے نے مدگل پہنچنے کی بجائے اس بستی میں پڑاؤ کیوں ڈال دیا ہے؟ وہ تو دارالسلطنت مگبرگہ سے فیروز آباد اور فیروز آباد سے دیورائے کی خبر سن کر مگبرگہ کی طرح اڑتا ہوا آیا تھا لیکن مدگل ابھی کئی کوس کی مسافت پر تھا اور دیورائے کی گوثالی سے قبل اس کا رستہ ہی میں ٹھہر جانا یقیناً تعجب خیز تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا اس کا راستہ ایک ایسی قوت نے روک لیا ہے جو دکن کی پوری سلطنت کو تباہی و بربادی کے عاروں میں ڈھکیل سکتی ہے۔

ایک طرف پر تھاں کا حسن تھا اور دوسری طرف بیچانگر کے مہاراج دیورائے کی گوثالی۔ اس کے دل نے مشورہ دیا کہ وہ وٹمن کا خیال چھوڑ کر چند روز اس بستی میں قیام کرے۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کا سب سے حسین۔۔۔ سب سے قیمتی اور انمول خواب دیکھا ہے۔ اس نے دل کا یہ مشورہ قبول کیا اور اپنے فوجی دستے کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔

لیکن دیورائے کی خبر لینے بھی ضروری تھا ورنہ وہ سلطان کو کیا جواب دے گا؟ اس مقصد کے لئے اس نے شہباز خاں کو مدگل کی طرف دوڑا دیا تھا تاکہ وہ ہمکنی سردار فولا و خاں سے دیورائے کی سرگرمیوں کا حال دریافت کر سکے۔

ساری رات شہزادہ حسن ایک لمحہ کے لئے بھی جدوس کا پرتھان کے حسین خیال نے اس کی غیند پر جیسے شبنون مار دیا تھا۔ اس کے دل و دماغ نے تصورات بنائے کہتے ہی جال بنے۔ محبت کی پہلی ملاقات کا سرور انگیز نشہ اسے کہاں کہاں نہ لئے پھر اس کی رات اس نے اسی سوچ بچار میں گزار دی۔ ایسا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ پر تھاں کا چاؤ و گر حسن و دل کے ساتھ اس کے گل کی تارکیوں کو بھی روشن کر دے۔

صبح اسے پھر اپنی محبوبہ سے ملاقات کے لئے جانا تھا اور وہ اپنی فکر میں غلطاں تھا کہ وہ اس کے سامنے کن الفاظ میں اظہارِ حمت کرے۔ کیا وہ اس کی درخواست کو قبول بھی کرے گی یا کسی مجبوری کا بہانہ تراش کر اسے ناکام و نامراد لوٹا دے گی؟

کلی ملاقات سے تو یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ خود پر تھاں بھی اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے ورنہ وہ اس کا بخشتا ہوا بار کیوں قبول کرتی؟ اس نے وہ بار ایک شہزادے کا انعام سمجھ کر نہیں۔ یقیناً ایک عاشق کا ہزارانہ سمجھ کر قبول کیا تھا۔ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں محبت کی وہ چمک بھی تو نظر آرہی تھی۔ جسے دل کے آئینے کا عکس کہتے ہیں پھر

اس کی دلتواز۔ معنی خیز مسکراہٹ۔ وہ نیا نوا جاب۔ وہ گلاب کی پنکھڑی ایسے لیوں کے
مکھوں کی لرزش۔ وہ بدن پر ایک کیف آگئیں تھر تھراہٹ۔ ایک سرور انگیز کپکپاہٹ۔
آخر یہ سب کیا تھا؟ وکن کی لڑکیاں اٹنی "خاموش الفاظ" میں تو اپنا حال دل سنایا کرتی
تھیں۔

"تو اس کا یہی مطلب ہونا پہلی ہی ملاقات میں پرتھال نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا
ہے؟"

دل نے جواب دیا۔

"دیوانے جب لڑکی کسی محبوب کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنا لیتی ہے تو اشاروں کی زبان
میں اس پر اپنی دھڑکنوں کا اظہار بھی کرتی ہے۔"

ساری رات وہ انہی دلچسپ خیالوں میں کھویا رہا۔

صبح جب ہمتی کے شوالے نے سمجھ کر کی آواز بلند ہوئی تو اس کے تصورات کا تسلسل
نوٹ گیا۔ خیمے کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ مشرق کے طلحے آسمان پر صبح کا ڈب کا جلوہ نمودار ہو
گیا تھا۔ خشک ہوا کا ایک جھونکا اس کی آنکھوں اور کانوں کو چھوتا ہوا گزر گیا اور اب اُسے
معلوم ہوا رات اس نے جاگ کر گزار دی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ اپنے جسم میں
کچھ سسلندی بھی محسوس کرنے لگا۔ فوراً ہی اس نے پردہ گرا دیا اور ہولے ہولے چل ہوا
بستر کی طرف گیا۔ اس کا جی چاہا وہ کچھ دیر آرام کر لے کیونکہ بے خوابی کی وجہ سے اس کی
آنکھوں کے پچھلے بھاری ہو رہے تھے کپٹیاں سلگ رہی تھیں اور سر میں ہلکا ہلکا درد بھی
محسوس ہونے لگا تھا لیکن اب اگر آنکھ لگ گئی تو نجانے وہ کب بیدار ہو۔ رات کا جاگا ہوا
دن کو عموماً دیر تک سویا رہتا ہے۔ اس لئے آرام کا خیال ترک کر دیا۔ پھر اس نے پرتھال
سے ملاقات کا وعدہ بھی تو لے رکھا تھا۔ وہ دن چڑھے ہی کٹارے درختوں کے اسی جھنڈ
میں آئے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو پہلے ہی دن اُسے انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑے۔

طلوع آفتاب کے ساتھ جب وہ خیمے سے باہر نکلا تو شہباز خاں نے کوشش بجالا کر
آداب پیش کیا۔ حاکم مدھی فولاد خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اُس نے سر پر "خو" پہن رکھا
تھا تاکہ ظاہر کر سکے وہ فوجی معاملات میں ہر وقت چوکس اور ہوشیار رہتا ہے۔ شہباز خاں
بھی فوجی لباس میں تھا اور وہ دونوں شہزادے کی ہدایات پر راتوں رات سفر کر کے یہاں پہنچے

گئے تھے۔

دلی عہد نے اسے ایک نیک شگون تصور کیا اور اُن سے خندہ پیشانی کے ساتھ ہمکام ہوا۔
 فولاد خاں نے بتایا شہزادہ عالی کی آمد کی اطلاع پا کر بیجا نگر کا مہاراج دریائے ننگ
 بھدرا کا چکر کاٹ کر واپس چلا گیا ہے اور اب سرحدی تاخت کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔
 دیورائے ایک عرصہ تک ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ لوٹ مار کا وقت نکل چکا
 اور اب اگر اس نے دریا عبور کرنے کی جرأت کی تو اُسے خون کے کئی دریا تیرنا پڑیں گے۔
 یہ خبر سن کر حسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ واصل وہ کوئی ایسی ہی خبر سننا چاہتا تھا جو
 اُسے تعاقب کی پریشانی سے بچا لیتی۔ اس نے خوش ہو کر فولاد خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھا
 اور پُر رعب آواز میں بولا۔

”دیورائے نے بہادری شیر سے اور چالاکی لومڑی سے سیکھی ہے۔ وہ حملہ کرتا ہے تو
 کہیں رکنا نہیں اور جب ملتا ہے تو بھاگتا نہیں بلکہ لومڑی کی طرح کسی نہ کسی غار میں وک
 جاتا ہے تاکہ دشمن کو غافل بنا کر پھر جھپٹ پڑے لیکن وہ جب بھی آئے تمہاری تلوار کو بے
 نیام ہی دیکھے۔“

اس کے جواب میں فولاد خاں نے اپنا سر جھکا لیا۔

”غلام سلطان حضور کی رکاب میں کئی جنگیں لڑ چکا ہے اور بیجاڑی دشمنوں کی گھاٹ کو
 خوب سمجھتا ہے۔ دیورائے مجھے کبھی نہیں غافل پائے گا۔“

اس جواب پر دلی عہد نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس کے لئے یہی بہت تھا کہ
 دیورائے لڑے بھڑے بغیر لوٹ گیا تھا اور اس نے اپنے پیچھے کوئی ایسا نشان بھی نہیں چھوڑا
 تھا۔ جس سے معلوم ہو سکتا کہ وہ منوع پاتے ہی پھر پلٹ آئے گا۔ رنگ بھدرا کے
 کنارے سے ہٹ کر اس نے سیدھا بیجا نگر کا رخ کیا تھا اور اب شہزادہ جب تک چاہتا اس
 بہتی میں قیام کر سکتا تھا۔

یہ احساس بڑا فرحت بخش اور سکون نواز تھا کہ وہ اطمینان کے ساتھ پر تھاں سے
 ملاقات کر سکتے گا اور دیورائے کی گوشالی کا خیال اس کی پریشانی کا موجب نہیں ہوگا۔ پھر
 اس نے فولاد خاں کو کچھ ہدایات دیں اور فوراً ہی خیمے کے لیندر چلا گیا۔
 چلتے چلتے اس نے سوچا کیوں ندوہ وقت مقررہ سے پہلے ہی ندی کنارے پہنچ جائے

اور پرتھال کو حیران کر دے کہ جب دکن کے شہزادے کسی حسینہ کو اپنی نگاہوں کا مرکز بناتے ہیں تو اس کی یاد میں اپنے آپ کو بھی گم کر دیتے ہیں وہ چاہتا تھا۔ اسی بہانے پرتھال پر اپنی بیقراری کا اظہار کر سکے۔ اسے بتا سکے تم نے ایک شہزادے کے دل کا سکون لوٹ لیا ہے اور اس نے اپنے شاہی فرائض کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود کو تمہاری زلفوں کا اسیر بنالیا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے گھوڑا طلب کیا اور لشکر گاہ سے نکل کر اس کا رخ ندی کی طرف موڑ دیا۔ سپاہی بھی سمجھے دلی عہد کو شکار کا شوق لے اڑا ہے لیکن فولاد خاں جو تھوڑی دیر پہلے مغل سے آیا تھا اُسے تنہا جاتے دیکھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

دھڑکنوں کا ساز

گھنے درختوں سے گزرتا ہوا جب وہ بانس کے جھنڈ میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پرتھال پہلے ہی وہاں موجود تھی اور لمبی لمبی شاخوں کے درمیان کھڑی شاید اسی کی راہ دیکھ رہی تھی۔

شہزادہ تو یہ توقع لے کر آیا تھا کہ چند لمحوں خود پرتھال کا انتظار کرے گا اسے اپنی بیقراریوں کی کہانی سنائے گا لیکن پرتھال کو غلاف تو فتح اپنا منتظر دیکھ کر اس کی حیرت کی حد نہ رہی وہ سمجھ گیا کہ حسن خود اس کے لئے بیقرار ہے۔ ایک عاشق کے لئے یہ احساس کس قدر دل افرا تھا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا۔ پرتھال نے اُسے دیکھا تو اُس کے ہونٹوں کے گہچوں پر ہلکا سا قسم نمودار ہوا اور جھک کر آداب بجالائی۔

”بہاؤی کا سلام قبول ہو شہزادہ عالی!“

بے اختیار حسن کا جی چاہا۔ وہ پرتھال کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لے اُسے سینے سے لگائے۔ گھوڑے پر بٹھائے اور فیروز آباد کی راہ لے لیکن اچانک اُس کے قدم رک جئے اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے ذہن میں ایک ساتھ کئی دوسرے ریختے لگے۔ کہیں محبت کا یہ انظہار قبل از وقت تو نہیں؟ کہیں پرتھال بدگمان تو نہیں ہو جائے گی کہ ایک شہزادہ ایک غریب لڑکی پر کیا یک انشا مہربان کیوں ہو گیا؟ مگر یہ احساس اس کے اپنے ہی دہم کا ایک کرشمہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ رعب حسن نے اس کے پاؤں میں جیسے زنجیر ڈال دی تھی

اور وہ اس وقت ایک کمزوری لڑکی کے سامنے خود کو بے بس اور مجبور محسوس کر رہا تھا۔

گھر گر اور فیروز آباد کی محل سراؤں میں نہ جانے کتنی خوش جمال کینریں صرف اس کے قدموں کی چاپ سن کر کانپ جایا کرتی تھیں۔ اُن کے چہن سے بدن شاعی رعب سے کپکپا اٹھتے تھے اور اُن میں اتنی جرأت نہ تھی کہ نگاہ بھر کے دلی عہد کی طرف دیکھ لیں۔ خود حسن نے بھی محل کی ان ٹائٹینوں کو اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ گھڑی دو گھڑی اُن کے ساتھ فس بول لے وہ جانتا تھا یہ کینریں..... محض مٹی کی سورتھیں ہیں۔ جن کے جسموں میں جوانی کی گرمی تو ہوگی لیکن دل محبت کی حرارت سے محروم ہیں۔ یہ صرف اتنا ہی جانتی ہیں کہ دلی عہد کے قدموں کی چاپ سن کر جہاں ہیں وہیں ڈک جائیں اور اپنی راج فس کی طرح لمبی لمبی گردنیں جھکا کر بالادب گھڑی ہو جائیں۔ بھلا شہزادے کو مٹی کی ان پتلیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جو اس کی صورت دیکھ کر شام کے سایوں کی طرح کانپ کانپ جاتی تھیں؟ لیکن آج دکن کا دلی عہد..... بیسیوں دوشیزاؤں کا دلی نعمت ایک ستار کی لڑکی کے سامنے یوں کھڑا تھا جیسے کوئی پجاری دیوی کے حضور شہادت کی بیعت لئے حاضر ہو۔

شہزادے کی اس محبت نے پرتھالی کو چوٹا دیا۔ آخر وہ کیا سوچ رہا ہے؟ شہزادوں کی سوچ بے وجہ بے مقصد نہیں ہوا کرتی۔ کہیں اسے اپنے مرتبے کا خیال تو نہیں آگیا.....؟ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی حسن کی طرف بڑھی۔ شہزادہ ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔

پرتھالی نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا..... ”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“

اس سوال پر حسن چہرے خواب سے بیدار ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر پرتھالی کی طرف دیکھا اور بولا ”میں نے سنا تھا ہمیشہ عشق ہی حسن کا انتظار کیا کرتا ہے لیکن آج میں نے اس قول کو بالکل مختلف پایا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں۔ تمہاری ذات پر اعتبار کروں یا اس بات پر جو غلط ثابت ہو چکی ہے۔“

پرتھالی کھلکھلا کر فس پڑی۔ چہرے پھولوں کی چھانگل بن گئے۔

”بس..... اتنی دیر سے آپ بھی سوچ رہے تھے؟“

”ہاں..... حسن نے پجاری کی اعتراف کر لیا۔“

”تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

”میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔“

”میں آپ کو مشورہ دوں؟“

”ہوں۔۔۔“

”جو چیز آپ کے سامنے ہے اس پر دشواش کر لیجئے۔“

”میرے سامنے تو تم ہو۔“

حسن کے لبہ میں شرارت کی جھلک تھی۔

”تو کیا میں دشواش کے قابل نہیں؟“

پر تھاں نے یہ فقرہ کچھ اس بے ساختگی کے ساتھ ادا کیا کہ حسن کے کانوں میں نئے سے گونج اٹھے۔ اس ایک فقرے میں اس کی پوری زندگی سب آئی تھی اور اس نے گویا اپنے آپ کو اپنے مستقبل کو۔ اپنی ساری زندگی کو الفاظ میں لپیٹ کر شہزادے کے قدموں میں رکھ دیا تھا کہ لیجئے بندی تو حاضر خدمت ہے اب ٹھکرا دیجئے یا اٹھا لیجئے۔

ایک لمحہ کے لئے اس کی نگاہیں حسن کے چہرے پر سوال کا جواب تلاش کرتی رہیں پھر آپ ہی آپ جھک گئیں اور وہ شرما ہی گئی۔

حسن نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور کہا۔

”پر تھاں! اگر تم اعتبار کے قابل نہ ہوتیں تو میں ساری رات آنکھوں میں نہ کاٹ دیتا اور تم سے ملاقات کرنے کی بجائے اس وقت میرا گھوڑا بیچا مگر کے مہاراج کا تعاقب کر رہا ہوتا۔“

پر تھاں شہزادے کے لہجے کی کیکپاٹ اور اپنی ٹھوڑی پر اس کے ہاتھ کی لرزش محسوس کر رہی تھی۔ یہ کیکپاٹ، یہ لرزش اس امر کی شہادت تھی۔۔۔ کہ شہزادے نے اس کے سامنے اپنے دل کی بات ظاہر کر دی ہے۔ اقبالِ حرم اور اقرارِ محبت کرتے ہوئے انسان پر اکثر ایک عجیب سی لرزش طاری ہو جاتی ہے جو دراصل اس کے صدقِ دل کی علامت ہوتی ہے۔ حسن نے اس وقت جو کچھ بیان کیا تھا۔ وہ گویا اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز تھی۔۔۔ نہیں بلکہ یہ آواز خود اس کے دل کی ایک دھڑکن تھی جو الفاظ کا روپ دھار کر اس کے لبوں پر آگئی تھی اور پر تھاں یہ آواز سن کر سن ہی سن میں اس بات پر فخر کر رہی تھی۔ کہ دکن کا جواں سال ولی عہد۔۔۔ سلطنتِ ہندی کا وارث اس کے تصور میں رات بھر نہیں سو سکا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اُسے اپنے دل کی رانی بنانا چاہتا ہے لیکن ان احساسات

کے ساتھ ہی ایک بھیاںک خیال نے سانپ کی طرح اپنا سزا اٹھایا اور فوراً ہی اس کے چہرے پر کسی مامطوم خوف کے سائے ریگنے لگے جیسے اسے کسی بچھو نے ڈس لیا ہو۔

”کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں؟“

”کیوں نہیں مہاراج؟“ پرتھال افسردہ آواز میں کہنے لگی۔ ”اسی یقین نے تو مجھے

خونزدہ کر دیا ہے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“

پرتھال نے پہلی مرتبہ ڈری ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر رک رک کر بولی۔ ”ڈرتی ہوں کہیں میرا مطلب سمجھ کر آپ ناراض نہ ہو جائیں۔ ان داتا کے ماتھے کی ایک شکن غریب کے لئے موت کا پیغام بن سکتی ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو پرتھال؟“ حسن نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”نہ اس وقت میں شہزادہ ہوں اور نہ تم ایک غریب لڑکی۔ اس وقت ہمارے درمیان کوئی ایسی طاقت حائل نہیں جو تمہیں خونزدہ کر سکے۔ تم جو کچھ بھی چاہتی ہو بلا خوف کہہ دو۔ خواہ وہ میرے ہی متعلق کیوں نہ ہو۔“

ایک لمحہ خاموش رہ کر پرتھال نے اپنی گزروں اور پرتھالی اور بولی۔

”میرے سامنے بے شک آپ راجکمار نہ سہی۔ لیکن دنیا کی نگاہوں میں آپ ہر وقت راجکمار رہیں گے اور میں ایک غریب لڑکی۔ جس کا باپ گاؤں کا منسولی سار ہے۔ بادشاہ نور علیا کے درمیان کچھ فاصلے ہوتے ہیں اور لوگوں کی نگاہیں ان ناصلوں کو اتنی جلد ہی عبور نہیں کر سکتیں۔ اس لئے میں ڈرتی ہوں۔ کہیں میرے پریم کو جرم نہ سمجھ لیا جائے۔ کہیں سلطان عالی کا غضب دم غریبوں کو جلا کر خاکستر نہ کر دے۔“

پرتھال کے لہجے میں ایک تھر تھراہٹ تھی۔ اس کے باوجود اس کے الفاظ کا مطلب بالکل صاف تھا۔ اس نے بڑے واضح الفاظ میں ان خطروں کا اظہار کیا تھا۔ جو اس محبت کے نتیجے میں پیش آ سکتے تھے۔

حسن نے یہ سب باتیں بڑے مہر و قفل کے ساتھ سنیں۔ وہ جاننا تھا پرتھال کے یہ دوسرے حقیقت کا روپ بھی دھار سکتے ہیں کیونکہ وہ سلطنت کا ولی عہد تھا۔ دکن کا ہونے والا سلطان اور شاہی قانون کے مطابق اس کی شادی کسی شہزادی یا خان زاہدی سے ہو سکتی

تھی۔ شہزادے اپنی عام محبوباؤں کو حرم میں داخل تو کر سکتے تھے لیکن انہیں شاہی اعزاز اور سلطانی منصب نہیں دلا جاسکتے تھے۔ یہ اعزاز کسی شاہی خاندان کی لڑکی ہی کو نصیب ہو سکتا تھا اور اسی کی اولاد تخت و تاج کی وارث بن سکتی تھی۔ دوسری عورتیں اس عزت افزائی کی مستحق نہ تھیں پھر کل سرا میں اُن کی حیثیت بھی واشائوں یا خاص کنیروں سے کچھ زیادہ نہ تھی لیکن ان کے لئے بھی سلطان معظم کی رضامندی ضروری تھی شہزادوں اور شاہی خاندانوں کے دوسرے افراد کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ جس عورت کو چاہیں حرم میں داخل کر لیں۔

پر تھال شاہی محلات کے دستور سے آگاہ نہ تھی اور نہ یہ جانتی تھی کہ حرم سراؤں اور راج خلوں میں رانیوں، شہزادیوں اور دوسری عورتوں کی زندگی کے دھارے کس رخ بہتے ہیں۔ اُن کے درمیان تفریق و امتیاز کے کیسے کیسے جھگڑے کھڑے رہتے ہیں۔ اُسے تو صرف اتنا علم تھا وہ ایک لڑکی ہے اور شاہی قانون کے مطابق اس کا دلی عہد سے محبت کرنا ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا میں وہ زندگی سے بھی ہاتھ دھو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے شہزادہ حسن کو اپنا دیوتا۔ اپنا محبوب بنالیا تھا اور اب وہ اُن خطرناک اعدائوں کا اظہار کر رہی تھی جو اس محبت کے نتیجے میں پیش آ سکتے تھے۔

پر تھال کی باتیں سن کر حسن کے ذہن میں بھی خطروں کی پرچھائیاں سی تھر تھرانے لگیں کیونکہ ایک عام لڑکی محبت اُسے دکن کے تخت و تاج سے بھی محروم کر سکتی تھی اور اس کے بہادر چچا امیر الامرا احمد خاں خاندانوں کی موجودگی میں تو یہ خطرہ اور بھی زیادہ بھیا تک شکل اختیار کر سکتا تھا لیکن حسن اُن شہزادوں میں سے نہیں تھا۔ جن کی محبت کی ذوری تخت کے پایوں کے ساتھ بندھی رہتی ہے۔ سلطنت کا دلی عہد ہونے کے علاوہ وہ اپنی بات پر مرستی والا ایک بہادر اور جوانمرد سپاہی بھی تھا۔ وہ اپنی محبت کی خاطر تاج و تخت کو بھی ٹھوکر مار دینے پر تیار تھا۔ اس نے پر تھال کی آنکھوں میں محبت کی چمک دیکھ لی تھی۔ اس کی باتوں میں دل کا کرب محسوس کر لیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

”محبت کرنے والے دل شہنشاہوں کے قہر و غضب سے نہیں ڈرتے پر تھال! کیا تم مجھ سے محض اس لئے منہ موڑ لینا چاہتی ہو کہ سلطان عالی کا قانون ذاری محبت پر پکلی بن کر گر سکتا ہے؟ کیا تم اس لئے ذرتی ہو کہ میں ایک شہزادہ ہوں اور تمہاری دوسری سے دور ہوں تمہیں اپنی محبت عزیز نہیں۔ صرف زندگی پیاری ہے؟“

”نہیں جان عالم!“ پر قتال نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے زندگی کی کوئی پروا نہیں۔ پریم میں موت بھی امر ہوتی ہے۔“

”تو پھر خوف کس بات کا ہے؟“

”ذرتی ہوں کہیں تاج و تخت کی ضرورتیں آپ کو مجھ سے چھین نہ لیں۔ کہیں مجھے اپنا جیون آپ کی جدائی میں ٹپ ٹپ کر نہ گزارنا پڑے۔“

”اطمینان رکھو! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔“ شہزادے نے محبت کے جوش میں اپنے ہاتھ پر قتال کے کندھوں پر رکھ دیئے۔۔۔۔۔ ”اگر تاج و تخت نے مجھے تم سے چھیننے کی کوشش کی تو میں تمہاری خاطر اسے بھی ٹھوکر مار دوں گا۔“

”شہزادہ عالی!“ پر قتال کے لبوں پر خوشی کی ایک جھج بکھر گئی۔۔۔۔۔ ”میرے لئے آپ اتنا رازا بلیدان دینے پر تیار ہیں؟“

”تم نے ایک شہزادے کا ہاتھ پکڑا ہے پر قتال! کسی معمولی آدمی کا سہارا نہیں لیا اور تم جانتی ہو شہزادے کبھی کبھی محبت کی تاریخ اپنے خون سے بھی لکھا کرتے ہیں۔“ حسن کے لہجے میں عزم و یقین کا جذبہ تیر رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے راج مہج اس نے پر قتال کی خاطر تخت و تاج سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔

شہزادے کو اس وقت مہربان پا کر پر قتال کے دل میں محبت جیسے ہی طرح جھوٹ نکلی۔ اس پر ایک بے خودی سی طاری ہو گئی۔ اسی حالت میں اس نے اپنا سر حسن کے کندھوں پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے تصورات کے جھولے میں کھو گئی۔

”آپ اپنی دای کو ہمیشہ وفادار پائیں گے جان عالم!“ اس کی آواز میں پریم کا رس تھا۔ شہد کی مٹھاس تھی۔ دل کا درد تھا اور محبت کا خلوص۔ شہزادہ حسن کے سینے کے ساتھ لگی وہ کہہ رہی تھی۔

”میں بہت دنوں سے بیٹھے بیٹھے سنے دیکھ رہی تھی۔ میرے پاؤں اپنے آپ ہوا میں اڑنے لگتے تھے۔ نگاہوں کے سامنے بڑے دلکش رنگ سے بکھر جاتے تھے اور وہ پھیلنے بکھرتے اور ناچتے ہوئے رنگ کبھی کبھی ایک حسین شہزادے کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ مجھے اب معلوم ہوا وہ شکل آپ کی تھی۔ جان عالم کی۔۔۔۔۔ شہزادہ عالی کی اور میں یہ بھی جانتی ہوں آپ مجھے اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیں گے کیونکہ آتما ہمیشہ شریر میں رہتی

ہے۔

حسن نے پرتقال کو اپنے مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا پھر ٹھوڑی پکڑ کر۔۔۔ اس کا خوبصورت چہرہ اوپر اٹھایا اور نہایت آہستگی کے ساتھ لپٹے مرثیہ ہینٹ پرتقال کے انکارے کی طرح دیکھتے ہوئے سرخ لپوں پر رکھ دیئے۔ پیاسے ہونٹ آپس میں کھرائے اور ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ جیسے دن اور رات گھلے رہے ہوں۔ دور درختوں کے جھنڈ میں کوئل کی کوک فضا کے سینے میں سریلی دھڑکتوں کے ساز چھیڑتی ہوئی گزرنی۔

پرتقال ابھی تک شہزادہ حسن کے سینے کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور دونوں کے ہونٹ بدستور ایک دوسرے میں پیوست تھے گویا ان کے سر پر بے رحم آسمان کی گردشیں ختم چکی تھیں۔

قسمت کا کھیل

وادی میں پڑاؤ کئے پورے سات دن ہو چکے تھے اور سپاہی ابھی تک حیران تھے اس جگہ قیام کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اپنے نظر نواز مناظر کے اعتبار سے یہ وادی ایک بہترین تفریح گاہ ضرور تھی لیکن یہاں اتنے روز تک ٹھہرنا یقیناً تعجب انگیز تھا۔ اس سے پہلے شہزادے نے ایسے مقامات پر کبھی زیادہ دیر پڑاؤ نہیں ڈالا تھا وہ جب بھی سیر و شکار کے لئے نکلے کہ سے نکلا تو اُن جنگلوں کا رخ کرتا جہاں خوفناک جانوروں کا شکار کر سکتا۔ اس نے جتندو شیر اور چیتے ہلاک کئے تھے جن کی کھالیں مصالحے سے خشک کر کے اس کے کمرے خاص میں بچھا دی گئی تھیں لیکن اس وادی میں تو کوئی بومر بھی پکھائی نہیں دیتا تھا۔ البتہ رات کے وقت دور سے گیزروں کی ”ہواک“ ضرور سنائی دیا کرتی تھی اور دن کو بعض سپاہی ادھر ادھر سے کسی نہ کسی خرگوش کا شکار کر لاتے تھے لیکن اُن کا زیادہ وقت خوش گیمیاں اڑانے میں گزر جاتا تھا۔

گاؤں یہاں سے صرف کوس ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا اور ولی عہد کے قیام کا سن کر گاؤں کا کھیا سکھ و بچہ لوگوں کی جمعیت میں دوسرے ہی دن سلام کرنے اور نذر گزارنے کے لئے حاضر خدمت ہو گیا تھا۔ میر انگر شہباز خاں نے اس کی نذر قبول کی اور بتایا کہ

شہزادہ عالی نے صرف تفریح کی غرض سے یہاں پڑاؤ کیا ہے۔ بوڑھا کھیا فکر مند تھا کہ کہیں گاؤں پر کوئی آفت نہ آجائے۔

جب شہزادے کو معلوم ہوا کہ گاؤں کا سناں لکھت بھی کھیا کے راتہ آیا ہے تو اس نے ملاقاتیوں کو اپنے خاص خیمہ میں شرفِ ملاقات بخشا۔ سب لوگ شاہی رُعب سے کانپ رہے تھے۔ وہ مدگل کے صلہ دار کی آمد ہی سے ہراساں ہو جایا کرتے تھے اور اس کی آؤ بھگت اس طرح ہوتی تھی جیسے بادشاہ کی سواری آرہی ہو لیکن اب تو شہزادہ عالی نے پے نفس نفس اُن کے گاؤں کو رونق بخشی تھی۔ بھلا وہ اپنے جذبہ خدمت گزاری اور وقا شعای کا اظہار کیوں نہ کرتے؟

شہزادہ اُن کے ساتھ بڑی خمد پیشانی اور بے تکلفی سے پیش آیا وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ یہ حسنِ خلوک دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوئے۔ شہزادے نے دریافت کیا۔ اگر انہیں کوئی تکلیف یا شکایت ہو تو وہ بیان کر سکتے ہیں۔ اس کا ازالہ کر دیا جائے گا لیکن اُن کے پاس کوئی شکایت نہ تھی۔ اُن کے لئے تو یہی اعزاز بہت تھا کہ دلی عہد کے درشن کر لئے ہیں اور ہندوؤں میں اپنے بادشاہ مہاراجہ کے درشن کر لینا ہی گویا ایک انعام تھا۔ ایک نیک شگون تھا۔ دلی عہد نے ہمیں روٹیاں کو قائم رکھتے ہوئے لیکن انعام و اکرام سے نوازا۔ بوڑھے سکھ دیو کو ایک خلعت عطا ہوا۔ دوسروں کو اشرفیوں سے نوازا گیا۔ لکھت کو ایک عقیق دے کر فرمائش کی گئی کہ وہ اسے ایک خوبصورت انگشتری بنائے اور اس طرح شہزادے نے سناں کے ساتھ اپنے تعلقات کا آغاز کیا۔ اس فرمائش پر وہ اس قدر خوش تھا جیسے اس کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا گیا ہو۔ اسی روز وہ شاہی انگلی کی تیاری میں مصروف ہو گیا اور سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی۔ لکھت دلی عہد کے لئے انگلی بنا رہا ہے۔ لوگ وہ انگلی دیکھنے کے لئے اس کی دکان پر آنے لگے۔ لکھت بڑے نخر کے ساتھ گردن اونچی کر کے کہتا۔

”تم مجھے کوئی معمولی سناں نہ سمجھو۔ میرے ہنر کی شہرت راج و دہار تک پہنچ گئی ہے۔ شہزادے کے لئے انگلی تیار کرنا کوئی معمولی کام نہیں ایسے عجیبے جڑوں کا کہ سارے دکن میں دھوم مچ جائے گی اور لوگ لکھت سناں کے ہاتھ چومنے آئی کریں گے۔“

پرتمال دن میں کئی کئی مرتبہ پوچھتی۔

”بابا! کتنا کام باقی رہ گیا ہے؟“

اور لکھت جواب دیتا۔

”بیٹا! شہزادے کی انگوٹھی بنا رہا ہوں۔ کسی ٹٹ پونچھے سا ہو کار کی نہیں۔ تم کیا جانو

شہزادوں کی پسند کیسی ہوتی ہے۔“

اور پر حال خوش ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

”پر بابا! اگر راجا نے تمہاری بنائی ہوئی انگوٹھی پسند نہ کی تو۔۔۔“

”واہ۔۔۔ پسند کیسے نہیں کریں گے۔ میں کوئی نائی دھوبی نہیں ستار ہوں ستار ایسا سونا

لگایا ہے کہ ساری عمر چکا چوند نہیں جاسکے گی۔ تو دیکھ تو سہی ایشور نے چاہا تو میری بنائی ہوئی

انگوٹھی شہزادے کی انگلی میں اور میں اس کے دل میں بیٹھوں گا۔“

”پر تم شہزادے کے دل میں بیٹھ کے کیا کرو گے؟“

”اری! تیرے بیاہ کے زیور بنادوں گا دہاں بیٹھ کے۔“

بڑھ گھٹ لکھت کو دنیا جہاں میں پر حال کا بیاہ رچانے کے سوا جیسے اور کوئی کام ہی

نہیں تھا۔ باپ کی یہ بات سن کر پر حال کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ جاتی اور وہ شرم کر

انگلی و انتوں میں دب جاتی اور مسکرا کر بھاگ جاتی۔

کئی دن لگاتار محنت کے بعد آخر کار انگوٹھی تیار ہو گئی مگر شہزادے کی خدمت میں پیش

کرنے سے پہلے اس نے ضروری سمجھا کہ گاؤں کے کھیا کو دکھا کر ذرا اس کی رائے معلوم کر

لے۔ سکھ دیو کے علاوہ اور بھی کئی لوگوں نے اس انگوٹھی کو دیکھا۔ اور عرش عرش کر اٹھے۔ واقعی

بڑھ گھٹ لکھت نے اپنی ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا تھا جب سب نے انگوٹھی کی تعریف کی

اور اسے واقعی ایک شاہی تختہ قرار دیا تو بڑھ گھٹ لکھت مطمئن ہو گیا پھر کھیا کو ساتھ لے کر

شہزادے کی طرف چل دیا۔ سکھ دیو نے بہت برا کہا کہ بھلا میرا کیا کام ہے۔ تم اکیلے ہی چلے

جاؤ۔ مگر لکھت نے جواب دیا۔

”نہیں کھیا کا بابا۔ تمہارے بغیر میں نہیں جاسکتا۔ شہزادے کا معاملہ ہے مجھ سے تو

دہاں بات بھی نہ ہو سکے گی۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

پہلے کی طرح شہزادہ نے انہیں پھر اپنے خیمہ خاص میں بلایا۔ جب لکھت نے

انگوٹھی پیش کی تو اس کے دونوں ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے بدن پر عرش سلطانی تھا

اور دل سینے کے اندر یوں دھک دھک کر رہا تھا جیسے ابھی اچھل کر باہر آ جائے گا۔ یا پھر ایک دھماکے کے ساتھ اس کی حرکت بند ہو جائے گی۔

شہزادے نے انگوٹھی پسند کی..... انگلی میں پہنی اور لکھپت سے مخاطب ہوا جو ابھی تک کانپ رہا تھا۔

”لکھپت! تم نے ہماری توقع سے زیادہ اچھا کام کیا ہے۔ مانگو! ہم تمہیں کیا انجام دیں؟“

اگر بوڑھا ستار اس وقت پورے مہگل کی جاگیر طلب کر لیتا تو شہزادہ بخوشی اس کی آرزو پوری کر دیتا کیونکہ فیروز آباد کا علاقہ اسی کے تحت تھا لیکن شہزادے کی زبان سے خوشنودی کے الفاظ سن کر لکھپت پر ایک اور کچلی طاری ہو گئی۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک سلطنت کا ولی عہد اسے منہ مانگی مراد دینے کے لئے تیار تھا۔ اس خوشی سے اس کے ہوش و حواس ایسے اڑے کہ اسے کوئی خواہش ہی یاد نہیں آ رہی تھی۔ چھ لمحوں میں اس نے اپنے دل و دماغ کے اجڑے ہوئے گوشوں کو ڈھونڈا۔ کچھ دیر اپنی یادوں کے پرانے جنگل میں گھومتا رہا۔ پھر اپنے ذہن کے دیزائن پر نظر دوڑائی لیکن کوئی آرزو، کوئی تمنا، کوئی خواہش دکھائی نہ دے سکی جسے وہ ولی عہد کے سامنے بیان کر سکتا۔ اس زندگی میں تو اسے بس ایک ہی فکر ایک ہی چٹا تھی کہ اس کی سیدہ اور جوان بی بی پر تھال کی شادی ہو جائے۔ اور بس تو کیا وہ شہزادے کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کرے، ہاں کیے۔

”مہاراج! میری تو ایک ہی تمنا ہے بی بی کا گھر آباد ہو جائے۔ اس کے سوا میں اور کچھ نہیں چاہتا.....“

لیکن ولی عہد کے روبرو اس قسم کی بات کرنا کیا گستاخی اور بے ادبی نہیں؟

”جی جی..... لکھپت! تم کیسی باتیں سوچتے ہو۔ ارے بے ادب! ہوش کے ناخن لو۔ تم اس وقت چنڈت گورکھ ناتھ کے روبرو نہیں۔ لیکن کے ولی عہد کے حضور کھڑے ہو۔ کوئی اتنی سیدھی بات کہنے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

اور ولی کے اس شعور پر لکھپت اپنی ایک ہی عزیز ترین خواہش کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ شہزادہ اور سکھ دیو دونوں ان کی خاموشی پر حیران تھے آخر شہزادے نے دوبارہ پوچھا۔

”کہو لکھپت! ہم تمہاری کون سی خواہش پوری کریں؟ تمہیں کیا انعام دیں؟“

یہ ہزار دقت ستار نے تھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”ان داتا! آپ کی پسند ہی میرے لئے سب سے بڑا انعام ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں“

چاہیے۔“

جب بڑھا کسی خواہش کا اظہار نہ کر سکا تو شہزادے نے اپنی خوشی سے اُسے خلعت قاضیہ اور اشرافیوں کے توڑے انعام میں دیئے اور ایک فرمانِ خاص بھی عطا کیا کہ وہ جب چاہے فیروز آباد میں آکر دلی عہد سے مل سکتا ہے۔ فیروز آباد ولی عہد ہی کی جاگیر تھی۔ وہ کبھی فیروز آباد میں اور کبھی گلبرگہ میں قیام کرتا تھا۔

یہ انعام، یہ اعزاز، لکھپت کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے فیروز آباد کے راج محل میں جانے کے لئے پروانہ خاص مل جائے گا۔ یقیناً قسمت اس پر اس کی حیثیت سے زیادہ مہربان ہو چکی تھی۔

جب بوڑھا ستار شاعی انعام و اکرام میں لدا پھندا گاؤں میں داخل ہوا۔ تو چاروں طرف لکھپت کی خوش بختی کے ڈٹکے بجائے اور ہر شخص اس کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔

”بوڑھے کے سوتے ہوئے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔“

لیکن کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ ستار کے بھاگ نہیں جاگے تھے۔ پر تھاں کی قسمت نے انکڑائی لی تھی۔

خطرے کا آغاز

لشکر میں صرف روٹن بیگ جانتا تھا کہ اس وادی میں اتنے لمبے پڑاؤ کا مقصد کیا

ہے۔

وہ دلی عہد کا پرانا رفیق اور راز دار تھا اور اس کے مزاج کو سمجھتا تھا۔ اُسے معلوم تھا وہی طور پر بعض چیزیں اس کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں لیکن جونہی اُن کی دلکشی ختم ہوتی ہے وہ انہیں بھول جانے کا عادی ہے۔ البتہ اُسے اس بات کا اندیشہ ضرور تھا کہ پہلے کبھی اس قسم کا رنگین حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ نہ کبھی دلی عہد کے دل کی دھڑکنوں کی کہانی زبان پر آئی تھی۔ نہ اُسے تنہائیوں سے پیار ہوا تھا۔ کہیں یہ تازہ حادثہ دل کا رنگ نہ بن جائے۔ پھر وہ سوچتا محبت کی یہ گنگ چند روز میں خود بخود جاتی رہے گی۔۔۔ درو آپ اپنی دوا بن جائے گا اور شہزادہ پہلے کی طرح اس واقعہ کو بھی بھول جائے گا جو اتفاقی طور پر ظہور میں آ گیا ہے

لیکن جب اس نے دیکھا قیام کی مدت بڑھتی جا رہی ہے اور ولی عہد کی پریشانیوں اور بیقراریوں میں اضافہ ہو رہا ہے تو اس کے اندر بیٹھے ہوئے ہوئے حقیقت کا روپ دھارنے لگے اور ایک روز اس نے اپنے دل میں ایک نئے خطرے کی دھمک محسوس کی۔ وہ کانپ گیا کیونکہ تصور کی آنکھ سے اس نے تخت کے پائے لرزتے ہوئے دیکھے تھے اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے محبت ولی عہد کا رستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور کوئی بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

”تم دو چیزوں میں سے صرف ایک کا انتخاب کر سکتے ہو۔ محبت یا تخت“ اور شہزادہ حسن نے جواب دیا۔ ”مجھے صرف محبت بخش دو، تخت لے لو۔“

یہ تصور کس قدر بھیانک اور روح فرسا تھا۔ شہزادہ حسن خاں جو دکن میں ”شمشیر زن“ کے نام سے مشہور تھا۔ محبت کی خاطر تاج و تخت بھی قربان کر دے گا؟ یہ بات کبھی اس کے وہیم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

دوسری صبح ابھی شہزادہ بیستہ سے بھی نہیں اٹھا تھا کہ خدمت گار نے اطلاع دی۔

”روفق بیک شرف بازیابی چاہتا ہے۔“

کئی روز سے اس نے کسی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ وہ دکن کا اکثر حصہ باہر گزارا کرتا تھا اور شام کو واپس آ کر خیمے میں چلا جاتا۔ کسی شخص کو ملاقات کی اجازت نہ تھی کبھی کبھار جب اس کی طبیعت کچھ زیادہ پریشان ہوتی وہ میرمنی کو بلا کر رباب پر کوئی نغمہ سن لیا کرتا تھا یا پھر خاموش لیٹا خیالوں میں گم رہتا۔ صبح ہی صبح وہ کسی سے ملنے پر تیار نہ تھا کیونکہ وہ اپنے دل میں ایک عجیب سی بیقراری محسوس کر رہا تھا۔ لیکن روفق بیک اس کا مصاحب ہی نہیں ایک دوست بھی تھا اور اس کی بیقراری کا مجید جانتا تھا۔ اس نے توقف کئے بغیر حاضری کی اجازت دے دی۔

جب روفق بیک پردہ ہٹا کر خیمے کے اندر داخل ہوا تو شہزادہ شب خوابی کے لباس میں ایک چوبلی شہ نشین پر پاؤں رکھتے کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں روفق بیک کو شب گزرا وہ اس سے لیکن اس کا تاف غلط تھا کیونکہ جب شہزادہ نے گروں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک نامعلوم سی خوشی چمک رہی تھی۔ وہ مسرت انگیز لہجے میں بولا۔

”روفق بیک! تم خوب آئے۔ میں خود تمہیں بلانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔“

روشنی نے طنز کا شتر چلایا۔

"خلاف معمول آج آپ کو یہ خادم کیسے یاد آگیا؟"

"کیا میں نے کبھی نہیں فراموش کیا ہے؟"

"میرا مطلب ہے آج کل آپ حسین یادوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ایسی حالت

س کوئی دوسرا کم ہی یاد آیا کرتا ہے۔"

اس جواب سے حسن سمجھ گیا کہ وہ کوئی فیصلہ کن گفتگو کرنے آیا ہے اور وہ گفتگو کیا ہو

گئی ہے؟ اس کے متعلق بھی اس کا اعزازہ غلط نہیں تھا۔ اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

"دوسروں کی طرح غالباً تم بھی قیام سے تنگ آ چکے ہو اور اس وقت یہ دریافت

کرنے آئے ہو کہ کوچ کا حکم کب ملے گا؟"

"آپ کا قیاس بالکل درست ہے کہیں یہاں مستقل پراڈ کا ارادہ تو نہیں؟"

"جی تو یہی چاہتا ہے۔ فیروز آباد کو چھوڑ کر اسی وادی میں آ رہوں۔"

"یہ د مبارک خیال ہے۔" روشنی نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لئے۔

"بھئیوں نے بستی چھوڑی تھی آپ شہر چھوڑ دیں مگر لشکر بچارے نے کیا جرم کیا ہے۔

میں کی سزا میں اسے یہاں لا کر بٹھا دیا گیا ہے؟"

"تم چاہو تو لشکر لے کر فیروز آباد چلے جاؤ۔"

"اور آپ یہاں محبت کا چلہ کھینچیں گے؟"

"تم نہیں جانتے ایک امیرے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔ کئی مرتبہ خیال آیا

کہ ظلم سبحانی انتظار کرتے ہوں گے مگر قدم اس وادی سے اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے۔ ہر شام

کوچ کا ارادہ کرتا ہوں لیکن ہر صبح یہ سوچ کر ارادہ توڑ لیتا ہوں کہ آخر فیروز آباد جا کر بھی

کیا کروں گا۔ کیوں نہ کچھ روز آنکھوں کی پیاس بجھالوں۔"

"اگر سلطان عالی تک یہ خبر پہنچ گئی تو آپ جانتے ہیں کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا۔ وہ مجھے دلی عہدی سے محروم کر دیں گے۔"

"اور آپ کے نزدیک یہ معمولی سی بات ہے۔"

"تم نہیں جانتے جب شعلے بھڑک اٹھتے ہیں تو تاج و تخت بھی محبت کا ایندھن بن

جاتے ہیں۔"

روشن بیگ تے حیرت پاش نظروں سے ولی عہد کی طرف دیکھا بھر کہنے لگا۔ "جانا عالم! دکن کا تخت اتنا حقیر نہیں کہ اسے ایک معمولی لڑکی کی محبت کا ایندھن بنا دیا جائے ہزاروں ٹکواریں اس تخت کی خاطر خون میں ڈوب کر ابھری ہیں ہم نے اپنا لہو دے کر اس کو حاصل کیا ہے اور آپ اسے ایک آنکھ کے اشارے پر قربان کر دینا چاہتے ہیں۔"

"شاید تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں جانتا ہوں پر تھال کا حسن آپ کے ہوش و حواس چھین چکا ہے۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟"

شہزادے کے لہجے میں دیکھا گی سی پائی جاتی تھی جیسے محبت کی بساط پر وہ اپنا سب کچھ بار چکا ہو۔

"یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔۔۔۔۔ بس آج کوچ کی تیاری کیجئے، فیروز آباد پہنچ کر آپ کوئی بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔"

"لیکن ایک دن تو اور ٹھہر جاؤ۔"

"کیوں۔۔۔۔۔ اس ایک دن میں کیا انقلاب آجائے گا؟"

"یہی بتانے کے لئے تو میں تمہیں بلانے والا تھا۔"

"کیا کوئی عہد و بیان باقی رہ گیا ہے؟"

"عہد و بیان تو سب ہو چکے ہیں۔"

"پھر؟"

ولی عہد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر قریب آ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر

اویسے۔

"بس آج کی رات حسن عشق کا مہمان ہو گا۔"

یہ سن کر روشن بیگ یوں اچھل پڑا جیسے اسے کسی بچھونے کاٹ لیا ہو۔ تعجب سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ میں نے پر خال کو دعوت دی ہے۔ آج وہ چراغ جلے اسی خیمے میں آئے

اور میں اس کا میزبان بنوں گا۔"

”معلوم ہوتا ہے آپ سچ دیکھ رہے ہیں۔“

”کیوں۔۔۔ اس میں دیوانگی کی کون سی بات ہے؟“

”جان عالم! پرتھالی یہاں آئے گی اور سپاہی وہ راز پالیں گے جسے آپ آج تک چھپاتے رہے ہیں۔ یہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔ خدا کے لئے اپنی رسوائی کو دعوت نہ دیجئے۔“

”نہیں۔۔۔ وہ پرتھالی بن کر نہیں آئے گی۔“

”تو کیا چھلا وہ بن کر آئے گی؟“

”یہ تمہیں وقت پر معلوم ہو جائے گا۔“

دلی عہد کے لمحوں پر ایک غصے خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور روشنی بیک کی آنکھیں ابھی تک کھلی کی کھلی تھیں جیسے اُس پر جادو پھونک دیا گیا ہو۔ اُس کا خیال تھا شہزادہ پرتھالی کو نہیں، مستقبل کے ایک خطرے کو دعوت دے رہا ہے۔

خوبصورت راجکمار

سر شام ہی غلاموں نے کانوری شمعیں روشن کر دیں اور حنبر وعود سلگا دیئے۔ وسیع و عریض خیمہ خوب آراستہ تھا۔ جسے ایک بڑے اور دو چھوٹے کمروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ فرش پر ایرانی قالین بچھے تھے۔ دروازوں پر رنگین اٹلس کے پردے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر مستطیل کپڑے آویزاں تھے جن پر مختلف قسم کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ کسی تصویر میں ہاتھی کے شکار کا نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ کسی میں بھالے کی نوک شیر کے سینے میں اتر چکی تھی اور وہ خاک و خون میں لتھڑا پڑا تھا ایک تصویر میں ستارنواز سفید کی لمبی اور چمکی انگلیاں تاروں کو چھو رہی تھیں۔ سامنے چھ ہرنیاں کھڑی تھیں جیسے وہ نغمے کی لے سن کر چونک اٹھی ہوں۔

غرض خیمے کو بڑی چائیکدستی کے ساتھ۔ ایک آراستہ و پیراستہ ”سفری محلہ“ میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور بادی انگلر میں بھی گان ہوتا تھا۔ یہ خیمہ نہیں شاہی خواب گاہ کا کوئی حصہ ہے۔ سلطان یا شہزادے جب کبھی سفر پر نکلتے تو یہ سفری ساز و سامان اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔

شہزادہ حسن خاں اور روتی یک ایک چوبی شیشیوں پر بیٹھے، جو سرخ رنگ کے دبیز تالیں سے مزین تھی شطرنج کھیلنے میں مصروف تھے۔ میر مفتی نے ایک کونے میں رباب چھیڑ رکھا تھا اور موسیقی کی ہلکی ہلکی آوازیں خواب آگیز تصور کی مانند کمرے میں تیر رہی تھیں۔ باہر مسلح سپاہی بیروں سے رہے تھے۔ شہزادہ ہر آہٹ پر چونک اٹھتا تھا اس کے چہرے سے فرحت زار اضطراب ظاہر تھا جیسے وہ کسی کا منتظر ہو۔ شاید یہ اسی اضطراب کا نتیجہ تھا کہ اس کے روتوں "ٹیل" اور کئی "پیادے" روتی یک کے "سپ" کی زر میں آکر ٹھکانے لگ چکے تھے۔ دوسری چال میں شہزادہ کا ایک "سرخ" پلٹنے ہی والا تھا کہ اچانک چوہدار کورنش بجا لایا اور اس نے خبر دی۔

"کرناٹک کا راجبھار در دولت پر حاضر ہے۔ شرف باریابی چاہتا ہے۔"

شہزادے نے ہاتھ میں پکڑا ہوا "فرزین" بساط پر پھینک دیا اور مضطرب ہو کر اٹھا۔ پھر اس نے حکم دیا۔

"راجبھار کو عزت کے ساتھ پیش کیا جائے۔"

چوہدار پلٹ گیا اور شہزادے کے اشارے پر میر مفتی بھی دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

"کرناٹک کا راجبھار؟" روتی یک کے ہونٹ تھر تھرائے اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ابھی حریف کچھ سوچتے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرے ہی لمحہ ایک خوبصورت نوجوان سر پر کمر کی راز بگڑی باندھے۔ چست پاجامہ اور روشنی انگرکھا اوڑھنے۔ ہیکڑی پر کٹنی لگائے اور گلے میں پیش قیمت موتیوں کا ہار لٹکائے خیمہ میں داخل ہوا۔ شکل و صورت اور قیمتی ملبوسات سے وہ کسی ریاست کا راجبھار معلوم ہوتا تھا۔ چہرے کے خدو خال اس کی خوش بختی کی نگاہی کر رہے تھے اور اس کی ہر رفتار چال نے شاہی رعب و داب برپا کیا تھا۔

شہزادہ حسن خاں کو دیکھتے ہی راجبھار نے بڑے احترام کے ساتھ جھک کر کورنش کی رسم ادا کی۔ پھر ادب سے زلی عہد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک جادو آمیز کشش تھی۔ روتی یک مسکورتھا ہونے سے اُسے دیکھنے لگا۔

"شاید مجھے آنے میں دیر نہیں ہوئی۔" راجبھار کی آواز نے خیمے کا ڈھرکتا ہوا سکوت

ڑ دیا۔

”نہیں راجکمار! تم ٹھیک وقت پر آئے ہو۔“ شہزادے نے جواب دیا پھر آگے بڑھ کر اس نے راجکمار کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”راجکمار جی! ان سے ملو۔“ وہ رونق بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ حیرت بخشی دربار کے خاص مصاحب، سلطان معظم کے منظور نگاہ اور میرے بے تکلف دوست رونق بیگ سہ ہزاری ہیں۔“

فعلی اس کے کہ راجکمار رونق بیگ کو مخاطب کرتا۔ شاہی رسوم و آداب کے پیش نظر رونق بیگ نے خود ہی جھک کر راجکمار کو سلام کیا۔

”جیتے رہو رونق بیگ!“

شہزادہ حسن کے لیوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی..... پھر وہ راجکمار سے مخاطب ہوا۔

”رونق بیگ سے کسی قسم کا پردہ نہیں راجکمار! یہ کھڑکی دار پگڑی اتار دو اور اپنی اصلی شکل دکھاؤ۔“

اس کے جواب میں راجکمار نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے بیگ کی طرف دیکھا پھر پگڑی اتار دی اور اس کے ساتھ ہی لائی لائی زلفیں اس کے شانوں پر بکھر گئیں..... رونق بیگ حیرت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ پرتھالی تھی جو کتنا لگی راجکمار کا روپ بدل کر شہزادہ حسن کی ملاقات کے لئے آئی تھی۔

رونق بیگ نے پہلے پرتھالی کی طرف اور پھر شہزادے کی طرف دیکھا اس کی نگاہوں میں ایک ناقابل یقین حیرت کر دہ محسوس ہوتی تھی۔ وہ پرتھالی کے مثالی حسن و جمال کے علاوہ اس کی جرأت و ہمت پر بھی دم بخود تھا۔

”کیوں رونق بیگ!“ شہزادے نے اس کی حیرانگی کو بھانپ لیا تھا۔

”جانب عالم! کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا..... پریوں اور اپسراؤں کے گھس گھسے سے تھے۔ آج میں نے وہ جادو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔“

شہزادہ مسکرا کر رہ گیا اور پرتھالی کے رخساروں پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

چوٹی شمشین کے ساتھ ہی روشنی پروے لٹک رہے تھے۔ پرلی طرف ایک اور خوبصورت کمرہ آراستہ کیا گیا تھا۔ ملاقات کا کمرہ جہاں فانوس میں مشکبار شمعیں روشن تھیں اور دیواروں کو بہترین تصاویر سے مزین کیا گیا تھا۔ حسن نے پردہ اٹھایا اور وہ تینوں اُس خواب آگئیں کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں اطمینان کے ساتھ گفتگو ہو سکتی تھی۔ چوہدری کو بھی اس کمرے میں داخلے کی اجازت نہ تھی۔

میر لشکر... فوج کے سپاہی اور خیمہ کے محافظ صرف اتنا جانتے تھے کہ کرناٹک کا ایک راجکار ولی عہد سے ملاقات کے لئے آیا ہے اور یہ قیاس کچھ خلاف توقع بھی نہیں تھا کہ یقیناً وہ بیجا نگر کے راج دیوارے کی طرف سے صلح کا پیغام لے کر آیا ہوگا، جو سلطانی علاقے کی سرحدوں پر اکثر ناخست و تاراج کرتا رہتا ہے لیکن انہیں کیا خبر تھی کرناٹکی راجکار کا روپ دھار کر ولی عہد کے خیمے میں ایک ایسی قیامت داخل ہو چکی ہے جو دکن کی تاریخ کا رُخ موڑ دے گی۔ البتہ یہ بات اُن کے لئے حیران کن تھی کہ راجکار کے ساتھ کوئی محافظ یا مصاحب کیوں نہیں آیا؟

میر لشکر چوہدریوں کو مستعد رہنے کی ہدایت دے کر اپنے خیمے کی طرف چلا گیا وہ خود بھی بڑا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ کیا معلوم شہزادہ اُسے کتنی وقت خیمہ خاص میں طلب کر لے۔

روشن بیگ ابھی تک حیرت کی لہروں میں بہا جا رہا تھا۔ اُس نے کمرہ ملاقات کے خوابی ماحول میں ایک مرتبہ پھر پر تھال کو غور سے دیکھا جو کاکوڑی شمعوں کی روشنی میں آکاش کی دہوی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کی پیشانی پر ایک ایسی چمک تھی جو صرف شاہی خالوادے کی عورتوں کے ماتھے پر دیکھی گئی تھی۔ اس کی رفتار میں قہقہے ہی نہیں ایک حرکت بھی تھی جو شہزادیوں کے لئے مخصوص ہے۔ روشن بیگ سوچنے لگا۔ گاؤں کی ایک الہز و شیرہ۔ ایک معمولی ستار کی لڑکی کیا سچ دکن کی رانی بن جائے گی؟ لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے سنائے گی اور اس کے اشارہ ابو پر پورے دکن کی تقدیر رقم کرے گی؟

پر تھال نے ماتھے کی چمک نے اُسے حیرت انگیز حد تک مبہوت کر دیا تھا۔

"روشن بیگ! اچانک اس نے ولی عہد کی آواز سنی۔" کیا سوچ رہے ہو؟

بیگ کو یوں محسوس ہوا جیسے ولی عہد کی آواز بہت دور سے آئی ہو حالانکہ وہ اس کے

پاس ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”شاید یہ میرے بارے میں پریشان ہیں۔“ پرتھال نے گویا اس کے ذہن میں ابھرتے ہوئے سوالات کو بھانپ لیا تھا۔ رونق بیگ اس کی فراست کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

”یقیناً میں آپ ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔“

”کیا؟“ شہزادہ اپنا اضطراب نہ چھپا سکا۔

”یہی کہ آپ نے ایک گوبر نایاب، ایک قیمتی ہیرا تلاش کیا ہے۔“

اس تعریف پر شہزادہ کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی اور وہ مشتاق نگاہوں سے پرتھال کی طرف دیکھنے لگا۔

”مگر یہ تو پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں یقیناً کوئی اور بات ہوگی۔“

رونق بیگ بوکھلا اٹھا۔ تو کیا اس سنار زادی کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کیوں پریشان

ہوں؟

”اچھا رونق بیگ! کوئی اور بات کیا ہے جس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے؟“

”جانبِ عالم میں سوچ رہا ہوں۔ کیا سلطان معظم اس حسین ہیرے کو تاج شاہی کی۔

زینت بنانے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ کل سراسر کے قوانین تو آپ جانتے ہیں۔“ رونق بیگ

نے صاف لفظوں میں اُس اندیشے کا اظہار کر دیا جو آج نہیں تو کل ضرور پیش آنے والا تھا

ولی عہد یہ سن کر چونک اٹھا جیسے یہ بات اس کی مرضی کے خلاف کہی گئی ہو۔ اُس کے

چہرے کا رنگ اچانک سرخ ہو گیا۔ جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ برا فروخت ہے۔ ویسے

بھی اُس وقت جب اس کے دل میں ہزاروں تمنائیں جگنوؤں کی مانند جھللا رہی تھیں ایسی

بدشگونی کی بات مناسب نہ تھی۔ اگر رونق بیگ کی بجائے وہ فقرہ کسی دوسرے کی زبان سے

نکلا ہوتا تو اُس کی زبان کھینچ لی جاتی لیکن بیگ اس کا مصاحب ہی نہیں بے تکلف دوست

بھی تھا پھر بھی اُس نے شعلہ بارنگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”شاید تمہارا دماغ پھر گیا ہے رونق بیگ؟“

”نہیں جانبِ عالم۔۔۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ میرے دل کی آواز ہے۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہے تم اپنی بات پر ضد کرنا چاہتے ہو؟“ ولی عہد کے لہجے میں

خشونت تھی۔

”نہیں..... مجھے صرف پر تھاں کا خیال پریشان کر رہا ہے۔“

اچانک پر تھاں کی شیریں اور مترنم آواز سنائی دی..... ”لیکن میں گل میں رانی بن کر نہیں..... صرف جانی عالم کی داسی بن کر رہنا چاہتی ہوں۔“

اس فقرے میں سادگی تھی اور فلوں کی منھاس، رونق بیگ بے حد متاثر ہوا پھر وہ کہنے لگا۔

”میں کوشش کروں گا۔ شاہی گل میں تمہیں پورے اختیارات مل سکیں۔“

بیگ نے یہ فیصلہ کرنے میں یقیناً کوئی غلطی نہیں کی تھی..... کہ وہ شہزادی بے شک نہیں مگر ایک شہزادے کی محبوبہ کہلاتے کی ضرورت ہمارے ہے۔ غیر معمولی حسن و جمال کے علاوہ قدرت نے اسے شیریں بیانی بھی عطا کی تھی۔ وہ گفتگو کرنے کے آداب بھی جانتی تھی۔

”مگر تمہیں ایک بات کا خیال رکھنا ہو گا۔“ بیگ پر تھاں سے مخاطب تھا۔ ”اگر گل میں تمہیں اختیارات مل گئے تو ان کا استعمال کہیں بھی پر شروع نہ کر دینا۔“

اس کے جواب میں پر تھاں کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ناچ اٹھی۔

حسن کا وہ تمام غصہ اتر چکا تھا جو چند لمحوں پہلے سندھوی جھاگ کی طرح اچانک نمودار ہوا تھا۔ اب اس کے چہرے پر ایک بشارت تھی۔

”دیکھا.....“ وہ پر تھاں کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے نہیں کیا تھا بیگ ایک دلچسپ آدمی ہے وہ ہر جگہ تمہارا خیال رکھے گا۔“

”ہر جگہ کا کیا مطلب..... میں صرف شاعری گل کا ذمہ دار ہوں۔“

شاہی گل سرا میں رونق بیگ کو جو مقام حاصل تھا۔ اسے شہزادہ بھی خوب جانتا تھا سلطان کے اعتماد کی وجہ سے گل کے کسی شخص کو اس کے حکم سے مجال انکار نہ تھی حتیٰ کہ بعض اوقات بیگات بھی اس کی سفارش کا سہارا ڈھونڈا کرتی تھیں۔ کئی دنوں اور خواجہ سراؤں کی تو اسے دیکھتے ہی سنی ٹم ہو جاتی تھی اگرچہ سازشوں کے جال تو پھنسے ہی جاتے تھے مگر رونق بیگ سے کوئی بات چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ کئی دنوں کے مارے خود ہی اس کے سامنے سارا راز اگل دیتی تھیں حتیٰ کہ سردار خواجہ سرا ہر دریں بھی اسی سے خوف کھاتی تھی جس کی

تھوڑی دیر کے بعد رونق یک آتا دکھائی دیا۔ اُس نے کمر میں تلوار باندھ رکھی تھی۔ اور اُس کے قدم ایک فوجی کی مانند بڑی مستعدی کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ اس وقت اچانک بادے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے جب وہ قریب آیا تو شہزادے نے کہا۔
 ”رونق یک! تم راجہ کو چھوڑنے جاؤ گے۔“

”کیا راجہ ایک رات بھی نہیں ٹھہریں گے؟“ یک کے لہجے میں ایک لطیف طنز تھی۔

”نہیں..... سرحد پر ان کا انتظار ہو رہا ہے۔“ پھر شہزادے نے آگے جھک کر سرگوشی کے انداز میں..... ”اور یہ سرحد گاؤں کا پچھٹ ہے۔ بس تمہیں وہیں تک ساتھ جانا ہو گا۔ سمجھ گئے نا؟“

رونق یک نے سر کو خیف سا جھٹکا دیا۔

پھر راجہ ایک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ شہزادہ اور یک نے اُسے حیرت سے دیکھا..... ”تو کیا وہ ایک عہدہ شہسوار بھی ہے؟“ دونوں کے ذہن میں یک وقت ایک ہی سوال ابھرا اگرچہ شاہی خاندان کی عورتوں کو شہسوار کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی لیکن یہ جستی تو انہیں کسی شہزادی میں بھی نظر نہ آ سکتی تھی۔

راجہ نے سر کے اشارے سے ولی عہد کو رخصتی سلام کیا اور گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ رونق یک بھی رکاب میں پاؤں ڈال چکا تھا۔ گھوڑا بڑھا کر وہ بھی پرتھال کے ساتھ ساتھ ہونے لگا۔ جب تک وہ نگاہوں سے اوچھل نہیں ہو گئے۔ شہزادہ بدستور کھڑا رہا۔ چاندنی روشنی میں ان کے دور ہوتے ہوئے سائے بتدریج دھندلائے جا رہے تھے حتیٰ کہ سفید دھبوں میں منتقل ہو کر وہ فضا میں گھل مل سے گئے اور شہزادہ ایک گہرا سانس لے کر خیمے کی طرف بڑھا۔

پیرے دادوں نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت میں ایک عجیب سی بے قراری پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی قدم اٹھا رہا ہے جیسے اس کا دماغ ساتھ نہ دے رہا ہو پھر کبریاں تک کے راجہ کی اچانک آمد اور یکا یک روانگی کا منہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ انہوں نے سوچا ممکن ہے راجہ کی آمد ہی ولی عہد کے لئے کسی نئی پریشانی کا باعث بن گئی ہو لیکن وہ پریشانی کیا ہو سکتی ہے۔ کہیں راجہ واپس آنے کے لئے کسی کی کوئی ایسی شرط تو پیش نہیں کر دی جسے

دورانہ کیا جاسکے؟

پہرے داروں کے دماغ ابھی تک رابکمار ہی کے ارد گرد گھوم رہے تھے دروازہ کے قریب پہنچ کر شہزادہ ایک دم پلٹا اور بولا۔

”جب رونق بیگ واپس آئے اُسے ہمارے پاس بھیج دو۔“ پھر وہ خیمے کے اندر غائب ہو گیا۔



چلتے چلتے اچانک پرتھال کے لیوں کو جنبش ہوئی۔

”رونق بیگ! تم ولی عہد کے سامنے ایک خطرے کا اظہار کرتے کرہتے رہ گئے تھے۔ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں اگر سلطان عالی نے محل سرا میں میرا داخلہ پسند نہ کیا تو کیا ہو گا؟“

بیگ کے لئے یہ سوال یقیناً غیر متوقع تھا۔ اُس نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے سلطان معظم ایسا نہیں کریں گے۔ انہیں جان عالم سے محبت ہے اور وہ شہزادے کی کسی بات کا انکار نہیں کرتے۔“

”لیکن راج و دربار کی مصلحتیں اس محبت کے آڑے بھی آسکتی ہیں۔“

”اس صورت میں شہزادے کا فیصلہ اٹل ہو گا۔“

”کیا فیصلہ؟“ پرتھال کا سوال ایک نامعلوم تشویش سے بوجھل ہو رہا تھا۔

”ولی عہد سوچنے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے اور فیصلہ کر لینے کے بعد دنیا کی کوئی طاقت انہیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔“

”میں جانتی ہوں۔ وہ اپنی بات کے دھنی ہیں۔ اسی لئے ڈرتی ہوں میرا بیار انہیں کسی امتحان میں نہ ڈال دے۔“

”محبت کرنے والے امتحان سے نہیں ڈرا کرتے پرتھال!“

”لیکن میں نہیں چاہتی وہ میرے لئے کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔“

”اگر آدمی خود دعوت نہ دے تو مصیبت اپنے پاؤں سے چل کر نہیں آیا کرتی۔“

ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد پرتھال پھر کہنے لگی۔

”میں نہیں جانتی وہ کون سی کشش تھی جو بے اختیار مجھے ولی عہد کی طرف کھینچ کر لے

گئی اور میں نے انہیں من مندر کا دیوتا بتالیا۔ اب میرے سانس کا رشتہ اُن کے جیون کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔“

”آدمی پیار کے بندھن میں پھنس جائے تو یہی کچھ ہوتا ہے لیکن فکر نہ کرو۔ اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تم دلی عہد کو پالو گی۔“

”سچ رونق بیک!“

”ہاں..... میں غلط نہیں کہتا۔“

”مگر نہ جانے کیوں میرا دل کسی آنے والے خطرے کے ڈر سے دھڑک رہا ہے میرے ذہن پر خوف کی پر پھایاں سی ریگٹنے لگی ہیں۔“

پرتھال کی آواز کپکپا رہی تھی۔ وہ ڈوبے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ ”دل بے سبب نہیں دھڑکا کرتے رونق بیک! کہیں میری وجہ سے جان عالم پر کوئی مصیبت نہ ٹوٹ پڑے۔“

عزیز کا ہاتھ پکڑ کر وہ راج دربار کی نظروں میں مگر نہ جائیں۔“

”پرتھال!“

”تو بھر میرے دسو سے خوف کا بڑوپ کیوں دھار رہے ہیں؟“

تمہیں اس قسم کی بات سوجھتی بھی نہیں چاہیے۔“ رونق بیک کے لہجے میں سرزنش تھی۔

”جان عالم شہزادہ ہی نہیں ولی عہد سلطنت بھی ہیں جن کی زندگی کے ساتھ راج دربار کی تقدیر وابستہ ہے۔ وہ دکن کے ہونے والے بادشاہ ہیں اور ہمیں آئین کی رو سے سلطان معظم کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے جواب دہ نہیں۔“

پرتھال گھوڑے کی پیٹھ پر کانپ سی گئی۔ اُس نے بیک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے شاکر رونق بیک! میں نہجک گئی تھی۔ ایک بھیانک خطرے کے تصور۔“

میرے ہوش و حواس چھین لئے تھے لیکن تم نہیں جانتے جب ہندو عورت کسی سے چباز کر لگتی ہے تو اپنے آپ کو بھول جاتی ہے۔ محبوب کو لو کا چھو بکا بھی چھو جائے تو اُس کے دل کا انکارے لوٹ جاتے ہیں۔ پھر وہ تو جان عالم ہیں۔ دکن کے ولی عہد۔“

رونق بیک کو محسوس ہوا جذبات کی شدت سے اُس کی آنکھیں نم آلود ہو گئی ہیں کیونکہ چاند کی روشنی میں وہ پہلے سے زیادہ چمک رہی تھیں۔ محبت کا اظہار اُس کے خلوص

دل کی ترجمانی کر رہا تھا۔ بیک سمجھ گیا شہزادے کی خاطر وہ اپنی جان پر تھیل جانے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ وہ تثنیٰ امیر لہجے میں بولا۔

”تم نے اپنی ڈور ایک دلی عہد کے دل کے ساتھ باندھی ہے۔ کسی معمولی آدمی کا ہاتھ نہیں پکڑنا۔ اب حوصلہ زکو اور وقت کا انتظار کرو۔ میں ہر حال میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

پر تھال کو یوں لگا جیسے رونق بیک نے اس کے دھنوں پر مرہم رکھ دی ہو۔

”میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی بیک۔“

چاند افق سے ابھر کر ندی کنارے درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہا تھا اس کی درد رنگت اب دودھیا روشنی میں تبدیل ہو چکی تھی جیسے کائنات کو فرتی غبار کی مہین سی چادر اوڑھا دی گئی ہو۔ اس چاندنی رات میں اُن کے گھوڑے خاموش اور خوابیدہ فضا کے سینے میں آئیں بیدار کرتے ہوئے چلتے جا رہے تھے۔

گاؤں صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا جس کی کچی عمارتیں چاندنی کے غبار میں مدفون تھیں۔ بیکھٹ سامنے ہی نظر آ رہا تھا جس کے پاس ایک نیم شکست عمارت میں مٹی کا دیا ٹٹل رہا تھا۔ لکھت رونق بیک نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ شکست عمارت کے دروازے پر ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔ اس سائے کی طرف دیکھ کر پر تھال کہنے لگی۔

”گوری ابھی تک میری راہ دیکھ رہی ہے۔“

”کون گوری؟“

”گاؤں کے کھیا کی لڑکی ہے۔ میری سہیلی! میں اُسے ہمیں چھوڑ گئی تھی۔“

رونق بیک کے لبوں پر مسکراہٹ بچھل گئی۔ ”تو گوری کو تم نے اپنا سراز بنالیا ہے۔“

”تم بھی تو جان عالم کے راز دار ہو۔“

”مجھے اب داپس چلنا چاہیے۔“ بیک نے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے کہا۔

”تمہاری منزل آگئی ہے۔“

”اپنی منزل تو میں پیچھے چھوڑ آئی ہوں بیک!“ اُس نے آواز میں لہجے میں جواب دیا۔

”کل سویرے امیر دروازہ آباد روانہ ہو جائیں گے۔“

”جان عالم سے کہنا مجھے بھول نہ جائیں۔“

”وہ بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھول سکیں گے۔ اچھا خدا حافظ۔“

پھر رونق بیگ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سر پٹ ہو لیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ
 زحول کے مرغلوں میں غائب ہو چکا تھا۔ پر تعالٰیٰ چند لمحے کھڑی اُسے دیکھتی رہی پھر اُس
 نے گھوڑے کا رخ شکستہ عمارت کی طرف موڑ لیا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے اُس نے
 دیکھا آسمان کی مغربی سمت ستارہ مشتری بڑی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔



حبیبی

پاک سوسائٹی
 ڈاٹ کام

حسن کا شکاری

بیجانگر میں

چنڈت گورکھ ناتھ راگ و دیا ہی کا ماہر نہیں تھا اس کے علم و فضل اور دھرم گیان کی شہرت سارے کرناٹک میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بیجانگر کے آشرم کا مہارپوتہ تھا جہاں ایک سو دیوداسیاں اس کے علم و ہنر سے کسب فیض کرتی تھیں۔ اور جو خوش نصیب کنواریاں اس کی نگاہ کرم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ انہیں بیجانگر کے شاہی رنواس میں داخلہ مل جاتا جہاں وہ مہاراج دیورائے کی حسین خلوتوں کی رونق بنتی اسی لئے بوڑھا بڑھن بیجانگر کے راج دربار میں خاص مقام رکھتا تھا۔ بلکہ مہاراج کے بعد صرف گورکھ ناتھ ہی ایک ایسا آدمی تھا جو راج رنواس میں جہاں پر عہد بھی پر نہیں مار سکتا تھا بلا روک ٹوک آجائے سکتا تھا۔ کاشی کی یا ترائے کے بعد جب وہ بنارس سے لوٹا تو بیجانگر میں بڑی جیتابی کے ساتھ اس کا انتظار کیا جاتا رہا۔ پورن ماشی کی رات آشرم کی دو کنواریوں کو رنواس میں داخلہ لینا تھا جس کے لئے چنڈت گورکھ ناتھ کی حاضری ضروری تھی کیونکہ اس کے حکم یا اجازت کے بغیر کوئی دیوداسی رنواس میں نہیں جاسکتی تھی۔ راج محل میں جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور قاصد مہاراج دیورائے کو اطلاعات پہنچا رہے تھے کہ مہارپوتہ برہمنی سلطنت کے راستے جگہ جگہ لوگوں کو اشیر داد دیتا اور مگر مگر میں پڑاؤ کرتا ہوا بیجانگر کی طرف چلا آ رہا ہے۔ لیکن جونہی وہ مدگل کے علاقہ میں پہنچا اس کا پڑاؤ طویل ہونے لگا۔ حتیٰ کہ پورن ماشی کی رات آئی اور گزر گئی۔ آشرم کی دیوداسیاں راج رنواس میں داخلہ نہ لے سکیں۔ راجہ دیورائے اپنی

خلوتوں میں نئے ستارے روشن نہ کر سکا اس نے جوش غضب میں پھنکارے ہوئے راج
منتری کو حکم دیا کہ پنڈت گورکھ ناتھ کو حاضر کیا جائے لیکن گورکھ ناتھ بیجا نگر میں نہیں تھا
کرناٹک میں نہیں تھا بلکہ کوسوں دور دکن کی ایک بڑے بہار وادی میں نکجیت سنار کی لڑکی
پر تھاں کو سنگیت وڈیا سکھا رہا تھا بوڑھا برہمن بیجا نگر کو بھول گیا تھا۔ آشرم اور اس کی
دیو داسیاں پر تھاں کے حسن جہاں سوز کے سانسے جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ مہاراج دیوارے
کا غضبناک اور خشونت بار چہرہ بار بار گورکھ ناتھ کے تصور میں ابھرتا لیکن وہ سر جھک کر کسی
دوسری طرف متوجہ ہو جاتا وہ اپنے دماغ سے بیجا نگر کی ہر یاد محو کر دیتا چاہتا تھا اس وقت
تک جب تک پر تھاں کی سنگیت وڈیا پوری نہیں ہو جاتی اور اب پورے ایک سال بعد
پنڈت گورکھ ناتھ کی سواری بیجا نگر کی طرف جاری تھی۔ بیلوں کے گلے میں باندھی ہوئی
کانسی کی گھنٹیاں مہاراج پر دھت کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں بیجا نگر کے نئے ہوئے راجے
جاگ اٹھے تھے اور سلطانوں پنڈت اور پر دھت گورو دیو کا سواگت کرنے کے لئے شہر سے
باہر نکل آئے تھے۔

دور غروب ہوتے ہوئے سورج کی بھٹی شعاعوں میں جب اسے اپنے آشرم کے
سنہری گلے چمکتے ہوئے دکھائی دیئے تو اس کے یورجے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ
 نمودار ہوئی اسے آشرم سے کتنا پیار تھا پھر کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں تھی کہ اس نے ایک
سال کی طویل مدت اپنے دس سے باہر ایک دوسری سلطنت میں گزار دی تھی لیکن پنڈت
گورکھ ناتھ کا کوئی کام حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

نیل گاڑی ایک موٹر پر دوک دی گئی سانسے پنڈت اور پر دھت قطار در قطار کھڑے
تھے اور ان کے درمیان آشرم کی حسین دیو داسیاں اپنے گرو کا سواگت کرنے اور آشرم
حاصل کرنے کے لئے موجود تھیں جونہی پنڈت گورکھ ناتھ نے نیل گاڑی کے جھروکے سے
نکل کر درشن دیئے فضا میں سکھ بخنے لگے اور تمام لوگ ہاتھ باندھ کر سرگوں ہو گئے پھر
برہمن مہاراج نے ہاتھ اٹھا کر انہیں آشرم وادی وہ یہ دیکھ کر کسی قدر حیران ہوا کہ بیجا نگر
کے مندروں اور آشرم کے پنڈت پر دھتوں کے علاوہ راج دیوار کا کوئی آدمی اس کے
سواگت کو نہیں آیا حالانکہ اس کی آؤ بھگت کے لئے سرکاری آدمیوں کا پیشہواہی کے لئے آنا
ضروری تھا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤلز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے ایچ پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

”تو کیا مہاراج دیوارے اس کے مذہبی تقدس کو بھول چکا ہے؟“
 دیوانسیوں نے دوڑ کر بتل گاڑی کو گھیر لیا پھر پنڈت اور پردھت آگے بڑھے اور
 س نے گورو دیو کے قدم چھونے کو رکھنا تھہ بنے ایک بڑھے پردھت کی طرف انگلی
 کی۔

”گورو دھن... مہاراج کس حال میں ہیں؟“
 یہ سوال اس بات کا اشارہ تھا کہ راج رنواس کی حالت کیسی ہے اور تمہارا گورو دیو
 مہاراج کے ذہن سے اتر تو نہیں گیا؟
 گورو دھن نے پنڈت گورکھ ناتھ کا سوال سمجھ لیا تھا لیکن سوچ کی نزاکت کے پیش نظر
 نے مختصر سا جواب دیا۔

”مہاراج کی طبیعت ٹھیک نہیں گورو دیو! جب سے آپ کاٹھی کی پاترا پر گئے ہیں وہ
 اداس رہتے ہیں اور کئی کئی روز رنواس سے باہر نہیں نکلتے۔“
 یہ جواب سن کر یوڑھا ایک گہری فکر میں ڈوب گیا ایک لمحہ کے بعد اس نے گویا حکم
 دے ہوئے کہا۔

”مجھے آج ہی آشرم میں لو گورو دھن! میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”جو آ گیا مہاراج!“
 پھر پنڈت گورکھ ناتھ کی سواری آگے بڑھی سکھ چھوٹے گئے۔ اور کالسی کی گھنٹیوں کا
 بجا کر کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔

ست کا امرت

آشرم کی دوسری منزل پر ایک وسیع اور خوبصورت گزریے میں پردھت گورو دھن پنڈت
 رکھنا تھہ کے سامنے کھڑا تھا۔ کمرے کے وسط میں فانوس روشن تھے جن کی زرد روشنی میں
 راج رنواس کے سر کی چند یاچک رہی تھی اور وہ بالکل ایک کچھوے کی طرح دبک سا گیا تھا
 وہ کسی اہم بات کا انکشاف کرتے ہوئے خوف محسوس کر رہا تھا۔
 ”پھر کیا ہوا؟“

گورو گورکھ ناتھ نے حکمانہ لہجے میں پوچھا۔

”پھر۔۔“ گوردھن کے ہونٹ تھمرائے اور پھر پورنماشی کی رات ہم پر قیامت گئی۔ مہاراج کا حکم تھا۔ شکستلا اور دوشی کو مردی کا جوڑا پہنایا جائے، اور معمولی رسوم کرنے کے بعد انہیں راج رواس میں داخل کیا جائے۔ یہ حکم سن کر ہم کانپ اٹھے۔

راج منتری خود مہاراج کا سندس لے کر آئے تھے، ان کے ساتھ نیزہ بردار سپاہ بھی تھے جب وہ آشرم میں داخل ہوئے۔ دیوداسیاں ڈر کے مارے اپنے کمرؤں میں گھس گئیں، اور انہوں نے اعد سے کنڈیاں چڑھالیں، شکستلا اور دوشی میرے کمرے میں موجود تھیں لیکن نہ انہوں نے سر کے بال کھولے نہ چہرہ ڈالا نہ جسم پر اینٹن ڈالا نہ دودھ چھڑکنا نہیں نہ ماتھے پر بندیا لگائی، نہ مانگ میں سیندور بھرا، وہ عام لباس میں اپنے روزمرہ کے کام کرتی رہیں جیسے کوئی بھی غیر معمولی بات محبور میں نہیں آرہی تھی۔ راج منتری نے ان کے سامنے مہاراج کا حکم سنایا۔ آج پورنماشی کی رات ہے اور دستور کے مطابق دیوداسیاں راج محل میں داخل ہوں گی انہوں نے شکستلا اور دوشی کو حکم دیا کہ فوراً تیار جائیں اور شاہی جوڑے زیب تن کر لیں جنہیں راج منتری اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ میں نے جواب دیا۔ ”گوردھن کہہ رہا تھا“ گوردیو کی آگیا کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اور وہ ابھی تک کاشی کی یاترا سے نہیں لوٹے، مہاراج کو اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جب تک وہ واپس نہیں آ جاتے۔“

یہ جواب سن کر راج منتری باڈلے کتے کی طرح چلایا۔

”نہیں مہاراج کا حکم پورا ہو گا آج کی رات وہ شکستلا اور دوشی کے ساتھ گزارے۔“ پھر گوردھن سانس درست کرنے کے لئے رک گیا اس کی گھبراہٹ ہوئی آواز معلوم ہوتا تھا وہ کوئی بہت بڑا کشت کاٹ چکا ہے۔

”پھر کیا ہوا؟“

گوردھن کا تھکے کا اضطراب بڑھ گیا وہ چاہتا تھا اسے واقعہ کی تفصیل فوراً معلوم جائے گوردھن کہنے لگا۔

”مجھے خطرہ تھا۔ اگر میں نے حکم کی خلاف ورزی کی تو میرا ہر قلم کر دیا جائے گا۔“

”تو کیا تم راج منتری کا حکم ماننے پر تیار ہو گئے؟“ گوردھن کا تھکے کی آنکھوں سے برسنے لگے۔

”نہیں گھرو دیو! میں نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔“

”پھر کیا کیا تم نے؟“

”میں راج منتری کے قدموں میں لیٹ گیا۔ گورو دیو! میں نے عرض کی۔ اگر آشرم کے دستور کی خلاف ورزی کی گئی تو دھرم کا اسمان ہو گا بیجا مگر میں ایسا اندھا کبھی نہیں ہوا۔ کہ مہا پردہت کی آگیا کے بغیر کوئی دیوداسی راج رنواس میں داخل کر دی گئی ہو لیکن راج منتری ہر قیمت پر حکم کی تعمیل چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔

”مہاراج کا حکم نہیں ٹل سکتا۔ راج دربار کی طرف سے پڈت گوروکھ ناتھ کی جگہ گھردھن کو مہا پردہت مقرر کیا جاتا ہے۔“

یہ بات سن کر دوشی اور شکستہ دونوں غصہ سے کانپنے لگیں۔ دوشی تھر تھراتی آواز میں بولی۔ ”ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

”خاموش رہو لڑکی!“ راج منتری چلایا۔ ”تم نہیں جانتیں مہاراج کا فیصلہ اٹل ہے۔“

”فیصلے تبدیل بھی ہو جاتے ہیں منتری جی!“

”نہیں ہواؤں کا رخ بدل سکتا ہے مہاراج دیورائے کے فیصلے تبدیل نہیں ہو سکتے۔“

دوشی بڑے اطمینان کے ساتھ بولی۔ ”مگر پورنماشی کی اس رات انہیں اپنا فیصلہ بدلنا ہو گا۔“

”کیا مطلب؟“ راج منتری کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔

”مطلب یہی کہ میں راج رنواس میں داخل ہونے سے انکار کرتی ہوں۔“

”دوشی!“ راج منتری گرجتی ہوئی آواز سے سارا آشرم گونج اٹھا۔ اس نے غضب آلود نگاہوں سے دوشی کو دیکھا جیسے ابھی اس کی موت کا حکم صادر کر دیا جائے گا، لیکن نہ جانے دوشی کی آتما میں کہاں سے اتنی شکتی آگئی تھی وہ راج منتری کی آواز سے خوفزدہ نہیں تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

”جانتی ہو انکار کی سزا کیا ہو گی؟“

”تم مجھے موت سے زیادہ کبھی سزا نہیں جواب دیا۔“ مہاراج میرے جسم کی ہڈیاں ضرر ڈال سکتے۔“

”سکتے۔“ دوشی نے اطمینان کے ساتھ

”سکتے ہیں۔ لیکن میری آتما پر ہاتھ نہیں

یہ جواب راج منتری کو مستعمل کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس کے حکم پر دوشی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے مہاراج کا حکم ہی ماننے سے انکار نہیں کیا تھا ان کے رعبے کی توہین بھی کی تھی۔ راج منتری بھوکے بھیڑنے کی طرح آشرم میں غراتا رہا۔

”کیا کوئی دیوداسی اتنی گستاخ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ مہاراج دیورائے کے دیو اس میں داخل ہوئے سے انکار کر دے۔“

راج منتری بھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے مہاراج کی پارٹنر کی طرف سے خوف نہ ہوتا تو وہ دوشی کی آنکھیں نکلوا دیتے سے بھی گریز نہ کرتا لیکن وہ جانتا تھا۔ دوشی آشرم کی تمام دیوداسیوں سے زیادہ سندر اور چنچل ہے پھر راج شجیت میں بھی کوئی کنواری اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لئے تو مہاراج اپنے ہوش و ہواس کھو بیٹھے تھے۔ سپاہی جب دوشی کو گرفتار کر کے راج محل کی طرف لے چلے تو آشرم پر ایک قیامت بیت گئی۔ جانے سے پہلے دوشی نے کہا۔

”آج رات میں امرت پیون گی۔ کل میری چنا کو پھولوں سے سجانا۔“

یہ فہر ادا کرتے وقت گوردھن کی آنکھوں میں آنسو چرے لگے۔ پنڈت گورکھ ناتھ کا رنگ بھی زرد ہو گیا تھا اور اس کے بوڑھے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔

”کیا دوشی پھر واپس آئی؟“

”نہیں گورو دیو! اس نے پورنماشی کی رات موت کا امرت پی لیا تھا۔ دوسری سچ راج محل سے اس کی ارحمی اٹھائی گئی تھی۔ موت کا جوا کھیل کر اس نے مہاراج دیورائے کا فیصلہ تبدیل کر دیا تھا۔“

یہ سنتے ہی پنڈت گورکھ ناتھ زخمی پرندے کی طرح تڑپ اٹھا۔

”تو کیا دوشی مر گئی؟“

”وہ مہاراج پر ہیمنٹ ہوئی گورو دیو۔“

پرہت گوردھن یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ پنڈت گورکھ ناتھ کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے فانوس کی روشنی میں اس کا چہرہ ایک روحانی کرب کا منظر پیش کر رہا تھا اور اس کے بوڑھے بدن پر ایک ہلکی سی لرزش جاری ہو چکی تھی۔ گوردھن نے یہ حالت دیکھی تو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔

بے جا

”تم دوشی کی حفاظت نہ کر سکے گوردھن؟“

گورکھ ناتھ کی آواز بھرا گئی اور وہ منہ موڑ کر سامنے دشتو کی مورلی کو دیکھتے لگا پھر اس کی غمگین لڑائی میں اس کی ہنسی ہوئی آواز تیرنے لگی۔

”دوشی میری آتما تھی۔ میرے جیون کی آخری پوٹھی۔ جسے تم نے میرے بعد لٹا دیا۔“

”گورو دیوا! میں شرمندہ ہوں۔ میں دوشی کو نہ بچا۔ کا۔“

بوڑھا پردہ اتھکائی دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ چانگر میں دنیا لٹنے والی ہے تو میں راستے میں نہ ٹھہرتا۔ میرے علاوہ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کہ میری بیٹی تھی۔ میرے بچے کا گھرا جسے میں نے دنیا کی نگاہوں سے چھپا کر پردہ کش کیا

”گورو دیوا! گوردھن بھاگ کر بوڑھے گورکھ ناتھ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

”آپ نے دوشی کے متعلق پہلے تو کبھی نہیں بتایا تھا۔“

”کوئی باپ اپنے باپ کا اظہار نہیں کرتا گوردھن! میں نے یہ عہد اپنے اپنے سینے میں کرنے کی کوشش کی تھی۔“ بوڑھے پردہ کش کی آواز جیسے طلق میں اٹکتے لگی۔

”میری اور دوشی کی ماں شیل کی کہانی بہت لمبی اور دکھ بھری ہے جب وہ مرنے لگی تو نے اُسے قول دیا تھا۔ دوشی کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ اسے اپنے ہاتھ سے بنائوں گا۔ لیکن۔۔۔۔۔“

گورکھ ناتھ کی آواز ڈوب گئی۔ اچانک وہ نہایت تیزی کے ساتھ پلٹا اور کہنے لگا۔

”گوردھن! مہاراج دیورائے کو دوشی کی موت کا غمناک ہنگامہ پڑے گا۔ میری آتما کو بچا کر کے وہ راج کل میں آرام کی خیمہ نہیں سو سکتا۔

پھر اس نے گوردھن کو شانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں آنسو پھینک دیں۔ ”یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔“

”آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں گورو دیوا!“

گوردھن نے دیکھا گورکھ ناتھ کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے تھے اور اب ان کی ایک ایسی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ جو کسی جتے کی آنکھ میں شکار دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ اس

چہرے کا کرب ایک خوفناک عزم و ارادہ میں تبدیل ہو چکا تھا اور وہ تصویر کی آنکھ سے

بچا مگر کے راج کل کو شطلوں کی غرور ہوتے دیکھ رہا تھا۔

”میری بیٹی نے موت کا امرت پیا ہے گود من! اب یہی عیال مہاراج دیورائے اور
اس کی بیٹی چھوڑ کھلا کو چٹا پڑے گا۔“

گودکھ تاتھ کے لہجے میں جیسے شطلے لپک رہے تھے اس نے ایک لمحہ ڈک کر کہا۔

”میں مدگل میں اس کی موت کا سامان تیار کر آیا ہوں۔“

”سیوک آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا مہاراج؟“

”ایک سال تک میں نے نکبت ستار کی بیٹی پر قتال کو عنایت دیا سکھائی ہے اس کی
آواز میں جلد ہے اور حسن میں بلا کی کشش میں چاہتا ہوں۔ بچا مگر میں پر قتال کی سزا
اور مدھرتیوں کا چرچا پھیل جائے۔“

”مگر پر قتال کے چرچے سے دوشی کے انتقام کی عیاس کیوں کر بچھ سکے گی؟“

”پر قتال کا حسن دیورائے کی موت کا پیغام بن سکتا ہے وہ اس کالم سے میری بیٹی
کے خون کا انتقام لے سکتی ہے۔“

”تو یہ کون سی بڑی بات ہے پر قتال کے حسن کا چرچا آج ہی سے شروع ہو جائے
گا۔“ گود من نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر پڑت گودکھ تاتھ کے ساتھ آشرم کے ایک
اندھیرے کمرے کی طرف چلے گئے۔ جہاں چوت کے ساتھ کافی کی گنتیاں لگ رہی تھیں۔

پر قتال..... ایک کہانی

بچا مگر کے آشرم ہی میں نہیں بازاروں اور گلیوں میں بھی لوگ پر قتال کے حسن
جمال کی داستانیں بیان کرنے لگے تھے، ہر شخص کی زبان پر اس کے آن دیکھے حسن
کہانی۔ ہر لب پر ان سے گیتوں کی تعریف تھی۔

دیورایاں آشرم میں آنے والی ہر لڑکی اور ہر عورت کے ساتھ پر قتال کے قصے
چلتے۔ داستان گو بہت اور پردہت بڑے دلکش عیال میں اسی کے سحر انگیز شمعوں،
بھری آواز اور آکاش کی البسراؤں کو شرما دینے والے سندھ روپ کا ذکر چھیڑتے، سننے والے
دل تمام کر رہ جاتے اور ان کے دل میں یہ آرزو کروٹیں لینے لگتی۔ کاش! وہ ایک نظر حسن
اس دیوی۔ گیتوں کی رانی کو دیکھ ہی سکتے مگر پر قتال کرنا تک سے دور دکن کے دس

رہتی تھی۔ ایک دوسری فلمرو میں جہاں مہاراج دیورائے نہیں بلکہ فیروز شاہ بھٹنی حکمران تھا۔
گھوڑمن نے پرتھال کی تعریف میں ایک کویتا بھی لکھی تھی جو جنگل کی آگ کی مانند
بیجاگر میں پھیلنے لگی۔ لوگ اس کویتا کو سنتے اور دل تمام کر رہ جاتے۔

حسن و جمال کے پرستار اور سنگیت کے شہساز پڈت گوروکھ ناتھ کے دروازے پر
آنے لگے۔ وہ بوڑھے پردہت کی زبان سے پرتھال کے نغمہ نواز حسن کی داستان سننے کے
لئے بے تابانی کا اظہار کر رہے تھے، وہ اس کی راگ و دیا کا گرد تھا اور اس نے طلوع و غروب
کے رنگین سوں میں اسے سرنگیت سے بہرہ ور کیا تھا۔ چاندنی راتوں اور برسات کی
جھڑیوں میں اسے دل میں آ کر جانے والی راگیاں سکھائی تھیں جب وہ اپنے گورو دیو کے
چرن چھوتی اور ستارے کی ٹیٹھتی تو کائنات کی نبضیں رک جاتی تھیں۔ پردے اپنی اڑائیں
بھول جاتے تھے بہتی ہوئی عیاں خود بخود سنگٹانے لگتی تھیں اور فضا میں سحر آلود گیت بکھر
جاتے تھے۔

حسن خود ایک جادو ہے لیکن جب وہ سنگیت کے روپ میں دھل جائے تو قیامت
سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ بیجاگر کے لوگوں کے لئے پرتھال بھی ایک قیامت بن چکی تھی۔
ایک ان دیکھی ان جانی قیامت، گیت کی وہ نے جو عالم خواب میں ایک سند روپ دھار کر
ذہن کے غروں اور دل کے دالانوں میں گھومتی ہے جادو کی وہ پراسرار دیوی جو پلک جھپکنے
میں عدم سے وجود میں آتی اور ہوش و حواس لوٹ کر خوابی دھندلوں میں غائب ہو جاتی ہے
لوگ اسے سنوں میں دیکھتے اور اپنے سینے دوسروں کو سناتے۔

پرتھال کا وجود کن میں تھا لیکن اس کی روح بیجاگر کے شہستانوں میں بھٹک رہی تھی۔
ایک دن یہ روح دبے پاؤں راجہ دیورائے کے راج محل میں داخل ہوئی اور اس کی غنیمت
لوٹ کر چلتی بنی۔ پڈت گوروکھ ناتھ کا جادو چل گیا۔

دیورائے اپنی نئی محبوبہ کے کمرہ میں تھا جب اس نے پائیں باغ میں ستار پر ایک
روح نواز گیت سنا وہ تڑپ کر مسمری سے اٹھا اور پلک کر در تپے میں آیا۔ چاندنی راتوں میں
چند دھاری جینیلی کے باغ میں ستار پر گا رہی تھی۔ دیورائے نے ایسا دھرم گیت پہلے کبھی نہیں
سنا تھا اس نے حکم دیا۔ چندا کو اس کے حضور میں پیش کیا جائے۔ اور دوسرے ہی لمحے ستار
نواز مغنیہ اس کے روبرو کھڑی تھی اس نے بتایا۔

”یہ گیت پر تھاں کا ہے مہاراج! اس کی دھن بھی اسی نے بنائی ہے۔“

”پر تھاں کون ہے؟“ دیورائے نے سوال کیا۔

”عجب سے دیوراسی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے حیرت پاش نگاہوں سے دیورائے

کو دیکھا اور بولی۔

”کیا آپ پر تھاں کو نہیں جانتے؟“

”نہیں تو۔۔۔ کون ہے وہ؟“

”اس کے حسن و جمال کا چرچا تو سارے وجیا نگر میں ہے لوگ اس کا نام جتے ہیں

اور اس کے گیت گاتے ہیں۔ تعجب ہے آپ مہاراج ہو کر اسے نہیں جانتے۔“

”ہم نے پر تھاں کا نام پہلی مرتبہ تمہاری زبان سے سنا ہے۔ چھ! ہمیں بتاؤ تم اس

کے متعلق اور کیا جانتی ہو۔ وہ کون ہے کس کی بیٹی ہے۔ کہاں رہتی ہے؟“

”گلاب کا پھول ویرانے ہی میں کیوں نہ کھلے اس کی مہک۔۔۔ اس کی رحمت دل و

نگاہ کو پوانہ کر دیتی ہے کہتے ہیں پر تھاں ایک ستار کی لڑکی ہے لیکن ایسی سندور کہ دیویاں بھی

اس سے روپ کی جھلک مانگنے جاتی ہیں۔“

ایک لمحہ رک کر چندا پھر کہنے لگی۔

”وہ دریائے جگ بھدرا کے اس پار وکن کے علاقہ میں رہتی ہے اس کا روپ ستاروں

کو شرماتا ہے اور اس کی جادو بھری آواز پر جنگل کے وحشی جانور بھی جھومنے لگتے ہیں۔“

دیورائے کے صبر کا پیمانہ لہریز ہو چکا تھا اس نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”تم نے پر تھاں کو کہاں دیکھا تھا؟“

”دیکھا نہیں مہاراج صرف اس کا ذکر سنا ہے، بجا نگر میں پر تھاں کے گمن گانے

والے سینکڑوں آدمی ہیں لیکن پنڈت گورکھ ناتھ کے سوا کسی نے اسے نہیں دیکھا، سنا ہے کہ

وہ مسلمان عورتوں کی طرح اکٹھر پردے میں رہتی ہے۔“

پنڈت گورکھ ناتھ نے اسے دیکھا ہے؟“ دیورائے کے گھج میں ایک اُمید کی لرزش

تھگی۔

”دیکھا ہی نہیں۔ انہوں نے پر تھاں کو راگ و دیا سکھا دیا ہے کاشی کی پاترا کے بعد وہ

ایک سال تک اسی کے گھر مہمان رہے ہیں۔“

”بہت خوب.....“ دیورائے درپچے سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب سبھی گورکھ ناتھ پچاکر بھول کر دکن میں کیوں ٹھہر گیا تھا۔ اس نے ایک سال تک ہماری حاضری کیوں نہیں دی۔“ پھر وہ دیوراسی سے مخاطب ہوا۔ ”اب ہم پر حال کی کہانی پڑت گورکھ ناتھ ہی کی زبان سے سننا پسند کریں گے۔ چندا راج ستری سے کہو وہ پرویت پندت کو عزت کے ساتھ ہمارے حضور لائے۔ راج رتو اس میں ان کا عہدہ بحال کر دیا گیا ہے۔“

یہ کہہ کر دیورائے اپنے خیالوں میں پر حال کی تصویر لے ہوئے کمرے کے اندر چلا گیا اور چندا در پیچے کے پاس کھڑی اسے کمرے میں ہوئے ہوئے شیشے دکھائی دی۔ اس کے لبوں پر ایک مٹی خیز مسکراہٹ تھی۔

دیورائے کے ذہن میں پر حال کا لفظ خوبصورت سوالیہ نشان بن چکا تھا۔

پریم کا سندھ سن

ایک سال بعد

..... ٹھیک ایک سال بعد پندت گورکھ ناتھ راج رتو اس میں کھڑا تھا اور دیورائے پہلے کی طرح پھر اس کے چہرے کی کوشش کر رہا تھا مگر بجلی ایسی تیزی کے ساتھ گورکھ ناتھ نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹائے اور بولا۔

”پندتوں کے چہرے اب اس قابل نہیں رہے کہ ہمارا راج دیورائے انہیں چھو سکیں۔“

دیورائے یہ فقرہ سن کر چونک اٹھا اس نے گورکھ ناتھ کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر خستہ اور دکھ کے طے جلے آثار تھے جیسے دن اور رات نکلے ل رہے ہوں۔ اس کی نگاہوں کی بے رخی بتا رہی تھی کہ وہ حکم سے مجبور ہو کر آیا ہے ورنہ اسے راج محل اور رتو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ہے اس کی گفتگو کا انداز بھی بدل چکا ہے اور آنکھوں میں رجم و شہقت کی بجائے غمی کے کوہرے لپک رہے ہیں۔“

دیورائے نے بھانپ لیا موڑ خانہ میں بہت زیادہ تبدیل ہو چکا ہے اور زمانے کے گرم دھڑکنے سے ایک تجربہ کار شخص اور آہن حراج انسان بنا دیا ہے۔

اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کہیں بڑھے کو مذہبی کی سوت کا صدمہ تو نہیں کیونکہ وہ ایک عوامی شخصیت ہے۔ اسے سب سے زیادہ یاد آ کر نا تھا۔

”گورکھ ناتھ! کاش کی یا ترا کے بعد تم ہمیں ملے بھی نہیں آئے؟“

”جب گورکھ ناتھ مہاراج کے ذہن سے اتر چکا تھا تو پھر اس کے نہ ملنے کا غم اس کیسے؟“ جواب ترکی بہ ترکی تھا۔ دیورائے سخت پریشان ہو گیا اگر کوئی دوسرا شخص اس کے سامنے ایسا روکھا پھیکا طرز بیان اختیار کرتا تو شاید اسے معاف نہ کیا جاتا لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ گورکھ ناتھ کی ہر بات برداشت کر لی جائے۔

دیورائے نے کہا۔

”تم غلط سمجھ ہو گوردیو! ہم تمہیں بھول کر بھی نہیں بھول سکتے اور تم نے ایک سال میں ہمیں بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔“

”اگر مہاراج کو میرا اتنا ہی خیال تھا تو دوشی کے لبو میں ہاتھ بھرنے سے پہلے میرا انتظار کیا ہوتا۔“

”دوشی۔“ دیورائے کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی جیسے وہ اس واقعہ کو دس کرناں جانا چاہتا ہو۔ ”اس لڑکی نے ہماری توہین کی تھی۔ راجہ اور میرے درمیان تمام فاصلے ختم کر دیے تھے۔ آشرم کی دیواروں کو دھتکا گستاخ نہیں ہوتا چاہیے۔“

”دوشی آشرم میں ضرور رہتی تھی مگر دیورائے نہیں تھی مہاراج۔“

”تو پھر وہ کون تھی جس نے اپنے مہاراج کا اسمان کیا؟“ دیورائے کے لہجے میں ذرا غصے کی جھلک تھی۔

گرو ناتھ نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر گونجتی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

”اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ دوشی کون تھی تو سنیے! وہ چڑت گورکھ ناتھ کی بیٹی تھی۔ مہاراج دیورائے کے گرد کی آتما۔ اس کی بیٹوں میں میرا خون دوڑ رہا تھا وہ میرے گمان و دنیا کے سارے میں مل کر جوان ہوئی تھی وہ اپنے مہاراج کے درمیان ہر فاصلے کو بنو بی گھنٹی تھی مگر گورکھ ناتھ کی بیٹی جان دینا جانتی تھی۔ ہوس کا شکار نہیں ہو سکتی تھی آپ کی اندھی خواہش اپنے گرد کے لبو کو بھی شناخت نہ کر سکی۔ راجہ گل کی دیواروں نے دوشی کی آخری ہچکی ضرور سنی ہوگی پورنماشی کی رات ان دیواروں کا کلیجہ شش کیوں نہ ہو گیا۔ راجہ محل پر بجلی کیوں نہ ٹوٹ پڑی؟“

”گھر کھاتھ۔۔۔“ دیورائے کے جسم پر ایک خفیف سا لرزہ طاری ہو چکا تھا۔ بوڑھے کی گرجتی ہوئی آواز زہر میں ڈوبے ہوئے تیروں کی طرح اس کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔

”کیا دوشی کے حلق مہاراج کچھ اور سنا پسند کریں گے؟“ بوڑھے نے آخری نخر یا دو غصے کی شدت سے خود بھی کانپ رہا تھا۔

”ہمیں بٹا کر دیکھ کھاتھ۔ ہم سے بھول ہوئی۔“ دیورائے بوڑھے پر دہشت کے پیچھے آڑک گیا۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”اگر ہمیں معلوم ہوتا دوشی تمہاری بیٹی ہے تو ہم وہ ہاتھ کاٹ دیتے جو سب سے پہلے کی طرف اٹھا تھا وہ راج محل میں ضرور لائی گئی لیکن ہمارے سامنے آنے سے پہلے وہ رپٹی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی آن پر جان دے دی تھی۔ ہم نے اس کی اڑھی کو خود کاٹ دیا تھا اس کے سوا ہم اور کچھ نہ کر سکے۔ ہماری طرف دیکھو گھر کھاتھ! ہم تمہارے گنہگار۔ تم چاہو تو ہم سے ہماری غلطی کی قیمت وصول کر سکتے ہو۔“

”سودا ہمیشہ جان لینے سے پہلے چکایا جاتا ہے جان لینے کے بعد نہیں۔ اب مجھے اس قیمت وصول کرنے کا کوئی اور حکم نہیں۔“

”تو کیا تم اپنے مہاراج کو بچا نہیں کر سکتے؟“

دیورائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا بوڑھے پر دہشت کے ساتھ آگیا اور کہنے لگا۔

”اپنے ماتھے کے بل کھول دو گھر کھاتھ! ورنہ ہماری آخری ترجیحی رہے گی۔ دوشی کی قیمت سنا کر تم نے ہمیں نرگ میں پھینک دیا ہے۔ اس کے لئے ہم بلیڈان دیتے گے لئے رہیں۔“

”آپ کا بلیڈان دوشی کا جیون نہیں لوٹا سکتا۔“

”تو پھر تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں۔ ہم نے راج رتوں میں تمہارا عہدہ بحال کر دیا ہے اور صرف عہدہ ہی بحال نہیں کیا۔ ترقی بھی دی ہے۔ آج سے تم بھانگر کے راج مگھو ہو راج محل کے ساتھ راج و دیار میں بھی تمہاری بچے ہوگی۔ بلو اپنی بٹا ہوگی کی قیمت تم اور کیا بچے ہو؟“

”شکریہ مہاراج! مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

"تو پھر پریشانی کس بات کی ہے آپ بیان کیجئے۔ میرے بس میں ہوا تو بیجا مگر کی خاطر نہیں ہی آسمان سے ستارے بھی توڑ لاؤں گا۔"

"مگر کھنا تھیں۔۔۔"

"مذکور کے ساتھ۔۔۔"

بکثرت دیورائے کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بزمین کے کندھوں پر ماتھہ رکھ دئے اور کہنے لگا۔

”وکن کے آکاش پر میں نے ایک حسین ستارہ چمکتے ہوئے دیکھا ہے اگر تم اسے
 بیجا مگر کے راج محل کی زینت بنا دو تو ”رائے رامیاں“ کی تاریخ ہمیشہ تم پر فخر کرے گی۔“

"حسین ستارہ؟" بڑھے پرویت کے ہونٹ تھر تھرائے اور اس نے معنی خیز نظروں سے دلورائے کی طرف دیکھا جیسے اس کا مطلب سمجھ جانے کے باوجود انجان بن رہا ہو۔

”آپ نے دکن کے آکاش پر کون سا حسین ستارہ دیکھ لیا ہے؟“

"پریشان۔"

دہورائے کے دل کا بوجھ زبان پر آگیا اور پرتھال کا نام سننے ہی گورکھ ناتھ یوں
چوٹک اٹھا جیسے کوئی غیر متوقع حادثہ ظہور میں آگیا ہو حالانکہ وہ دہورائے کی زبان سے یہی
نام سننے کا متظر تھا۔

”پر حال....“ گرونا تھ نے زیر لب دہرایا۔

”ہم نے سنا ہے وہ ستاروں سے زیادہ روشن اور بیماروں سے بڑھ کر جڑان ہے تم
 اس کے سنگیت گرو ہو۔ اُسے ہمارا سنبولیں پہنچاؤ کہ بیجا نگر کے راج محل کے دروازے اس
 کی راہ دکھ رہے ہیں۔“

بوز جا خلاف توقع خاموش ہو گیا اور دیو رائے کی منطرب نگاہیں اس کے ہونٹوں کے
آہیں پاس ایک دھول کی طرح جم کے رہ گئیں جب آہیں نے کوئی جواب نہ دیا تو دیو رائے
بولے -

"کس سوچ نہیں خوب مجھے ہو راج گورو! ابھی ابھی تم نے بھی ان کاٹش سے ستارے توڑنے کا قول دیا تھا۔"

"میں اپنا قول نہیں بھولا لیکن سوچتا ہوں اگر یرتجبال بچا مگر آئے پر رضا مند نہ ہوئی تو

پھر کہا ہوگا؟

”پھر وہ کرناٹک کے سوراؤں کی خارا شکاف کمراؤں کو بے نیام دیکھے گی۔“
دیورائے سینڈتان کر کہنے لگا۔ ”ہم جس چیز کو حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اُسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتے ہیں۔“

”مگر یہ بھی سوچ لیتا چاہیے اس صورت میں ہمیں فیروز شاہ کی طاقت سے الجھنا پڑے گا۔ کیا یہ خطرہ مول لیتا مناسب ہوگا؟“
”ہم تو اس خطرے کا مدت سے انتظار کر رہے ہیں اگر فیروز شاہ نے الجھنے کی کوشش کی تو ہم کمراؤں سے اس کا سواگت کریں گے۔“
”تو پھر پرتھالی کو ہر حال میں بچا کر آنا پڑے گا۔ اپنے پاؤں سے چل کر یا پیڑیاں پہن کر۔“

”لیکن ہم حسن کو پیڑیاں پہناتا نہیں چاہتے تم کل ہی مدگل روانہ ہو جاؤ اور پرتھالی کو راضی کر لو۔ ہم اسے وجہاً گری ڈالی ہائیں گے۔“

یہ کہہ کر دیورائے اس کے ہندو روپ کے تصور میں کھو گیا۔ گورکھ ناتھ نے معنی خیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور اُسے ہلاراج کی آنکھوں میں موت کے سائے رقص کرتے ہوئے نظر آئے۔ اُس نے خود ہی تو دیورائے کے سینے میں پرتھالی کے شوق ویدار کی آگ روشن کرانی تھی۔ اب اس کے ارد گرد انجانی محبت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے شوق کی بجلیاں لپک رہی تھیں جنہوں نے ہوش و حواس کا خروں پھونک ڈالا تھا اور بوڑھا پردہ ہٹ اپنی بیٹی کے قاتل کو اپنی تدبیر کے شکار میں جکڑا ہوا دیکھ کر دل ہی ذل میں ایک سکون، ایک قرار، ایک اطمینان محسوس کر رہا تھا وہ جانتا تھا۔ راج گورو کا عہدہ دراصل دوشی کے بے گناہ خون کی قیمت ہے لیکن دیورائے نے یہ قیمت ادا کر کے دراصل موت کو اپنے قریب کر لیا تھا گورو ناتھ کے سینے میں دوشی کے انتقام کا جذبہ کالے ناگ کی طرح زینگتا پھر رہا تھا۔

کیا اس لالچ سے گورکھ ناتھ کا انتقام ٹل جائے گا؟
کیا وہ قیامت کی گھڑی جو دیورائے کی قسمت میں لکھی جا چکی ہے ڈک جائے گی؟
شاید نہیں۔

بوڑھے برہمن کی دور اندیش نگاہیں دیورائے کے چہرے پر کئی جال بن چکی تھیں،

جانے وہ کن خیالوں میں ڈوب گیا تھا مگر پرتھال کے سوا وہ کسی اور شے کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا وہ تو چاہتا تھا۔ صبح کا اجالا نمودار ہونے سے پہلے روپ کا چاند اس کے محل میں جلوہ گر ہو جائے اور وہ راج رنواس کے ستاروں کے جھرمٹ میں اس کا استقبال کرے، مگر کچھ بھی سہی اب اس کی تقدیر کا فیصلہ گورکھ ناتھ کے ہاتھ میں تھا۔

دیورائے ہوئے ہوئے چلتا ہوا صندل کے ایک سرخ صندوقچے کے قریب آ کر رک گیا جس پر نقش و نگار بٹے ہوئے تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے صندوقچہ کھولا اور اس کے ہاتھ میں ایک طلائی گلوبند جھلملانے لگا، جو ہیرے جواہرات سے مرصع تھا اس نے گلوبند راج گورد کی طرف بڑھا دیا۔

”پرتھال کے لئے ہمارا پہلا تحفہ۔“

پھر اس نے ایک قیمتی انگلیشی نکالی اور وہ بھی پروہت کے خوالے کر دی۔

”اگر وہ ہمارا صندوق قبول کرے تو یہ انگلیشی اُسے ہماری طرف سے پہناتا۔“

”میں کل سویرے ہی روانہ ہو جاؤں گا۔“

”راج گورد کو ہماری خاص سواری لے جانے کی اجازت ہے، اگل محل کے دروازے

پر یہ سواری تیار ملے گی۔“

”شکریہ!“ گورکھ ناتھ نے دیورائے کو بھرپور نظروں سے توڑا پھر اس کے قدم آہستہ

آہستہ دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔

دیورائے کی نگاہیں ابھی تک بوڑھے برہمن کے تعاقب میں تھیں جو کمرۂ خاص سے

نکل کر ایک طویل شفاف راہداری عبور کر رہا تھا اور دروازے کی پرلی طرف اُسے محافظ

مہیشے دانوں کے نیزوں کی انتہاں چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں گورکھ ناتھ ان چمکتی ہوئی انتہوں

کی سیدھ میں رواں تھا۔ اس کے بوڑھے قدم یوں اٹھ رہے تھے جیسے وہ کوار کی دھار پر

پہلے رہا ہو دیورائے دوسرے سے نیک لگائے اُسے دور اور۔۔۔ دور ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اب تک وہ ایک بار بار ایک ہی آواز سن کر چونک اٹھا۔۔۔

”مہاراج کی بے ہو۔“

دیورائے کو یوں لگا جیسے عقیقی دروازے سے اُسے موت نے آ پکارا ہو اور اصل یہ اس

موت کی آواز تھی جس کا ہجرہ پائیں باغ کی بالکونی میں لٹک رہا تھا اور جو سارا دن۔۔۔

"مہاراج کی جے ہو۔" کا سبق رٹا رہتا تھا۔

"مہاراج کی جے ہو۔"

طوطا پھر چلایا اور دیوارے زیر لب مسکراتا ہوا اس کی طرف چل دیا ایسے موقع پر جے پکارتا ایک نیک شگون تھا وہ سوچنے لگا۔ اگر پر تھاں آئی تو وہ یہ طوطا بھی اس کی نذر کر دے گا جو اس کا دل بہلاتا رہے گا۔

اُداسی کے لمحے

جب سے شہزادہ حسن نے فیروز آباد کی طرف کوچ کیا تھا۔ پر تھاں کی بے قراریاں بڑھ گئی تھیں وہ اکثر اداس اور غمگین رہنے لگی۔ سوتے جاگتے ایک عجیب سا احساس اس کی وجود پر چھایا رہتا وہ بار بار جنگلی ہرنی کی طرح چونک چونک کر اٹھتی جیسے کوئی بھیانک پہنا دیکھ کر ڈر گئی ہو۔ پہلے کی مانند اب اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹیں نہیں نکھرتی تھیں، نہ ستار کے تاروں پر بہار کے گیت رقص کرتے تھے اب وہ بھی بھی اور چپ چپ سی رہنے لگی تھی جیسے کوئی چیز کھو بیٹھی ہو جیسے اپنے آپ کو کسی آن دیکھے ہجرے میں بھول آئی ہو۔ گھر والوں نے اس کے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی محسوس کی۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے جوان بیٹی کے گھائی ہونٹوں کی مسکراہٹیں کون چھین کر لے گیا ہے۔ روز جاکھٹ سوچنے لگا شاید مگور دیو کی جدائی اس کی پریشانی کا باعث بن گئی ہے جب سے وہ لیا تھا۔ پر تھاں ابھی ابھی کی باتیں کرنے لگی تھی لیکن وہ یہ سمجھ کر خاموش رہا کہ وقت کے ساتھ ساتھ پنڈت گورنک ناتھ کی یاد خود خود اس کے ذہن سے محو ہو جائے گی مگر بوزے سنار کو کیا خبر تھی پر تھاں کے دل میں حسین یادوں کی جو شمع روشن ہو چکی ہے اسے زمانے کی آندھیاں بھی نہیں بجھا سکتیں۔

پر تھاں کی زندگی ایک خواب میں داخل گئی تھی وہ اب بھی ندی کنارے جاتی اور درختوں کے جھنڈ میں بیٹھی پہرے خیلوں میں نکھڑتی رہتی۔ پہلے جب سانپ کی مانند بچ مل کھاتی ہوئی ندی بھوری چٹانوں کے درمیان آکر بدھم بدھم سا ترنم پیدا کرتی تھی تو پر تھاں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کائنات کی دیوی زندگی کے ستار پر کوئی بد بھرا راگ چھیڑ رہی ہو، اس کی موسیقی کی لے پر اس کے ہونٹ آپ سے آپ بہار آفریں گیت بکھیرنے لگتے تھے اس کی جادوگری آواز جنگل کی فضا میں رں محو لئے لگتی تھی لیکن اب وہی موسیقی ایک طوطا

سکی میں تبدیل ہو گئی تھی اور بھورے پتھروں سے ٹکرائی ہوئی لہریں الٹا کر آگ لگتی تھیں۔
محسوس ہوتی تھیں شاخوں کے جھرمٹ میں کوئل کی کوک سنائی دیتی تو پرتقال کو یوں لگتا جیسے
اس کے دل کی دھڑکن آواز میں دخل کر اس کی بے تابی کا اظہار کر رہی ہے۔

احساس کی یہ تبدیلی اچانک ہی ظہور میں آئی تھی کیونکہ گزشتہ چار روز کے اندر جو
واقعات پیش آئے تھے۔ وہ بالکل غیر متوقع اور انہونے سے معلوم ہوتے تھے، کبھی کبھی تو
اُسے ان واقعات پر ایک حسین پسینے کا گمان گزرنے لگتا تھا۔ بھلا دکن کے شہزادے کا ایک
غریب سار کی لڑکی سے محبت کے عہد و بیان کرنا اور اسے شاہی محلات میں پُر تکلف زندگی
گزارنے کی دعوت دینا ایک حسین پسینا نہیں تو اور کیا تھا؟

اگرچہ جانتے جانتے حسن یہ وعدہ کر گیا تھا کہ وہ بہت جلد لوٹ آئے گا اور پھر وہ
سلطان معظم کی اجازت سے اسے اپنے ساتھ فیروز آباد لے جائے گا مگر روتی بیک کی زبانی
اُسے اُن مشکلات و مصائب کا اندازہ بھی ہو چکا تھا جو اُس محبت کے نتیجے میں پیش آسکتی
تھیں۔ اول تو یہی بات ناممکن نظر آتی تھی۔ سلطان ایک غریب لڑکی کو حرم سرا میں داخلے کی
اجازت دے دیں گے۔ دوسرے ذلی عہد کی حیثیت میں شہزادے کے لئے ضروری تھا کہ وہ
شاہی خاندان یا کسی بڑے خانوادہ کی حسینہ کو رفیقہ حیات بنائے کیونکہ مستقیم میں اس
لڑکی کو دکن کی ملکہ بننا تھا۔ حسن بے شک سلطنت ہنسی کا چشم و چراغ تھا۔ بہادری اور
جنگجویی میں اُس نے بڑا نام پیدا کیا تھا اور سلطان کے بعد اس کے حدود و اختیارات بھی
بے کناہ تھے اس کے باوجود آئین سلطنت کی رو سے شاید اُسے اپنی زندگی کے حعلق اتنا بڑا
فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ بجز اس کے کہ اُسے محبت کی دیوانگی ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کر
دے، جسے قانون کی اصطلاح میں ”بغادت“ کہا جاتا ہے مگر دکن کا ولی عہد ایک غریب و
نیکی لڑکی کی خاطر ایسا بڑا خطرہ مول لینے پر تیار ہو جائے گا؟

پرتقال جب اس قسم کی باتیں سوچتی اُس کا دماغ ستارے کے کسے ہوئے تاروں کی
طرح جھنجھٹا اٹھتا ایک عالی مقام شہزادے کے سامنے بھلا اُس کی حیثیت ہی کیا تھی وہ ایک
ایسے بھول کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی جو سارے چین کی زینت تھا۔ اُس بھول پر پورے
دکن کی نظریں لگی ہوئی تھیں، ہزاروں رنگین دامن اس کے لئے چل رہے ہوں گے، پھر یہ
کس طرح ممکن تھا وہ گلن بہار اپنی شاخ سے ٹوٹ کر ایک غریب لڑکی کی جھولی میں آ

گرے، کاش وہ غریب نہ ہوتی۔ اس نے کنگے سارے گھر جنم نہ لیا ہوتا یا اس کا محبوب شہزادہ کی بجائے گاؤں کا الہیلا چمدا ہوتا جو عدی کنارے بیٹھا ہنسریا کی تائیں اڑاتا اور وہ ان کی سریلی لے پر مدھ بھرے گیت الاپتی ہوئی اس کے آس پاس رقص کرتی۔ اگر یوں ہوتا تو زندگی کتنی سندر ہو جاتی لیکن مصیبت تو یہی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک وارث تخت سے لگرائی تھیں جس کی زندگی عام لوگوں سے بڑی مختلف اور انوکھی تھی حتیٰ کہ اس کی ملاقات کے لئے بھی کتنے حاجیوں اور دربانوں کے پہروں میں سے گزرتا پڑتا تھا اپنی محبوبہ کے انتخاب کے لئے سلطان کے مشورے کی ضرورت تھی، اگر سلطان نے اس کی درخواست مسترد کر دی اور اس کی زندگی کی ذور حرم سرا کی کسی شہزادی کے ساتھ باندھ دی۔۔۔ تو کیا ہوگا؟ کیا ہوگا اور پریم کی عیا کس رخ سبے گی؟ حالانکہ یہ ذور تو باندھی بھی جا چکی تھی۔ یہ احساس واقعی بڑا تکلیف دہ اور جاں گسل تھا۔ پرتھال کے حسین بہنرے خواہ بکھرے نکلے اور خیالات کی تازک کڑیاں کا کچ کی چوڑیوں کی طرح ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں وہ سچی کہیں اس کی زندگی جھیل کی کالی کی مانند کسی طوفان کی نذر نہ ہو جائے شہزادوں اور راجکماروں سے محبت کا خیال یقیناً بڑا خوش آئند اور حیات افروز ہوتا ہے لیکن حسین خواہوں کی تعبیر اکثر بھانک ہوتی ہے اتنی بھانک کہ انسانی آنکھ اُسے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتی۔

سادا سارا دن وہ اسی سوچ بچار میں گزار دیتی۔ تنہائی اگرچہ پہلے بھی اسے بڑی عزیز تھی اور اس کا اکثر وقت گانے کا ریاض کرنے، گیت لایا پنے اور تہا بیٹھ کر انہوں نے خیالات کا تانا بانا بننے میں گزر جاتا تھا لیکن کبھی کبھار وہ گاؤں کے کھیا کی لڑکی گوزی کے ساتھ جھیل لیتی تھی ورنہ گھر میں بڑی رہتی یا فرصت کے وقت مڈی کنارے جا نکلتی۔ لیکن اس تنہائی کی نوعیت ہی مختلف تھی پہلے اسے اپنے سینوں کے راجہ کا انتظار تھا وہ تہوہر لگا ہوں سے نیلے پرتوں کے اس پار ایک خیالی اور مثالی محبوب کی راہ دیکھا کرتی تھی اب جب کہ اس کا پریمی کچ مر پر سونے کا کٹ پہنے اور کٹنی لگائے اس کی زندگی میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ حیرت و استعجاب کی موجوں میں بچکولے کھا رہی تھی اور سوچنے لگی کہیں یہ سب کچھ ایک سندر سہنا تو نہیں؟

رائے نندکار کا پیغام

ہولے ہولے پراسرار خاموشی اور تہائی بوڑھے باپ کے لئے ایک نئی پریشانی بن گئی۔ اُسے بیٹی کے بیاہ کی فکر تو بہت دیر سے تھی مگر جب پر تھال ہی کسی جگہ شادی کے لئے رضامند نہیں تھی۔ بوڑھا کر بھی کیا سکتا تھا اور اب تو اسے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ بیٹی کی جہانی سنے دیکھتے ہی نہ بیت جائے، جب سے اس نے دکن کے دلی عہد شہزادہ حسن کے لئے انگوٹھی بنا کر انعام حاصل کیا تھا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی لیکن سنا کر کاری گری کی بجائے اُس کی جوانی اور سند لڑکی کا چرچا عام تھا لوگ یہ سن کر حیران رہ جاتے کہ وہ بڑے بڑے زمینداروں اور ساہوکاروں کے پیغام ٹھکرا چکی ہے اُس کے خُسن کی شہرت سن کر مدگل کے رائے نندکار نے بھی سدلے بھیج دیا جو ایک چوہان جاگیردار اور بھٹی دربار سے خطاب یافتہ تھا اس کی حویلی پر ہاتھی جھولتے تھے، اُس نے وعدہ کیا تھا اگر اُس کا پیغام منظور کر لیا گیا تو نکہت کو ایک ہاتھی پیش کرے گا۔ اب بوڑھے سنا کر یہ شوق چرایا کہ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر فیروز آباد جائے اور شہزادہ حسن کی حاضری دے اُسے بتائے ”مہاراج! جب سے آپ نے اس غریب کو عزت بخشی ہے میرے بھاگ جاگ اٹھے ہیں، میری بیٹی چوہان گھرانے کی زینت بنی ہے اب میں معمولی آدمی نہیں آپ کی دیا سے بھگوان نے مجھ پر بڑا کرم کیا ہے۔“

رائے نندکار کا پیغام سن کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا اس کی بیٹی کتنی بھاگوان ہے۔ اس بکے لئے چوہانوں کے سردار نے پیغام بھیجا ہے۔ اب اُسے معلوم ہوا اگر وہ پر تھال کا بیاہ کر چکا ہوتا تو یہ عزت کیسے ملتی رائے نندکار اسے ہاتھی کی پیش کش کیوں کرتا؟ اور دل ہی دل میں وہ خیش ہوا کہ چلو یہ بھی اچھا ہے بیٹی ابھی تک دوسرے گھر میں نہیں گئی۔ ورنہ..... یہ چوہان خاندان۔ یہ رائے نندکار۔ اور یہ ہاتھی..... یقیناً بھگوان کی لیا نیادی ہے ورنہ نکہت سنا کر کو کون جانتا تھا اُسے یقین تھا۔ پر تھال اس پیغام کو سننے ہی اپنی قسمت پر تازہ کرنے لگی لیکن وہ اپنے بیاہ سے اتنی مرتبہ انکار کر چکی تھی کہ اب بوڑھے کو اس کے سامنے کسی کے پیغام کا ذکر کرتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا تھا اگر پہلے کی طرح اس نے اس مرتبہ بھی انکار کر دیا تو رائے نندکار پھر کہاں ہاتھ آئے گا؟ مگر نہیں اس کی بیٹی

اتنی نا سمجھ نہیں۔ وہ چوہانوں کی عزت اور غیرت کو خوب جانتی ہے، پر تھوڑی راج چوہان ہی تھا جو بھری سبھا سے شیوگتا کو اڑا لایا تھا پھر نندکار پر تھاں کو کیسے چھوڑے گا؟ مگر پر تھاں انکار کیوں کرے گی؟ اُسے کہیں نہ کہیں تو ہاں کمرنی ہی ہے تو پھر رائے نندکار سے بڑا رشتہ کہاں سے آئے گا؟

اسی دن بوڑھے نکھیت نے کھیا کی بیٹی گوری کو بلایا اور اس کی وساطت سے رائے نندکار کا سندیس پر تھاں تک پہنچایا۔ بوڑھے نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”تو اس کو سمجھانا وہ مان جائے گی۔ کہنا چوہان سردار نے تیرے بابا کے لئے ہاتھی بھیجا منظور کیا ہے جب میرے دروازے پر ہاتھی چھو لے گا تو میری کتنی شو بھا ہوگی۔ لوگ ہماری قسمت پر رشک کریں گے اور میں..... میں ہاتھی پر بیٹھ کر فیروز آباد جاؤں گا۔ میرے پاس دلی عہد کا پروانہ ہے وہ یہ سن کر کتنا خوش ہو گا کہ نکھیت سدا ہاتھی پر سوار ہو کر اس سے ملنے آیا ہے پر تھاں سے کہنا اپنے بوڑھے باپ کی عزت رکھ لے اور دیکھ گوری! تجھے بات بھول جایا کرتی ہے کہیں ہاتھی کا ذکر بھی نہ بھول جانا۔ یہ ہاتھی بھاگوانوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ بس اب تو جا۔ وہ تجھے بیٹیا پڑل جانتے گی اور ہاں اُسے اپنے ساتھ لے کر جلدی لوٹ آنا۔ رائے نندکار کے آدمی جواب کے منتظر ہیں۔“

گوری گئی اور لوٹ آئی مگر پر تھاں اس کے ساتھ نہ آ سکی۔ گوری نے بتایا کہ وہ مندر چلی گئی ہے ظہر کے آئے گی۔

”مندر چلی گئی ہے۔“ بوڑھا نکھیت بولا۔ ”پھر تو اس نے ضرور رائے نندکار کا پیغام منظور کر لیا ہو گا اور بھگوان کو پر نام کرنے مندر میں چلی گئی ہو گی۔ پر تو بتاتی کیوں نہیں اس نے کیا جواب دیا ہے۔ وہ بیابا پر راضی ہے نا؟“

”نہیں۔“

اور گوری کے منہ سے یہ ”نہیں“ سن کر بوڑھے نکھیت کا چہرہ یوں اتر گیا جیسے ابھی اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا اور جذبات ساہو کر زبیر میں پڑ بیٹھا۔

”نکھیت چاچا! تم بھی ہلکا نہ کرو۔ بھگوان نے چاہا تو اچھا ہی ہو گا۔“

”اب بھگوان کچھ نہیں چاہا ہے گا۔ کچھ نہیں چاہا ہے گا۔“ بوڑھے کی آواز مایوسی کے

کنوین میں ڈوٹی پٹی کی۔ جسے تو پچھ لیا تھا ہے پر تھاں اپنے بیویوں میں کاٹے کھیر رہی ہے قسمت اس پر بار بار مہربان ہوئی ہے اور وہ ہر مرتبہ اُسے پاؤں سے ٹھکرا دیتی ہے۔ میری بات یاد رکھنا وہ روئے گی، تو پہنے گی، برباد ہو جائے گی۔“

”بابا۔۔۔“

بوڑھے نے سر اٹھا کر دیکھا تو پر تھاں سامنے کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں پھولوں کی مال تھی جسے وہ شاید مندر سے لائی تھی اور اب دلہیز کے پاس کھڑی ڈکھی نظروں سے اپنے بوڑھے باپ کو دیکھ رہی تھی جس کے بدن پر غصہ اور غم کی وجہ سے ایک وعشہ سا طاری تھا۔ بیٹی کو دیکھتے ہی جیسے بوڑھے کے منہ کا بند ٹوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”تو نے اچھا نہیں کیا بیٹی! چوہان سردار یونہی کسی کے ہاں پیغام نہیں بھیجا کرتے اب میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ میں رائے نندکار کے ایلچی کو کیا جواب دوں گا۔ لوگ ہنسی سے کہیں گے بڑھا سٹھیا گیا ہے۔۔۔۔۔ اور تو۔۔۔۔۔ تو شاید اپنے آپ کو راجہ بھوج کی بیٹی سمجھتی ہے مگر تیرا باپ تو ایک غریب سار ہے بھلا چوہان اور سار کا کیا مقابلہ اگر رائے نندکار بگڑ گیا تو جانتی ہے کیا ہو گا۔ وہ انکار کو اپنی توہین سمجھے گا پھر ہم سب مل کر بھی اس کے غضب و قہر کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔“ پر تھاں ہولے ہولے چلتی ہوئی بوڑھے باپ کے پاس آئی اور اس کے کندھوں پر ہاتھ ٹکا کر بولی۔ ”بابا غم نہ کرو، رائے نندکار ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

بڑھے کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ چوہان سردار اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے یا نہیں اسے اصل ڈکھ یہ تھا کہ پر تھاں نے اتنے بڑے سردار کا پیغام قبول کیوں نہیں کیا جس کے دروازے پر ہاتھی جھوٹے نہیں جس کی حویلی میں اس کی بیٹی راج کرے گی اور سارے علاقے میں لوگ ایک دوسرے کو کچھلت کی کہانیاں سنایا کریں گے۔

”نندکار چاہے تو یہ سارا گاؤں پھونک سکتا ہے۔ ہمیں جلا کر رائے کا ڈھیر بنا سکتا ہے اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“ بوڑھا کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو پر تھاں کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود مسکراہٹ تیر رہی تھی اور یہ مسکراہٹ دیکھ کر بوڑھے کا کلیجہ دھک سے رہ گیا تو کیا اس کے نزدیک رائے نندکار بھی کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ باپ کے آنسو بھی اس کے پتھر دل کو گداز نہیں کر سکتے پر تھاں نے دونوں ہاتھوں سے بوڑھے باپ کو سنبھالا

دے کر اٹھایا پھر ساڑھی کے آئیل سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بابا! تمہارا بیٹی لوٹ کا مال نہیں جسے نندکار ایسے لٹیرے اٹھا کر چلتے ہیں۔ وہ میرے انکار کو اپنی توہین سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے۔ ہم نے کب اس کی منت کی تھی کہ وہ پیغام بھیجے۔“

”بیٹی!“ بوڑھے کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ حیرت پاش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا ”پر تیرے من میں کیا ہے؟ کسی دن تو مجھے اتنی بات تو بتا دے؟“

”بس کچھ روز چپ رہو۔ پھر تمہیں آپ سے آپ پتہ چل جائے گا۔ میرے من میں کیا ہے۔“

یہ کہہ کر پر تعالٰیٰ بوڑھے باپ کو بازوؤں کا سہارا دیئے کمرے میں لے گئی رائے نندکار کے اچھی کو ناکام لوٹا دیا گیا۔ سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی کہ لکھپت سارے چوہانوں کو اپنی بیٹی دینے سے انکار کر دیا ہے۔ گاؤں کے کھیا سکھ دیونے یہ خبر سنی تو دم بخود ہو گیا۔ کیا لکھپت کچھ پاگل ہو گیا ہے؟

حمیدی

پاک سوسائٹی

ڈاٹ کام

جواب کا خنجر

نئی سواری

شام کا ستارہ مندر کے سنہری کلس کے عین اوپر چمک رہا تھا۔ جب بیاناگر کے راستے پر گھنٹیوں کی سریلی آواز جاو چکاتی ہوئی ابھری۔ سورج کی بخشی شعاعیں تلخے اندھیروں میں سسک سسک کر دم توڑ رہی تھیں۔ درختوں کے سائے جھپٹے میں مل جل گئے تھے اور زمین پر تاریکی کے ناگ ریگنے لگے تھے۔

چرواہے سر شام ہی اپنے ڈھور ڈنگر بستی کی جانب ہانک دیتے تھے اور غروب آفتاب کا سکھ بجنے کے بعد یہاں ایک عجیب سا سناٹا چھا جاتا تھا۔ اس سناٹے میں گھنٹیوں کی آواز نہ یوں بلند ہوئی جیسے ایک ساتھ چاندی کی پیسوں چھاگلین بج اٹھی ہوں اور ان کی موسیقی ایک سحر آفریں جھنکار کے ساتھ فضا میں بکھرنے لگے۔ آواز لکھ بلیطہ قریب آ رہی تھی اور اس کے بڑھتے اور ابھرتے ہوئے ترنم سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی قافلہ بستی کی طرف آ رہا ہو لیکن مہاراج دیورائے کی سرکشی اور راہزنی کی وجہ سے بیاناگر کی شاہراہ کچھ عرصہ سے بند پڑی تھی اور کوئی قافلہ عموماً گل کے راستے سفر کرتے تھے۔ پہلے بیاناگر اور دکن کے درمیان قدم قدم پر زندگی کے آثار نظر آتے تھے اور راتوں کو بھی راستے مسافروں کی آہٹ اور قافلوں کی موسیقی سے آباد رہتا تھا لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی ”راہے دایاں“ کا مہاراجہ دیورائے چند سال پہلے بھی سرحد کی تاخت میں بڑی سرگرمی دکھایا کرتا تھا لیکن بہمنی سلطان نے جوابی حملہ میں بیاناگر کی سلطنت الٹ کر رکھ دی اور مہاراجہ نے صلح کرنے اپنی جان

چھڑائی تھی۔ وہ سلطان دکن کو خراج دینے پر تیار ہو گیا تھا اور شرائط صلح کے مطابق اسے اسی وقت سلطان کے حضور حاضر ہو جانا چاہیے تھا۔ جب سلطان اس کی ضرورت محسوس کرے چند سال تک دیورائے اس معاہدے کا پابند رہا۔ وہ خراج بھی بھیجتا اور سلطانی احکام کی خلاف ورزی بھی نہیں کرتا تھا لیکن کچھ عرصہ سے پھر اس کی فتنہ جو طبیعت ہنگامہ آرائی کی متنی نظر آتی تھی اس نے حیلوں بہانوں سے خراج ہی نہیں روک لیا تھا بلکہ سرحدوں پر ڈاکہ زنی بھی شروع کر دی تھی اور دارالسلطنت گلبرگہ سے سلطان نے شہزادہ حسن کو تاکید کی تھی کہ دیورائے پر نظر رکھے۔ حالات کر دٹ بدل رہے تھے اور خطروں کے پیش نظر تو دن کے اجالے میں بھی اس سنان راستے پر سفر کرتے ہوئے انسان وحشت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ البتہ بھانگر کے بیماری پنڈت اور پروہت جو کاشی کی یاترا کو جاتے وقت دکن کی سرزمین سے گزرتے تھے اسی راستے سے آ جایا کرتے تھے لیکن یاتریوں کی حفاظت، دیکھ بھال اور مہمان نوازی کے لئے ہمیشی سلطان نے خاص احکام جاری کر رکھے تھے۔ حکم تھا بھانگر کا جو یاتری دکن میں آئے وہ حکومت کا مہمان ہو گا اور سلطانی کارندے اس کے طعام و قیام کے ذمہ دار ہوں گے۔ اسی مقصد کے لئے سلطان نے کئی سرائیں بنوا دی تھیں۔ یاتری بنارس جاتے یا واپس آتے ہوئے انہی سرائوں میں بسیرا لیتے تھے۔ جہاں سرکاری خدام ان کی سیوا کرتے بعض یاتریوں کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ دکن میں اپنے ہندو دوستوں یا عزیزوں کے ہاں رات بسر کریں۔ سلطان نے اجازت دے رکھی تھی وہ جہاں چاہیں قیام کریں لیکن دکن کے ہندو میزبانوں کو ہدایت تھی کہ مہمانوں کی خدمت گزاری میں کوئی وقتہ فروگزاشت نہ کریں۔ خاص خاص ہندو گھرانوں کو بھی جہاں یاتری عموماً ٹھہرتے تھے شاہی خزانہ سے وظیفہ ملتا تھا تاکہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ رہ جائے یہی وجہ تھی سلطان فیروز شاہ بھانگر اور بنارس کے ہندوؤں میں بڑی عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اکثر یاتری کاشی میں اس کی ترقی، اقبال کے لئے پراگھنا کرتے تھے۔ اس کے برعکس بھانگر کا راجہ نہ صرف یاتریوں سے محمول لیتا بلکہ اس کے سپاہی دکن کے تجارتی قافلہ کو بھی ٹوٹنے سے دریغ نہ کرتے تھے حتیٰ کہ بھانگر کے فوجیوں نے کئی مرتبہ دکن کے ہندو سوداگروں کو بھی لوٹ لیا تھا اور وہ روکتے ہوئے سلطان کے دربار میں فریاد لائے تھے۔ رحمت سلطان نے ان کے نقصان کی تلافی کر دی تھی اور مدد

کے حاکم فولا دھاں کو حکم بھیجا تھا وہ دیورائے کے ٹیرے سپاہیوں پر نظر رکھے اور انہیں قرار واقعی سزا دے اس حکم کے بعد اگرچہ سرحدی مقامات پر دیورائے کی ماتحت ختم ہو گئی تھی کیونکہ ہمیں سوار سرحد کے آس پاس گشت کرتے رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی بیجا نگر کی شاہرہ سنسان اور ویران ہو گئی تھی۔ کیونکہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی اور اب کوئی اکا دکا مسافر ہی اس راستے پر سفر کرتا تھا وہ بھی شام ڈھلنے سے پہلے ہی پہلے کسی بستی کا رخ کر لیتا تھا۔ اب اسی اجاڑ اور ویران شاہراہ پر گھنٹیوں کا مترنم شور شام کے غلبے سنائے کا سینہ چیرتا ہوا ابھرا تھا اور لٹک رہا تھا یہ شور بستی سے قریب اور قریب ہوتا جا رہا تھا۔

مندر کے بوڑھے ہنٹ نے چھوٹی اینٹوں کی دیوار پر سے سر ابھار کر اپنی تیز نگاہیں نیم تاریک راستے پر بچھا دیں اور یہ جاننے کے لئے بے قرار ہو گیا کہ بیجا نگر کی سنسان شاہراہ پر آج موسیقیاں سی بکھیرتا ہوا کون چلا آ رہا ہے؟ لیکن اس کی نگاہیں دم بدم پھیلنے ہوئے اندھروں میں بکھر کے رہ گئیں اور اسے چند متحرک سایوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دے سکا۔ گاؤں کا بڈھا کھیا سکھ دیو گھنٹیوں کی آواز سن کر دودازے کی دلیزری میں ٹپک کے رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ معرکہ آسا کہ یہ گھنٹیوں کی آواز کیسی ہے؟

"کوئی قافلہ جان پڑے ہے۔" بڈھا آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ پھر اس نے کھڑے کھڑے آواز دی۔

"گوری! او گوری! ذرا باہر نکل کر دیکھو یہ گھنٹیوں کا شور کیسا ہے؟"

لیکن بڈھے کھیا کی آواز جھوپڑی کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ گوری وہاں نہیں تھی اور گوری کی بیمار ماں جو کئی روز سے چار پائی پر پڑی کھانس رہی تھی بھلا بستر سے اٹھ کر باہر کیسے جاتی گھنٹیوں کی یہ سریلی آواز ایک غرضہ کے بعد اس بستی کی گھنٹوں کی تھی۔ اس لئے ہر کوئی یہ جاننے کے لئے بے تاب تھا کہ بیجا نگر کے راستے پر کس کی سواری آ رہی ہے۔

اچانک بڈھے کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کود گیا۔

"ارے سکھ دیو! اگر یہ راجپار حسن کی سواری ہوئی تو؟"

سواری شہزادے کی ہو یا کوئی قافلہ ہر حال میں بڈھے سکھ دیو کو اس کا حال معلوم کرنا ضروری تھا وہ اس بستی کا کھیا تھا۔ سردار! اور اس کا فرض تھا کہ مسافروں کی دیکھ بھال

کرے۔ مہمانوں اور مسافروں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے سلطان عالی کے احکام بڑے سخت تھے۔ بڑھا ایک لمحہ کے لئے کانپ گیا۔ پھر ایک ہاتھ کمر پر رکھے اور دوسرے ہاتھ میں مٹی کا دیا لئے وہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ ابھی وہ دروازے پر ہی تھا کہ اسے کئی سائے اندھیرے میں شاہراہ کی طرف بھاگتے ہوئے نظر آئے مندر کے آس پاس بھی کچھ سائے متحرک تھے اور بوڑھا منبت ابھی تک اینٹوں کی دیوار سے سرابھارے قافلے کا انتظار کر رہا تھا۔ سکھ دیو دیا لے کر جھونپڑی سے باہر نکلا تو مندر کی دیوار کے آس پاس تھرکنے والے سائے اس کی طرف کھینکے گئے۔

”سچے رام جی کی۔ کھیا کا کا!“

سکھ دیو نے آنے والوں میں راسوں جھولی کی آواز پہچان لی اور دیئے کی تھر تھرائی لو

پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے بولا۔

”سوارو بھائیہ کس کی سوار کی آ رہی ہے؟“

”کا کھیر کھیا کا کا! مجھے تو قافلہ جان پڑے ہے۔“

”پر پچانکر کے رستے کون سا قافلہ آؤسے؟“

”بھگوان ہی جانے۔“

اتنے میں گھنٹیوں کی آوازیں قریب سنائی دیئے لگیں اور قافلہ گھنے درختوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس کے آگے ایک مشعل بردار سوار تھا۔ جس کے تیزے کا پھل مشعل کی زور روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس روشنی میں لوگ ایک عالیشان تل گاڑی کو دیکھ کر ٹھک سے گئے تھے جس پر ایک گول چتر سایہ لگن تھا۔ گاڑی میں چار سفید تل جے ہوئے تھے۔ جن پر سرخ ریشم کی چادریں جھول رہی تھیں۔ بیلوں کے گلے میں چاندی کی گھنٹیاں بندھی تھیں ان کے پیچھون پر سونے کے خول چڑھائے گئے تھے اور پاؤں میں کانسی کی جھانجھنیں تھیں۔ بیلوں کی رفتار کے ساتھ چاندی کی گھنٹیاں اور کانسی کی جھانجھنیں ایک عجیب موسیقی پیدا کر رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے آکاش کی اہر رائیں لٹاؤں میں رقص کے جادو بکھیر رہی ہیں۔

تل گاڑی کے آگے اور پیچھے چار چار سوار تھے جن کے گھوڑوں کا رنگ سرخی مال تھا۔ سواروں نے بیجانگر کے شاہی دست کی وردیاں زیب تن کر رکھی تھیں۔ لوگ اس سوار کی

چکر کر حیران و ششدر رہ گئے۔

”یہ تو کسی مہاراج کی سواری ہے۔“

بوڑھے کھیا کے خشک ہونٹ بھر گئے۔

”پر یہ کون مہاراج دوئے؟“ راموں دھوبی کی آواز بھی ڈوب گئی۔

کھیا اس سوچ میں تھا۔ دکن میں بھلا کون تیل گاڑی پر سفر کر سکتا ہے؟ یہاں ہمیں

حکومت ہے اور ان کی عورتیں بھی مردوں کی طرح گھوڑوں کی سواری کرتی ہیں۔ پھر یہ

جان ہے؟ کہیں بیٹا نگر کا راجہ دیورائے تو راستہ بھول کر ادھر نہیں آ گیا۔

تیل گاڑی مندر کے پاس آ کر رک گئی اور لوگ اس کے آس پاس اکٹھے ہونے

لگے۔ سکھ دیو خود چل کر دیکھنا چاہتا تھا کہ آنے والا کون ہے۔ ابھی اس نے قدم اٹھایا ہی تھا

کہ گوری بھاگی بھاگی آئی اور آتے ہی چلانے لگی۔

”بابا گورو دیو آئے ہیں۔ گورو دیو۔“

”گورو دیو۔۔۔۔۔“

”ہاں بیٹا نگر کے گورو گودک ناتھ! یہ سواری انہی کی ہے۔“

گوری نے تیل گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ سکھ دیو نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

نئی گودک ناتھ تھیں چتر کے نیچے بیٹھا لوگوں کے پر نام کا جواب دے رہا تھا پھر ایک لڑکی

لوں کو حیرتی ہوئی تیل گاڑی کے پاس آئی اور اچھل کر گاڑی پر چڑھ گئی۔ اس نے بڑی

تھکات کے ساتھ گودک ناتھ کے چرن چھوئے اور گودک ناتھ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر

شیر وادی۔ وہ لڑکی پر تھال کے سوا اور کوئی نہ تھی۔

جنگوان کی لیلیا

گودک ناتھ کیا آیا۔ نکچھت سناری دنیا ہی بدل گئی۔ اب اس کی زبان پر ایک ہی

فرد تھا ”جنگوان! تیری لیلیا نیاری ہے۔“

کہاں تو بوڑھا سناں رائے تندکار جو بان کے ہاتھوں کے سامنے ساری خدائی کو بیچ

بھتا تھا اور اسے یہ صدمہ کھائے جا رہا تھا کہ پر تھال نے چند بان سردار کو انکار کر کے ایک

بہت بڑی غلطی کی ہے جس کی سزا اسے ضرور بھگتنی پڑے گی اور کہاں اب اس کے

دروازے کے باہر بیگانہ کے مہاراج دیورائے کی خاص سواری کھڑی تھی۔ یہی نہیں بلکہ سلطنت بیگانہ کا راج گورو شاہی خاصہ کے سواروں کے ہمراہ اس کا مہمان تھا۔ واقعی بنگلان کی لیلیا نیاری تھی۔

سنا کہ اس بات کا خوف تھا اگر رائے نندکار نے طیش میں آکر اس پر حملہ کر دیا۔ پر حال کو زیر دستی اٹھالے جانے کی کوشش کی تو وہ غریب کیا کر سکے گا۔ اس قسم کی باتیں سوچتے وقت وہ یہ بات بھول جاتا تھا کہ اس کے پاس وکن کے دلی عہد شہزادہ حسن کا خاصہ پروانہ راہداری موجود ہے اور وہ جب چاہے شہزادہ کو اپنی چٹا سنا کر شاہی امداد حاصل کر سکتا ہے لیکن پنڈت گورکھ ناتھ کے آتے ہی جیسے وہ دنیا جہاں کے تمام دکھ اندیشے اور دسوت بھول گیا تھا۔ اب اُسے احساس ہوا کہ کھیت سنا کوئی معمولی آدمی نہیں۔ بھلا جس کی حوصلہ شکنی بیگانہ کے مہاراج کی شاہی سواری کھڑی ہو۔ وہ کوئی معمولی آدمی ہو سکتا ہے؟

اگرچہ پنڈت گورکھ ناتھ نے ابھی تک اپنی اچانک آمد کا مقصد بیان نہیں کیا تھا لیکن لکھیت دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ یقیناً کوئی خاص مقصد ہوگا۔ تبھی پنڈت گورکھ ناتھ..... نہیں..... نہیں..... پنڈت گورکھ ناتھ کیوں..... اب وہ پنڈت تھوڑے ہیں لیکن میری زبان بھی بڑی کتیا ہے۔ یونہی بھونکے جاتی ہے۔ اپنے لکھیت کے بچے! اب تو اپنے راج گورو کو۔ راج گورو..... ہاں ابھی! راج گورو، مہاراج دیورائے کے بعد بیگانہ سب سے بڑے آدمی۔ جن کے اشارے پر یہ ایک نندکار کیا اگر ایک سوا ایک نندکار ہو تو ہاتھیں سمیت سب غائب غلہ کر دیئے جائیں۔ آیا ہے ہزارائے نندکار جو ہاں اس چوہان کو بھی دیکھا جائے گا لیکن لکھیت! ٹو نے کچھ سوچا یہ راج گورو! شاہی سوار لے کر اچانک کیوں آدھیکے؟ آخر کوئی بات تو ہوگی لیکن وہ بتاتے کیوں نہیں۔ کیوں آئے ہیں۔ کیا لینے آئے ہیں؟ اگر کوئی خاص بات ہے تو انہیں بیان کرنی چاہئے۔ کیا کہا۔ انہیں آئے ابھی آٹھ پہر تو ہوئے نہیں۔ اتنی جلدی کیوں جائیں؟ جب اطمینان سے بیٹھیں۔ حرفت مطلب زبان نہ لائیں گے۔ میری سنس خفہ اپنی سنائیں گے مگر تو بھی کیسا سنا ہے۔ ارے خاص کاموں کے لئے خاص وقت ہوتے ہیں۔ بدھو! کیا اب بھی کچھ

اچھا بھی! راج گورو اپنی مرضی سے آئے ہیں اور اپنی مرضی ہی سے آنے کا مقصد بھی بتائیں گے۔ میں خواہ خواہ پوچھنے والا کون۔ چلو چھٹی ہوئی لیکن یہ پر تھاں بھی تو سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ کم بخت دو گھڑی کے لئے کہیں ان کا چھچھا چھوڑے تو بے شرم ہو کر پوچھ ہی لیتا۔ راج گورو! خیریت تو ہے بیجا گریہ اتنی جلدی کیوں لوٹ آئے؟ آخر یہ ایک بات پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟

آپ ہی آپ لکھت نہ جانے کیا کیا سوچتا اور بوڑھانا بھرا۔ صبح جب پر تھاں اپنے گورو دیو کے ہاتھ دھو رہی تھی۔ سار کے جی میں آئی پر تھاں کے ہاتھ سے پانی کا برتن چھین لے اور ہاتھ دھوانے لگے یہاں ہی آنے کا مقصد پوچھ لے لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر خاموش رہا اور باہر گھن کی طرف چل دیا۔ جہاں چتر سے آرامتہ گاڑی کھڑی تھی۔ گاؤں کے مرد عورتیں بچے بالے بھی تو اس سواری کو دیکھنے کے لئے آئے تھے اور ساری ہستی میں گھر گھر یہی چرچا تھا۔ لکھت سار کے گھر مہاراج دیورائے کی سواری آئی ہے۔ اسی احساس نے لکھت کو جیسے پاگل کر دیا تھا اور وہ بار بار گھر سے باہر نکل جاتا تھا تاکہ لوگ اسے دیکھیں اور اس کے متعلق باتیں کریں۔ کہیں:-

”کہو لکھت چاچا! تم بھی بیجا گھر جا رہے ہو نا؟ سنا ہے مہاراج دیورائے نے تمہارے ہی لئے اپنی خاصی سواری بھیجی ہے۔“
اور لکھت جواب میں کہے:-

”ہاں بھئی! راجوں مہاراجوں کی بات کون مانے۔ راجہ نے بلایا ہے تو جانا ہی ہو گا۔“

ان ہی خوش کن تصورات میں گھویا ہوا وہ بمشکل دروازے تک گیا تھا کہ اسے راج گورو کی آواز سنائی دی۔ ”تھیر د لکھت بھیا! مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“
لکھت کے پاؤں جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ انہی قدموں پلٹ گیا۔ اس کے من میں جیسے لڈ پھوٹنے لگے آخر وہ راج گورو کی زبان سے یہی فقرے سننے کے لئے تو بے تاب تھا خوشی کے مارے اسے اپنے پاؤں بہت ہلکے محسوس ہونے لگے جیسے وہ آپ سے آپ فضا میں اڑ جاتا چاہتے ہوں۔ اچانک اسے ایک ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے پڑا۔ اس نے دل میں سوچا۔ ”ارے لکھت ایسی خوشی بھی کیا۔ ذرا دیکھ بھال کے چل۔“

ہاتھ دھونے کے بعد راج گورو کمرے میں آیا اور ایک کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جس کے پٹ باغیچہ کی طرف کھلتے تھے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لکھپت اس کے قریب ہی کھڑا تھا جیسے اس کے کسی حکم کا منتظر ہو۔

”لکھپت تمہیں یاد ہو گا جب میں یہاں پر تھاں کو تنگیت ڈالیا سکھایا کرتا تھا۔ تم بار بار مجھ سے ایک سوال پوچھا کرتے تھے؟“

”یاد ہے مہاراج؟“

”اور تمہیں یہ بھی یاد ہو گا۔ جب میں نے بیٹا نگر کے لئے رنج سربا عدا تو جاتے جاتے کیا کہا تھا؟“

لکھپت سوچ میں پڑ گیا۔ کہ بیٹا نگر جانے سے پہلے انہوں نے کون سی انوکھی بات کہی تھی۔ جب اسے گزشتہ بات یاد نہ آ سکی تو بولا۔

”میں بھول گیا ہوں راج گورو!“

ایک کنیا کے باپ کا حنفہ اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے؟“ گورو کہنے لگا۔

”خیر مجھے یاد ہے۔ میں نے کہا تھا۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے لکھپت! تم نے جو سوال مجھ سے کیا تھا۔ ابھی اس کے جواب کا وقت نہیں آیا۔ کچھ دیر اور انتظار کرو۔“

”ہاں مجھے یاد آ گیا۔ آپ نے یہی کہا تھا۔“

گورو کھاتھ نے تیز نگاہوں سے لکھپت کی طرف دیکھا پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر بولا۔

”تو سنو! اب تمہارے سوال کے جواب کا وقت آ گیا ہے۔“

”مہاراج!“

”میں تمہارے لئے خوشی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“

لکھپت کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی اچھل کر بسنے سے باہر آ جائے گا۔ وہ سننا چاہتا تھا۔ راج گورو اس کے لئے خوشی کا کیا پیغام لے کر آئے ہیں۔ اس نے اپنی سوالیہ نگاہیں گورو کیے چہرے پر گاڑ دیں گویا جواب کا منتظر تھا۔ گورو نے اپنا منہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

تیار تھے لیکن میں نے پرتھال کے ماتھے پر ایک خاص چمک دیکھی تھی اور اسی دن سے میں سمجھ گیا تھا یہ فوہ صورت سوتی کسی راج کٹ کی زینت بنے گا۔ بچاگر پہنچ کر میں نے مہاراج دیورائے کے سامنے پرتھال کے حسن کی تعریف کی۔ وہ بے تاب ہو گیا اور اپنی خاص سواری دے کر مجھے فوہ ادھر روانہ کر دیا۔ سو میں پرتھال کو بچاگر کی رانی بنانے کے لئے لینے آیا ہوں لکھپت۔“

”مہاراج! قریب مسرت سے لکھپت کی چیخ نکل گئی پھر وہ جلدی سے گورو کے چرنوں میں بیٹھ گیا اور بولا۔“یہ سب آپ کی کرپا ہے راج گورو!“

میرے قدموں سے اٹھو لکھپت! اب تم ایک راجہ کے سر بنے والے ہو تمہیں اپنا مقام پہچانا چاہیے۔“

”لیکن مجھے آپ کے چرنوں میں بیٹھنے سے آندھلتا ہے۔“

”نہیں میرے چرن اس قابل نہیں۔“ گوروکھ ناتھ نے اسے شانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ ”کو تمہیں تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں؟“

”سورج ریت کے ایک ذرے پر مہربان ہو جائے تو کیا ذرے کو اس مہربانی پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے؟“

”تو اب صرف پرتھال سے پوچھنا باقی رہ گیا۔“

”وہ انکار نہیں کرے گی۔ اسے صرف آگیا کی ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے وہ مجھے اپنا گورو دیو مانتی ہے پھر بھی اس سے پوچھنا ضروری ہے۔“ پھر اس نے صندوق کا فرخ صندوق لکھپت کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے مہاراج؟“

”وہی کے لئے مہاراج دیورائے کا پہلا تحفہ!“

لکھپت نے صندوق کھول کر دیکھا۔ تو وہ گ رہ گیا۔ میرے جواہرات سے مرصع گلابند اور انگوٹھی کی چمک نے اس کی نگاہیں خیرہ کر دیں۔ وہ سار تھا اور اس نے اعلیٰ سے اعلیٰ زیور بنائے تھے لیکن ایسی تراش تراش اس نے آج تک نہ دیکھی تھی پھر میرے جواہرات، لکھپت کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ پندت گوروکھ ناتھ نے کہا۔

”مجھے یہ سب دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔“

کر دو۔ میں آج ہی اس سے بات کروں گا۔“

یہ کہہ کر راج گورو کمرے سے نکل گیا اور فوراً مسرت سے لکھپت نے زیورات کا صندوق اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ وہ سوچے لگا۔ یہ بھی اچھا ہوا پر تھال نے رائے نہ دیا۔
 سے رشتہ منکھور نہیں کیا۔ ورنہ مہاراج دیورائے کے پیغام کا افسوس زندگی بھر رہتا۔ اب میری
 بیٹی بچ رانی بنے گی، اپنے راجہ کے ساتھ راج سگھاسن پر بیٹھی گی۔ وہ بیٹا نگر میں راز
 کرے گی۔ سب لوگ اسے ”رانی پر تھال“ کہہ کے پکاریں گے۔ ”رانی پر تھال“ واہ بھگوان
 تیری لیا نیاری ہے۔“

سارا دن انہی تصورات میں گزر گیا۔ جب لکھپت نے اپنی بیوی کو راج گورو کی آمد
 مقصد بتایا اور کہا کہ پر تھال بیٹا نگر کی رانی بنے گی تو خوشی کے مارے بڑھیا کی آنکھوں میں
 آنسو جھلکے آئے۔ وہ بولی۔

”بھگوان تیرے بھید انوکھے ہیں۔ تیری لیا نیاری ہے۔“

یادوں کے خنجر

شام کے چھپنے میں جب چھتری پر اندھیروں کے سانپاں ریٹکنے لگے۔ لکھپت خوشی میں
 جھومتا ہوا پنڈت گورو کو ناتھ کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ پوچھتا چاہتا تھا۔ پر تھال کا سامان
 تو تیار کر دیا گیا ہے لیکن میرے لئے کیا آگے ہے؟ بیٹا نگر دیکھ کر میرا جی چاہ رہا ہے۔ اگر
 مجھے بھی ساتھ لے چلیں تو من کی ایک کامنا پوری ہو جائے گی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا۔ راج گورو کا سامان بندھا ہوا تھا۔ اس
 کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک اتھاہ غم گردش کر رہا تھا۔ چہرے کی جھریاں حیرت
 انگیز طور سے نمایاں ہو چکی تھیں اور وہ منہ بول سے زیادہ بوڑھا، کمزور اور نحیف دکھائی دے
 رہا تھا۔ صرف آٹھ پہر کے اندر اس میں ایک عجیب سی تبدیلی آگئی تھی حالانکہ صبح وہ ہشتا
 نشان اور بے فکر نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر رونق اور تازگی تھی۔ مگر اب وہی صورت
 ایک ہرجمائے پھول کی طرح پژمردہ اور اداس نظر آ رہی تھی۔

اس کا کمر درابے رنگ چہرہ دیکھ کر لکھپت کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے
 احساس کو تھوڑی سی ہلکی سی ضرب سے مجروح کر دیا ہو۔

”راج گورو!“ نکھت کے یوں پر کپکا پاٹ طاری ہوئی۔

جنگدان کی لیا بڑی نیاری ہے نکھت!“ بوڑھا گورو اداس لہجے میں کہنے لگا۔ ”میں
میرے چہرے پر لکھ کی سیاہی دیکھ کر تم پریشان ہو گئے مگر قسمت کا لکھا کون مٹا
سکتا ہے؟

راج گورو کی باتوں نے سنا کو ایک عجیب سے بخمبے میں ڈال دیا۔ ”میں آپ کا
طلب نہیں سمجھ سکا مہاراج!“

”میرے چہرے پر قسمت کا لکھا پڑھ لو۔ زبان سے کیا بیان کروں۔ میری پریشانی
نہیں کر تم بھی بڑھاپے سے نفرت کرنے لگو گے۔“

”آپ کی اداسی اور پریشانی نے مجھے فکر مند کر دیا ہے۔ کیا میں آپ کی کوئی سبھا
نہیں کر سکتا؟“

”نکھت! میں کیا کیا امیدیں لے کر آیا تھا۔ لیکن ناکام واپس جا رہا ہوں۔“

راج گورو کے منہ سے یہ الفاظ سننے ہی نکھت کے دل پر ایک زبردست دھکا لگا۔
تو کیا پر تھاں نے انکار کر دیا؟“ نکھت کے لہجے میں اضطراب، غم اور غصہ کی ملی جلی کیفیت
تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اچانک زرد ہونے لگا تھا..... ”مجھے بتائیے۔ اس نے کیا
باب دیا؟“

”میں یہاں راج گورو بن کے آیا تھا۔ پر تھاں نے پھر مجھے گورو کا تھ بٹا دیا ہے۔
میں نے میرے چہرے سے دیوارائے کی سیاہ مصلکتوں کے پردے ہٹا کر مجھے میری اصل
صورت دکھائی ہے۔ اب میں اپنی اسی صورت کے ساتھ بیجا نگر کی طرف لوٹ رہا ہوں۔“

”تو اس نے مہاراج دیوارائے کا سند میں بھی منظر نہیں کیا؟“

نکھت کے لہجے میں غصہ کی چنگاریاں اڑنے لگی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس
کے اندر اچانک کوئی آلاؤ ڈبک اٹھا ہے۔ اس نے راج گورو کے چہرے پر نظریں جمادیں۔
مجھے صاف صاف بتائیے راج گورو! وہ بیجا نگر کی رانی کیوں نہیں بننا چاہتی؟ میں اشاروں
میں زبان نہ سمجھ سکوں گا۔“

”تو پھر سنو.....“ گورو کا تھ مدح آمیز میں کہنے لگا۔ ”وہ کہتی ہے میں آپ کے لئے
یوں تیاگ سکتی ہوں لیکن یہاں نہیں کر سکتی کیونکہ میرا سچو ہو چکا ہے۔“

بوجھکا ہے اسرارِ نفرت و تحقارت کے ساتھ چلایا۔۔۔ ”بھلا ماما چا کی مرضی کے بغیر کسی کنیا کا شوگ ہوا ہے؟ اس کے بیاہ کی بات کس نے چھیڑی؟ اس کے ہاتھوں پر سہاگ کی مہندی کب رچی؟ اس کی ٹانگ میں سندور کس نے بھرا؟ ماتھے پر بندیا کس نے لگائی؟ دولہا کب آیا؟ شہنائیاں کب بجیں؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ راج گورو! وہ جھوٹ کہتی ہے۔ مہاراج دیورائے کا سندس ٹھکرا کر موت کے سوا اس کا شوگ اور کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ میں اتنی مدت چپ رہا ہوں مگر اب میری زبان خاموش نہیں رہے گی۔ وہ باتوں میں اسے ایک ضرور قبول کرنا ہوگی مہاراج دیورائے یا اپنی موت۔ میں ابھی فیصلہ کئے دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر سارا اچھائی فسمے کی حالت میں دروازے کی طرف لپکا مگر راج گورو کی آواز سن کر اس کے قدم دلہیز پر ہی جم کے رہ گئے۔

”لکھپت والیں آ جاؤ۔ پرتھال کو ہاتھ لگانے کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ وہ ایک ایسی شرافت ہے جو ٹوٹ سکتی ہے مگر پکے نہیں سکتی۔“

”جو شرافت اپنے درخت کو بچانے سے انکار کر دے اسے ٹوٹ ہی جانا چاہیے۔“ سارا نے پلٹ کر راج گورو کی طرف دیکھا اور غصہ میں تھر تھراتے ہوئے بولا۔ ”اس نے صرف میرا پیار دیکھا ہے وہ غصہ نہیں دیکھا جو اسے سونگی ہوئی مٹی کی طرح جلا کر بھسم کر دے گا۔ وہ لکھپت سارا کی بیٹی ہے۔ اسے اپنے باپ کا کہا ماننا ہی پڑے گا۔“

”زبردستی کچھ نہیں ہو گا۔ لکھپت! میں نے اسے سمجھا کے دیکھ لیا مگر اس کا بھید نہ پاسکا۔ وہ ساگر کی مانند گہری اور چشمہ کے پانی کی طرح شفاف ہے۔ تم بیٹی کو اس کے خال پر چھوؤ۔“

”آپ کا مطلب ہے گہر میں آگ لگے اور میں اپنے ہاتھ پاؤں بائوہ لوں تاکہ شعلے میرے شریر کو پھونک ڈالیں۔“

”بچے! پرتھال آگ نہیں۔ وہ پھول ہے جو سارے بارغ کی شوبھا ہے۔ سارے پردوں میں چھپا ہوا وہ راگ ہے جس کے سر آتما کو جیون کی شگفتی عطا کرتے ہیں۔ اس کے گلے میں سرسوتی کا نواس ہے۔ اگر تم نے اپنے من کی بات کرنا چاہی تو یاد رکھو سب کچھ کہ

گورو نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ بوڑھے سار کا دل جذبات کی آگ پر پھٹکا جا رہا تھا۔ اس نے منہ پھیر کر اپنے آنسو چھپائے جو آنکھوں سے نکل کر اس کے چہرے کی تخت کھال پر ہولے ہولے پھسل رہے تھے۔

”دل چھوٹا نہ کر لکھت! تمہیں تو ایسی بھانگوان بیٹی پر مان کرنا چاہیے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا گورو دیو!“ اس نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”ایک عجیب مصیبت میں الجھ کے رہ گیا ہوں۔ میں جب کبھی اس کے جیون کی ڈور سیدھی کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی نیا سچ آتا ہے۔ میری ایک بیٹی ہے۔ سوچا تھا اس کے ہاتھ پہلے کر کے اپنے چاؤ پورے کروں گا۔ پر ایسا لگتا ہے میری یہ آس کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔“

”آدی کو زراش نہیں ہونا چاہیے لکھت! مجھے تو یوں دکھائی دیتا ہے۔ پر تھاں رانی نہیں مہارانی بنے گی۔ اس کے ماتھے پر۔۔۔۔۔“

گورو گورکھ ناتھ نے ابھی اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ پر تھاں کانسی کے ایک تھاں میں کسی شے پر رو مال رکھے خوددار ہوئی اور اپنے باپ کو راج گورو کے پاس دیکھ کر ٹھٹھکی گئی پھر اس نے بوڑھے کے چہرے پر آنسوؤں کی دھار دیکھی جو خشک ہو چکی تھی۔ ایک لمحہ کے اندر وہ سناٹے کی تہہ کو پہنچ گئی۔ بیٹی کا انکار باپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بن کر بھوٹ لگا تھا۔

”آؤ بیٹی!“ گورکھ ناتھ پر تھاں سے مخاطب ہوا۔ ”باہر کیوں کھڑی ہو گئی۔ میں تیرے بابا کو تیری ہی بابت سمجھا رہا تھا۔“

پر تھاں دھیرے سے اندر داخل ہوئی اور ہولے ہولے چلتی اپنے باپ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی اس نے باپ کی طرف دیکھا اور بولی۔

”بابا! تمہاری آنکھوں میں آنسو؟“

سار نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور کرتے کے دامن سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔ پر تھاں قریب جا کر بولی۔

”کیا مجھ سے روٹھ گئے ہو؟“

لیکن اس مرتبہ بھی باپ نے کوئی جواب نہ دیا اور کھڑکی سے باہر غلام گھوڑے نے لگا۔

پر تھال گورو دیو سے مخاطب ہوئی۔

”میں جانتی ہوں بابا مجھ سے کبھی ہیں۔ بہت دیکھی ہیں۔ میں نے آج تک ان کی کوئی بات نہیں مانی۔ مگر میں کیسے بتاؤں کہ جیون میرا نہیں پھر اس کا سودا کیوں کر ہو سکتا ہے۔“

”سودا؟“ سنار طیش سے بولا۔ ”تو تو یہی سمجھتی ہے میں تجھے بیچنے کی فکر میں ہوں۔ تیری قیمت وصول کر کے اپنا گھر بھرنا چاہتا ہوں۔ تجھے بکاؤ مال سمجھتا ہوں۔“

”بابا.....“

”اسی لئے تو میرے بوڑھے بالوں پر مٹی اچھال رہی ہے۔“

”کھپت! ہوش میں رہو۔۔۔۔۔ باپ کو جوان مٹی کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

گورو کھاتھ کی کتاب سے یہ فقرہ سن کر بوڑھے سنار نے شرم کے مارے اپنا سر جھکا لیا اور بولا۔ ”راج گورو! یہ بات ہے میں نے اسے سننے لاؤ پیار سے پالا ہے۔ اسے دیکھتے ہی مجھے سنار کے مارے دکھ بھول جاتے رہے لیکن آج مجھے میرے پیار کا کیا صلہ مل رہا ہے؟ انکار مزا خا۔۔۔۔۔ اس سے تو اچھا تھا میں بے اولاد رہتا۔ میرے ہارخ میں یہ بھول نہ کھلتا جس کے کانٹے میرے ہاتھوں کو لہلہا کر رہے ہیں۔“

”بابا! تم سمجھ رہے ہو۔ شاید مٹی اپنے باپ کا حق بھول گئی ہے لیکن میں ان بیٹیوں میں سے نہیں جو ماما پاپا کی عزت کے ساتھ کھلتی ہیں۔ اور ان کا حق بھول جاتی ہیں۔ تم چاہو تو اپنے ہاتھ سے مجھے لہو میں غسل دے سکتے ہو۔ مجھے پانی کے تختے پر لٹکا سکتے ہو۔ چٹا میں زندہ ہلا سکتے ہو۔ اگر میری زبان سے شکایت کا ایک لفظ بھی نکل جائے تو میرے منہ پر تھوک دینا۔“

یہ کہہ کر پر تھال نے کانسی کے تھال پر دیا ہوا رومال پرے پھینک دیا۔ راج گورو اور کھپت یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ تھال میں ایک تیز خنجر چمک رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے تھال باب کی طرف بڑھا دیا اور بولی۔

”خنجر حاضر ہے بابا! میں بھی تمہارے سامنے ہوں۔ لٹی ہوئی عزت بچانے کی خاطر غیر ختمد باپ اپراوٹی بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے موت کی بنیند سلا دیا کرتے ہیں۔ تمہارے

ریک اگر میں نے بھی کوئی پاپ کیا ہے تو اپنے ہاتھ سے مجھے سزا دے لو تاکہ لوگ جانیں کہ کھپت سنا آن رکھتا تھا۔ اس نے بیٹی کا بلیڈن دے کر اپنی آن بچائی ہے۔ بیٹی سے زیادہ باپ کی اور کیا سوا کر سکتی ہے؟ بابا خنجر اٹھاؤ، اور میری چھاتی میں اتار دو۔ تمہیں دیکھی کر کے جینا نہیں چاہتی۔“

بوڑھے باپ نے حیرت و استعجاب کے ساتھ بیٹی کی یہ باتیں سنیں۔ کبھی وہ تھاں میں لے جاتے ہوئے خنجر کو دیکھتا اور کبھی پر تھاں کے چہرے پر نگاہ گاڑھ دیتا جو آنکھیں بند کئے بڑے یتیمان کے ساتھ سامنے کھڑی تھیں۔ بیٹی کی یہ جرأت اور سعادت دیکھ کر باپ کے بوڑھے دم پر ایک لکچھی سی طاری ہوئی پھر جیسے اپنا تک دریا کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ لکھپت کے دل میں بیٹی کی محبت کا سویا ہوا چشمہ پھوٹ نکلا۔ اس نے آگے بڑھ کر پر تھاں کو اپنے بچنے کے ساتھ لگا لیا اور اشکوں میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

”بیٹی! باپ کتنا ہی عالم اور کار کیوں نہ ہو۔ اس کا ہاتھ کبھی اپنی بیٹی پر نہیں اٹھ سکتا۔ میں نہیں جانتا تیرے من میں کیا ہے۔ تو کیا چاہتی ہے لیکن آج کے بعد میں تجھ سے کبھی با سوال نہیں کروں گا۔ تیرے جی کو جو بات اچھی لگے وہی کر۔ میں تو صرف تیری خوشیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر تو اسی طرح خوشی ہے تو بھی مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔“

”بابا! تمہاری بیٹی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جو اس کے بوڑھے باپ کے ہاتھ پر ملک کا ٹیکہ بن جائے۔ میں جان دے دوں گی پر تمہاری آن پر حرف نہ آنے دوں گی۔ میں بات کا اطمینان رکھوں۔“

گورو گورکھ ناتھ ایک طرف الگ کھڑا باپ بیٹی کے اس دگدگلاپ کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے لیکن پانی کے یہ شفاف قطرے گنگا جیل سے زیادہ پوتر و زیادہ قیمتی اور زیادہ مؤثر تھے۔ رخساروں پر بہتے ہوئے یہ موتی لبوں کے غمخیزا تے ہوئے کناروں میں جذب ہو رہے تھے۔ راج گورو کے جسم پر ایک لبرزش سی طاری ہوئی۔ اس نے باپ کی شفقت اور بیٹی کے پیار کا ایسا نظارہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا چنانچہ اُسے اپنی بے گناہ اور مقدس بیٹی دوشی کا خیال آیا۔ بیجا نگر کے آشرم کی حسین یاد دہانی، سندرتا، راج اور شکیبت کی راجکمار اور بوڑھے گوروکھ ناتھ کے سینے میں ایک ساتھ یادوں کے کئی خنجر اتر گئے پھر ان کی خشک آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے بیٹی کی

پر قہال جب نکھٹ سے الگ ہوئی تو اس نے دیکھا راج گورو کا گرجا بن بیگ چکا تھا اور اس کے ہونٹوں کے کنارے ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ باب سے ہٹ کر وہ اپنے گورو دیو کے ساتھ آگئی اور بولی ”گورو دیو! آپ بھی مجھے ابھان گئے ہیں۔“

گورو گوروک ناتھ نے اپنے دونوں ہاتھ پر قہال کے سر پر رکھ دیئے اور پکپکائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

”بیٹی! دوشی کے بے گناہ خون کا بدلہ لینے کے لئے میں تجھے بچا نگر کی رانی بنانا چاہتا تھا لیکن تو پوتر ہے۔ گورک کی سوج ہے۔ جتنا کی لہر ہے اور مہاراج دیورائے تیرے پاؤں کی دھول بھی نہیں۔“

پر قہال نے کانسی کے قہال سے چمکدار خنجر اٹھایا اور اسے ہونٹوں سے بوسہ دے کر بولی۔ ”گورو دیو! آپ کے آنسوؤں کی سونگد، دیورائے سے دوشی کے خون کا انتقام ضرور لیا جائے گا۔ پھر کوئی دوشی، کوئی دیورائی، کوئی کنواری بچا نگر کے رنج رنوں میں نہیں لٹ سکے گی۔“ پھر اس نے خنجر گوروک ناتھ کی طرف بڑھا دیا۔ ”میری طرف سے یہ خنجر مہاراج دیورائے کو پیش کیجئے اور کہئے گا۔ یہ خنجر ہی آپ کے سندن لین کا جواب ہے۔“

گوروک ناتھ نے خنجر تمام کر کے اپنی کمر میں اڑا لیا۔ نکھٹ حیران و ششدر کھڑا گوروک ناتھ اور پر قہال کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی کچھ باتیں نہیں آ رہی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان دوشی کے انتقام کا یہ عجیب و غریب عہد آخر کیا راز ہے؟ مگر اس نے اتنا اندازہ ضرور لگا لیا کہ بیاہ کے سندیس کے جواب میں پر قہال کا مہاراج دیورائے کو ایک جبریاں خنجر بھیجتا کسی مصلحت سے خالی نہیں۔

بوڑھا سناں انہیں خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ابے گوروک ناتھ کی آواز سنائی دی۔ وہ نکھٹ سے رنجست کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

بھیشتر یا غرایا

راج رنوں میں مہاراج دیورائے کی آواز گرجتے ہوئے بادلوں کی سی بیت کے

سے نکل کر لوٹ آئی۔ وہ زخمی بھیڑیے کی طرح غراتا ہوا کمرے کے وسط میں تیز قدموں سے چکر کاٹ رہا تھا اس کے ہاتھوں میں وہ چمکدار فنجر تھا جو پر تھاں نے اس کے سٹولس کے جواب میں بھیجا تھا۔

طویل راہداری سے پرے بڑے گیٹ پر کربانگی پیرے داروں نے یہ گر جتی، کڑکتی اور گوشتی ہوئی خوفناک آواز سنی اور سمجھ گئے۔ بہت جلد کوئی نہ کوئی معرکہ ہونے والا ہے کیونکہ جب کبھی دیورائے اپنے راج رنواس میں گر جتا گونجتا تو اس کے فوراً ہی بعد کربانگی سور ماؤں کے دست خاص کو کسی نامعلوم سمت روانگی کا حکم ملتا اور کسی نہ کسی علاقے میں جنگی سکھ بچے نکلتے۔ دیورائے کے مشتعل اور غضب آلود دلچے سے دونوں پیرے دار اسی نتیجے پر پہنچے کہ کوئی نہ کوئی بات مہاراج کی توقع اور امید کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ جس نے ان کے مزاج کو برہم کر دیا ہے اور جب تک کوئی فیصلہ کن معرکہ حالات کو ان کی توقع کے مطابق نہیں دھال دیتا ان کے مزاج کی برہمی دور نہیں ہو سکتی۔

دیورائے غصہ میں اس زور کے ساتھ کڑکا تھا کہ راج محل کی بالکونی میں لٹکا ہوا طوطا بھی سم کر پیچھے میں ٹپک گیا اور اسے ”مہاراج کی جے ہو“ کی گردان بھول گئی تھی۔ غریب پروردہ بھی شاید اپنے مالک کے حراج سے واقف ہو گیا اور جانتا تھا اگر اس موقع پر اس نے چونچ کھولی ”اور مہاراج کی جے ہو“ کا نعرو لگایا تو ممکن ہے مالک اپنا سارا غصہ اسی پر اتارنے کی کوشش کرے اور اس کی مالا کنٹھ دلی گردن مردہ کر اسے پائیں باغ میں پھینک دے یا محل کی کسی بلی کے آگے ڈال دے۔

راج گوردو گورکھ ناتھ کچھ چاپ سر تہواڑ سے اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھے مؤدب کھڑا تھا دیورائے ابھی تک غرار رہا تھا۔ اچانک ٹپکتے ٹپکتے رک گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ ایک مردہ چیتے کے سر پر ٹکایا اور بولا۔

”ایک سار کی لڑکی اتنی بے باک اور گستاخ بھی ہو سکتی ہے؟ ہمیں اس بات پر یقین نہیں آتا۔ گورکھ ناتھ! کیا اس کے لئے یہ عزت کچھ کم تھی کہ ہم اسے اپنی رانی بنانا چاہتے تھے۔ اس کی خانہزہم نے اپنی خاص سواد کی بھیج دی۔ محافظ ہستہ کے سوار ہمزہ گئے اور اس نے ہمارے محل کی زینت بننے سے انکار کر دیا۔ نہیں یہ خنجر بھیج کر اس نے ہماری طاقت اور

غیرت کو لٹکا رہا ہے۔“

خنجر ابھی تک اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ بار بار الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی خیز دھار جیسے اس کے کچے گوشتی ہوئی نکل گئی تھی۔

راج گورو نے ایک ثانیہ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگایا پھر آہستہ سے بولا۔

”میں نے سنا ہے وہ کہیں بھی بیاہ کے لئے تیار نہیں۔ اس کا بوزھا باپ سر پیٹ کے رہ گیا لیکن پرتھال کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا اور مجھے نراش لوٹنا پڑا۔“

”ایک لڑکی کے بیاہ کا سندیس لے کر جانا اور نراش لوٹنا یہ کوئی اجنبی نہیں گورکھ ناتھ! حیرت کی بات تو یہ ہے اس نے ہمارے سندیس کے جواب میں ایک خنجر بھیج دیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہی نا وہ ہماری طاقت کو طاقت نہیں سمجھتی۔ کسی لڑکی نے آج تک ایسی جرات نہ کی ہوگی۔ اپنے بیاہ کے جواب میں موت کا سامان نہ بھیجا ہوگا۔“

دیورائے گرج دہا تھا۔ اس نے ہمارا مذاق اڑایا ہے۔ جب تک اسے اس خطرناک مذاق کا جواب نہیں مل جاتا ہمارا کچھ خطرہ نہیں ہوگا۔ ہم اس گستاخ لڑکی کو زنجیریں پہنا کر اپنے رنوں میں لائیں گے پھر اسے معلوم ہو سکے گا۔ ایک مہراج کے ساتھ خنجر کا مذاق کتنا مہنگا سودا ہے۔“

”تو آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”ہم شیون مار کر اس بستی کو تباہ کر دیں گے جہاں سے ہماری سواری خالی واپس آئی۔“

دیورائے آہستہ آہستہ ٹپکتا ہوا گورکھ ناتھ کے قریب آکھڑا ہوا۔ ”ہم پرتھال کو پابند زنجیر اپنی سواری کے ساتھ دوڑا کر بیجا گرج لائیں گے۔“

گورکھ ناتھ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جیسے وہ مہاراج کے فیصلے پر غور کر رہا ہو۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ سراسر اجتماع اور جذبات کی رو میں بہہ کر کیا گیا تھا اور اس کے نتائج خطرناک صورت میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن دیورائے کے اکثر فیصلے اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ ایک انتہائی جذباتی اور بہت جلد مشتعل ہو جانے والا انسان تھا۔ جس کا ہاتھ اکثر تلوار کے قبضے پر رہتا تھا۔ اس نے ابھی تک پرتھال کی شکل تک نہ دیکھی تھی بس اس کے حسن کی تعریف سن کر اس پر فریفت ہو گیا تھا اور اب اس کے انکار نے دیورائے

کے بدن میں جیسے انگارے بھر دیئے تھے وہ چاہتا تھا جس قدر جلد ہو سکے وہ اس دکنی حسینہ کو اپنے حضور میں دیکھے اور اسے بتائے کہ دیورائے جب کوئی فیصلہ کرتا ہے تو خون کی عیاں بہا کر بھی اس کو پورا کرتا ہے پھر مہاراجہ کے دل میں پرتھالی کے ویدار کا شوق بھی پہلے سے ود چھو ہو گیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ لڑکی کیسی ہے جس نے ایک راجہ کے پیام کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے لیکن راج گورو کو کسی گہری سوچ میں دیکھ کر وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا اور بولا۔

”کیوں گورکھ ناتھ! کیا تمہیں ہمارا فیصلہ پسند نہیں؟“

”پرتھالی کا جرم یقیناً ناقابل معافی ہے۔“

گورکھ ناتھ نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ ”لیکن مہاراج کا فیصلہ غور طلب ہے۔“

”کیا مطلب؟“

دیورائے نے اپنی تیز نگاہیں گورکھ ناتھ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ جانتا تھا بوڑھا ہمیشہ دور کی سوچا کرتا ہے اور واقعات کا صحیح تجزیہ کرنے کے بعد اپنی رائے دینے کا عادی ہے۔ اسی لئے تو اس نے گورکھ ناتھ کو راج گورو ایسے اہم عہدے پر متعین کیا تھا لیکن اس وقت اس کا دماغ اپنے فیصلے کے خلاف کوئی رائے سننا نہیں چاہتا تھا۔ بوڑھے نے پرتھالی کے انکار کا ذکر جان بوجھ کر کچھ اس انداز میں کیا تھا کہ دیورائے مشتعل ہو کر حملہ کا فیصلہ کر دے۔ ظاہر ہے وکن کے علاقہ پر حملہ کرتے کے بعد وہ سلطان فیروز شاہ بخاری کے قہر و غضب سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا اور دیورائے سے انتقام کا آخری ذریعہ اب یہی تھا۔

جنگ!

حملہ کا فیصلہ گورکھ ناتھ کی مرضی کے عین مطابق عمل میں آیا تھا اور وہ خوش تھا کہ عیاش دیورائے کی فکر پر اسے جنگ کے میدان کی طرف گھیر کر لئے جا رہی تھی لیکن راج گورو کی حیثیت سے اس کا فرض تھا۔ وہ مہاراج کو اس فیصلے کے نتائج سے بھی آگاہ کر دے۔ وہ اپنے فرض سے بھی ہیکندوش ہو جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا دیورائے نتائج کی پرواہ نہیں کیا کرتا اور ایک مرتبہ جو فیصلہ اس کی زبان سے الفاظ کا جامہ پہن کر باہر آ جائے وہ کبھی ٹل نہیں سکتا۔

دیورائے بوڑھے کی خاموشی سے تنگ آ گیا۔ وہ بولا۔

”راج گورو! تم کچھ کہنا چاہتے تھے۔“

”مہاراج!“ وہ ہولے ہولے کہنے لگا۔ ”مگل بھی سلطنت کا علاقہ ہے۔ اس پر حملہ

کرنے کا مطلب یہ ہوگا۔ ہم سلطان فیروز شاہ سے جنگ مول لے رہے ہیں۔“

راج گورو کی یہ بات سن کر دیورائے چونک اٹھا جیسے اسے کوئی بھولی بری بات یاد آگئی

ہو۔

”سلطان فیروز شاہ پر ہمارا ایک ادھار باقی ہے۔ ہم چاہتے ہیں اسی بہانے پر اپنا

قرض بھی ادا کر دیا جائے۔ ہم مخلوں میں دیک کر بیٹھنے کی بجائے جنگ کے میدانوں کو زیادہ

پسند کرتے ہیں۔“

گورو کہنا تھا۔ ”مگر کی نگاہوں سے مہاراج کے چہرے کی طرف دیکھا۔ گویا وہ اس

کے فیصلے سے مطمئن تھا پھر بھی ایک الجھن ابھی باقی تھی۔ وہ چاہتا تھا یہ الجھن بھی دور ہو

جائے۔

”مہاراج کو یہ نہیں بھولنا چاہیے۔ اس جنگ کے بعد ہمیں ایک بڑی جنگ لڑنا پڑے

گی۔ سلطان فیروز شاہ کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ بیجا نگر کے ہمارے علاقہ پر چھاپے

مار کر نکل جائیں اور وہ خاموش بیٹھا رہے۔“

”گورو کہنا تھا!“ دیورائے نے اپنے ہاتھ کا تختہ ایک طرف اچھال دیا۔

”دیا۔“ ہم تو خود سلطان سے بچو لڑانے کے لئے بے تاب بیٹھے ہیں۔ ہم اپنی گروں سے

وقت کا وہ جوا اتار پھینکنا چاہتے ہیں جو فیروز شاہ نے چار سال پہلے ہمیں پہنایا تھا۔“

لیکن سرحدی علاقوں کی دیکھ بھال اب بھی سپہ سالار احمد خاں خانخاناں کی بجائے

شہزادہ حسن خاں کے سر دے۔“

”یہ اور بھی اچھا ہے۔“ دیورائے خوشی سے چلا یا۔ ”جوانی ہمیشہ غافل ہوتی ہے۔ شہزادہ

حسن کی غفلت ہماری بددگوار ثابت ہوگی اور ہم کبھی بہادروں کو ناقابل فراموش سبق دے

سکیں گے۔“

”تو بس پھر حملہ کی تیاری کیجئے۔“

”اس مہم میں تم ہمارے ساتھ رہو گے۔“ دیورائے نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ”ہم کل ہی

”مہاراج کی سب سے بڑی بات تھی کہ گوروں نے چلے ہوئے کہا اور دیوارے کو پرنام کر کے روازے کی طرف بڑھا۔“

اجانک بالکونی کی طرف سے باریک آواز سنائی دی۔ ”مہاراج کی جے ہو۔“
یہ طوطے کی آواز تھی۔ جسے سنتے ہی دیورائے کے لیوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی پھر اس
نے خنجر اٹھایا اور اسے سامنے چوٹی دروازے پر دے مارا۔

”پر قتال اسی دروازے سے ہمارے محل میں داخل ہوگی۔“ وہ بیڑا لایا..... پھر نہایت بڑی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اچانک اس کے پاؤں ٹک گئے۔ سامنے راج ماری چھوڑ کا کھڑی تھی۔

”تو مہاراج نے جنگ کا فیصلہ کیا ہے؟“ چدر کا نے پوچھا۔
 ”جی! پر تمہارے بیاد کے جواب میں ہمیں خبر بھیجا ہے۔ ہم صرف اس کا فخر
 زمانے جائیگے۔“

یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا اور چھوڑ کلا دیکھتی ہی رہ گئی۔



4

آتش و خون کے ہنگامے

خون کی ہولی

دیورائے نے سہ گُل کو بہت پرے چھوڑ کر ایک پلایاب جگہ سے دریائے تنگ بھدرا چھوڑ کیا اور اپنے سواروں کا رخ پرتھال کی بستی کی طرف پھیر دیا۔ اس کے گھوڑے پر زنجیریں بھی تنگ رہی تھیں۔ جن میں وہ پرتھال کو باعدہ کرانا چاہتا تھا۔

دیورائے ایک خطرناک ارادہ لئے کر وکن کے سرحد کی مصافحات پر حملہ آور ہوا تھا۔ جانا تھا سلطان فیروز شاہ بھٹی جس کے جادو جلال اور قوت سے پورا ہندوستان لرزتا ہوا تھا۔ ہر آدمی اس حملہ کی خبر سن کر خاموش نہیں رہ سکے گا اور جذبات کی آگ اس کے تہ کو جلا کر رکھ دے گی۔ وہ مشتعل ہو کر یقیناً سامنے آئے گا چنانچہ اس حملہ کو روکنے کے لئے اس نے بیس ہزار فوج دریائے تنگ بھدرا کے اس پار پھیلا دی تھی تاکہ جب بھٹی سو دیورائے کا تعاقب کرتے ہوئے سرحد پر پہنچیں تو انہیں نیزوں اور تیروں کی بارش پر رکھ جائے۔ بیس ہزار کرناگی جانناز پیچھے چھوڑ کر وہ صرف پانچ ہزار سواروں کے ہمراہ مدگل علاقہ میں داخل ہوا تھا اور دیہات کے لوگ اس کی چلتی ہوئی عریاں تلواریں کے خوف سے گار چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کسی بھی طرف جہاں انہیں اپنے پیچھے لپکتی ہوئی بھیاں موت سے پناہ مل سکے۔ دیورائے بستیوں اور گھروں کو نذر آتش کرتا ہوا بڑھ رہا۔

چابی و بربادی..... آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں کی شکل

میں بھاگی چلی آ رہی تھی۔ کرناٹکی خطرہ خون کے چھینٹے اڑاتا ہوا بڑھ رہا تھا اور سارے علاقہ میں دھمکی کے منشاخی انسان دیوانہ وار بھاگے پھر رہے تھے۔

اچانک رونق بیگ نے اپنے گھوڑے کی ٹام کھینچ لی۔ جو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح سرپٹ بھاگا آ رہا تھا۔ رونق بیگ دکن کے ولی عہد حسن خاں کی کمان سے نکلا ہوا ایک تیر ہی تو تھا جسے شہزادے سے پرہیز کی طرف چھوڑا تھا۔ وہ ولی عہد کا خاص پیغام لئے فیروز آباد سے نکلا تھا اور بیہودوں کی مسافت پلوں اور ساحتوں میں طے کرتا حسین و شاداب وادی کے اسی موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں سے ایک رستہ مدگل کی طرف نکلا اور دوسرا گاؤں کو جاتا تھا۔ رونق بیگ اپنی منزل کے میڑھے تریچھے راستے سے آگاہ تھا اس لئے منزل کے قریب پہنچ کر یوں اچانک رک جانا بھینٹا کسی علت سے خالی نہ تھا۔ تو کیا اس نے دیوارے کے خطرے کو دیکھ لیا تھا؟

زرد سورج کا سنہرا تھال مندری افق سے کوئی پانچ نیزے اوپر چمک رہا تھا اور اس کی سرخ کریش وادی کے گھنے درختوں کی شاخوں کے حاشیوں پر جیسے رنگ پھیر رہی تھیں۔ رونق بیگ موڑ کاٹنے ہی والا تھا کہ اسے مدگل کے راستے پر عورتوں، بچوں اور مردوں کا ایک تباہ حال قافلہ دکھائی دیا۔ جو عجیب مراسیگی کی حالت میں بڑھا آ رہا تھا۔ جیسے کوئی بھیاٹک خطرہ اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ ظاہر تھا وہ لوگ کھینچی ہوئی تلواروں سے ڈر کے بھاگے تھے۔

کبھی بکھار جب کرناٹک کے سپاہی سرحدی علاقوں میں لوٹ مار کے لئے نکلتے تھے۔ تو لوگوں کا جینا و بال ہو جاتا تھا اور تباہ و برباد ہو کر وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی طرف بھاگ نکلتے تھے لیکن کچھ عرصہ سے سرحد کی حفاظت کڑی کر دی گئی تھی۔ اس لئے لوٹ مار کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ ان لوگوں پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی؟

یہی بات معلوم کرنے کے لئے رونق بیگ نے اپنے گھوڑے کی ٹام کھینچ لی تھی یا کسی بھیاٹک خطرے کے اجنبان بنے خود بخود اس کے قدم روک لئے تھے۔ اسے ٹھہرے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مصیبت زدہ لوگ قریب آ گئے۔ رونق بیگ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اکثر مردوں کے کپڑے خون آلود تھے۔ ان میں بعض زخموں کی وجہ سے بڑھ چال ہو رہے تھے عورتوں کے چہروں پر مہماری اداایاں کھنڈ رہی تھیں اور وہ بچوں کو اٹھائے خوف کے

مارے کبھی ہوئی تھیں۔ رونق بیگ نے ایک آدمی کو اشارے سے اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ وہ کہاں سے آرہے ہیں اور ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے؟
آدمی جو تباہ حال قافلے کا سردار معلوم ہوتا تھا کہنے لگا۔

”کرنالک کے سوار مدگل کے سارے علاقے میں موت کے فرشتوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں جاہی ان کے ہرکام پلٹی ہے۔ وہ بستیاں بولتے اور خون کے چھینٹے اڑاتے ہوئے بڑھے آرہے ہیں۔ مہاراج دیورائے بہ نفس نفیس ان کی قیادت کر رہا ہے۔ ان کی منزل کا کوئی علم نہیں مگر موت کے دیوتاؤں کا رخ اسی واوی کی طرف ہے۔ سنا ہے دیورائے نکھیت سار کی سندربٹی پر تھال کو حاصل کرنے کے لئے آیا ہے اسی لئے۔ اس نے وریا عبور کرتے ہی جاہی چا دی ہے۔“

یہ خبر سنتے ہی رونق بیگ دم بخود رہ گیا۔

”تو کیا حکم مدگل کو اس حملے کی خبر نہیں ہوئی؟ مرحد کے پیرے دار کہاں مر گئے تھے۔“

”وہ سب کے سب موت کے نگہات اپار دئے گئے۔“

ایک لمحہ خاموش رہ کر رونق بیگ نے پوچھا۔

”تم نے کرنالک کے سواروں کو کہاں چھوڑا تھا؟“

”وہ شام تک اس واوی میں ضرور پہنچ جائیں گے۔ اس وقت وہ دن پور کو لوٹنے میں مصروف ہوں گے۔ انہوں نے سیکڑوں آدمی ہلاک کر دیئے ہیں جو شخص مقابلے کی جرأت کرتا ہے اسے نیزوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے۔“

غروب آفتاب میں صرف نصف پہر باقی رہ گیا تھا اور سورج کی شعاعوں کی تہذیب ہوئے ہوئے نامزد پڑتی جا رہی تھی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ورنہ اگر دیورائے کے وحشی سواروں نے اس واوی کو گھیر لیا تو اس کا بیچ ٹکنا مشکل ہو گا۔ قافلہ آگے گزر چکا تھا اور وہ بیڑھا بھی اپنے ہمراہوں سے جا ملا تھا جس نے حملے کی خبر دی تھی۔ رونق نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور واوی کے پر سچ راستے پر بھولیا جو درختوں کے درمیان سانپ کی مانند بلکھاتا گاؤں تک چلا گیا تھا۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوا سائے بہت طویل ہو گئے تھے اور سورج کی زرد کرنیں

مندرجہ ذیل پر کسی زخمی پرندے کی طرح دم توڑ رہی تھیں۔ چاروں طرف ایک بھگدوسی مچ گئی تھی اور متوقع حملے کے ڈر سے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے ضروری سامان کی گٹھڑیاں باندھ رکھی تھیں اور گاؤں خالی کر رہے تھے۔ بعض لوگ جا چکے تھے اور باقی جا رہے تھے۔ جوں جوں شام کا جھپٹنا بڑھ رہا تھا۔ حملہ کی دہشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگ سراسیمگی کی حالت میں گاؤں چھوڑ رہے تھے۔ کسی کو دوسرے کا ہوش نہ تھا۔ رونق بیک بھگدو اڑھا تاں لکھپت سنا کر حویلی کے سامنے جا پہنچا۔ حویلی اس کے پیچھے سے پہلے ہی خالی ہو چکی تھی اب وہاں خاک اڑ رہی تھی۔ خطرے کی بھگ کان میں پڑتے ہی لکھپت جوان بیٹی کو لے کر نکل گیا تھا۔ اس کے نزدیک دیوارائے کا حملہ غیر متوقع نہیں تھا۔ لکھپت کے دل میں ایک عجیب سی کھد بد ہو رہی تھی۔۔۔ بلکہ جس روز پر قتال نے کرناٹک کے مہاراج کو خنجر کا تختہ بھینجا تھا۔ وہ اسی روز سے خطرے کی دھمک محسوس کر رہا تھا۔ جونہی اس نے سنا کہ بھانگر کے سوار دریائے ٹک بھدرا کو پار کر کے مدگل کے علاقہ میں ٹھس آئے ہیں اس نے رخت سفر باندھ لیا اور کھیا کا کا سے کہہ کر گاؤں میں خطرے کا سگھ بجا دیا۔ وہ جانتا تھا راج خنجر کا جواب سکوار کی وحار سے دے گا۔

رونق بیک سوچ میں پڑ گیا۔ یہ امر اطمینان بخش تھا کہ پر قتال کسی محفوظ مقام پہ پہنچ چکی تھی لیکن دلی عہد کا بیٹا پیچھتا بھی ضروری تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اب اسے کہاں تلاش کرے۔ ادھر خطرہ بڑی تیزی کے ساتھ گاؤں کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔ بیک نے ایک بوڑھے ہنٹ کو دیکھا جو پٹلی بغل میں دبائے ریگتا ہوا چل رہا تھا وہ گھوڑا کد کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”بابا! کیا تم جانتے ہو لکھپت سنا کہاں چلا گیا ہے؟“

بوڑھے ہنٹ نے سفید بھنوں اور اٹھا کر بیک کی طرف دیکھا اور بولا۔

”شاید وہ پھاڑی بیروں میں جا چکا ہے۔ گاؤں پر مصیبت اس کی وجہ سے آئی ہے۔“

ابھی بوڑھے ہنٹ نے اپنا خنجر پورا نہیں کیا تھا کہ شام کے جھپٹے میں ایک ساتھ

سیکڑوں گھوڑوں کی ٹاپیں بلند ہوئیں۔ جنھیں سن کر ہنٹ گھبرا سا گیا اور بوڑھے ہنٹ

تھر تھرانے لگا۔

”شاید وہ آگئے۔“ اور بوڑھا ایک طرف ریگ گیا۔

ٹاپوں کی آواز سن کر اکا دکا لوگ بے تحاشا بھاگ نکلے۔ دیورائے اپنے کرناٹکی سواروں کے ساتھ گاؤں کے سر پر آ گیا تھا۔ بیک نے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اُسے پہاڑی دروں کی طرف سرپٹ چھوڑ دیا اور شام کے دم بخود اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

بیک کو گئے ابھی چند لمحے ہی گزروے تھے کہ سواروں کا ایک دستہ سیلاب کے پھرے ہوئے ریلے کی طرح گاؤں میں گھس آیا اور آن کی آن میں سنسان ٹیلوں میں گھوڑوں کے ہنہانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ سپاہی یہ دیکھ کر خیران رہ گئے۔ ان کے آنے سے پہلے گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ تمام گھروں پر پڑے تھے اور فضا میں گہرا سناٹا ہو چکا تھا جیسے کبھی یہاں انسان آباد ہی نہیں تھے۔ سپاہی گھوڑوں سے اتر کر خالی مکانوں میں گھسنے لگے۔

مہاراج دیورائے اپنے خاص سواروں کے ہمراہ لکھپت سنار کی حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس اطلاع نے اسے بے حد مشتعل کر دیا کہ جس حسین مینا کو قفس میں بند کرنے کے لئے اس نے سپاہی کے شعلے بھڑکائے تھے۔ وہ کسی مظلوم سمت پر داز کر گئی جس کو ہر ناباب اور گل رخسار کی خاطر سزائیں مارتا اور آتش و خون سے کھیلتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ اس نے ”لوٹ کا مال“ بننے سے انکار کر دیا ہے اور اب کتنا تک کا جہانراج شمشیر بلف سنار کی حویلی کے سامنے کھڑا غصے میں پھنکار رہا تھا۔ قہر و غضب کے مارے اس کے جسم میں خون کا دورہ تیز ہو گیا تھا۔ اس نے شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے پندرت گھر کہ ناتھ کی طرف دیکھا جو اس کے پہلو میں حیران و ششدر کھڑا تھا۔

”راج گورو! پر تعالٰیٰ کہاں ہے؟“

دیورائے کے لہجے میں کڑائی ہوئی کھلی کی گونج تھی۔ برہمن اس کی کڑک سن کر سہم گیا اور ڈوبلی ہوئی آواز میں بولا۔

”مہناراج کے جاہ و جلال نے اسے روپوش ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”ہم پر تعالٰیٰ کو پامال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“

اور مہناراج کے حکم پر گھروں کی تلاشی شروع ہو گئی مگر خالی مکانوں میں اب کیا رکھا تھا۔ پھر بھی گاؤں کا کوئی کونہ چھانا گیا۔ گورکھ ناتھ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتا پھرا۔ وہ ڈرتا تھا کہیں پر تعالٰیٰ کج کج کسی مکان میں چھپ کر نہ بیٹھ گئی ہو مگر یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ سارا گاؤں خالی ہو چکا ہے۔۔۔ مہاراج دیورائے کی دوسری

ٹکلت۔ دوسرا صدمہ۔ دوسری ذلت۔ غصہ کے جوش میں اس کے تھکے چھوٹے لگے اور زخمی سانپ کی طرح بل کھا کر اس نے حکم دیا۔
 ”سب مکان لوٹ لو اور گاؤں کو آگ لگا دو۔“

آگ اور خون کے سوائے دیوارے اور کوئی تھلے کر نہیں آیا تھا۔ اس کے حکم پر سب مکان لوٹ لئے گئے۔ اُن اکا دکا مجبور دے بس لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جو بھاگ کر کہیں نہ جاسکے اور اپنے مکانوں میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس ہنگامے سے فارغ ہونے کے بعد گاؤں کو آگ لگا دی گئی۔ مکان دھڑا دھڑ چلتے لگے اور دھوئیں کے سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔

رات کے اندھیرے میں سارا گاؤں جل رہا تھا۔ نہیں دیوارے کے ارمانوں کی اڑھی جل رہی تھی۔ یہ کرناٹک کے ظالم حکمران کے دل کی آگ تھی۔ جس نے غریبوں کے گھر پھونک کر اپنی برباد محبت۔ نہیں اپنی ہوس کا تماشا دیکھا تھا۔ بھڑکتے اور لپکتے ہوئے شعلوں سے آس پاس کا سب علاقہ روشن ہو گیا اور دیوارے اپنے پیچھے چلتے ہوئے شعلے اور دھوئیں کے پیچ وخم کھاتے مرغولے چھوڑ کر اپنے سواروں کے ہمراہ مدھل کی طرف پلٹ گیا۔ دریا پار اترتے ہی اگرچہ اس نے آتش و خون کی ہولی کھیلنا شروع کر دی تھی مگر پرتھال کے گاؤں کے سوا کسی پوری بستی کو آگ کی نذر نہیں کیا گیا تھا۔ یہ گاؤں پورے دو روز تک جلتا اور سلگتا رہا۔

پہلا معرکہ

فولاد جاں نے تڑپ کر تلواریں کے قبضہ پر ہاتھ مارا اور گرج کر بولا۔
 ”دیوارے نے دکن پر حملہ کر کے اپنی موت کو آواز دی ہے۔“
 کرناٹکی سواروں کی ناخست کی خبر نے حاکم مدھل کو سخت مشتعل کر دیا تھا اور جوش غضب سے اس کی آواز تھرا رہی تھی۔

”کیا وہ بھمنی سواروں کے بیڑوں کو بھول گیا ہے۔ جن کے پھل سیدھے کلچوں میں اترتے ہیں۔ بخدا!۔۔۔ کی ہر اس بوند کا حساب دینا پڑے گا۔ جو مدھل کی سرزمین پر گری ہے۔ میری تلوار اس کی۔۔۔ نی پر جھک جائے گی۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



دیورائے کا حملہ اچانک اور غیر متوقع تھا اور ہمیں سرواڑ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس اور صلح کے تمام معاہدے بالائے طاق رکھ کر اپنی تلوار کو یوں بے نیام کرے گا۔ ابھی کچھ روز پہلے اس کے حملہ کی خبر سے مدگل میں بے اطمینانی سی پھیل گئی تھی اور شہزادہ حسن خاں فیروز آباد سے گجرات کی طرح اڑتا ہوا آیا تھا لیکن بیجا نگر کے سوار دریائے ننگ بھدرا کے اس کنارے ہی سے لوٹ گئے تھے۔ انہیں ہمیں علاقہ میں گھسنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ جس سے سمجھ لیا گیا تھا۔ مہاراج دیورائے امن کے معاہدوں کا احترام کرے گا مگر اچانک حملہ اور تاخت و تاراج کی اطلاع سن کر فولاد خاں غم و غصہ میں بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ تیز رفتار قاصد فیروز آباد کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ فولاد خاں نے شہزادہ حسن کو تمام حالات لکھ بھیجے تھے اور خود تین ہزار سپاہیوں کو لے کر دیورائے کا راستہ کاٹنے کے لئے مدگل سے نکل آیا تھا وہ زور و بکتر پہنچے ہوئے تھا اور سر پر فولادی ٹوپی اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ اب وہ خون کی ندیاں بہانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ وہ جب فولادی خوہ پہن کر جنگ کے لئے نکلا اس کے سپاہی سمجھ جاتے اب شکست و فتح کا نہیں۔ زندگی اور موت کا دن پڑے والا ہے اور خاں شادی کی ساجت آن پہنچی ہے۔ فولاد خاں اپنے گھوڑے کی گردن تھپتھپاتے بولا۔

موت کا سفر درپیش ہے۔ دیورائے اگر زندہ لوٹ آئے تو تمہارا سب قرض چکا دوں گا۔ تم نے کئی بار دیورائے کا تعاقب کیا ہے۔ شاید یہ آخری ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ اچانک گھوڑے کی پیٹھ پر ہولیا اور اس کی دھکم دھکیں کے دہلی علاقہ کی طرف موڑ دی جہاں دیورائے آگ اور خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ وہ جانتا تھا دیورائے کے رنکاب میں کرناٹک کے پانچ ہزار سوار ہیں اور تین ہزار سپاہی دریائے ننگ بھدرا کے اس کنارے چھاؤنی ڈالے پڑے ہیں۔ اس کے برعکس فولاد خاں کے ہمراہ صرف تین ہزار جانیاز تھے لیکن جنگ کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے اس نے کبھی فوج کی قلت اور کثرت کو اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ تعداد سے بے پرواہ ہو کر جنگ و جدل کی بازی کھیلتا تھا۔ دیورائے کو بھی خبر مل گئی تھی کہ ہمیں سردار اس کے تعاقب میں چلا آتا ہے۔ وہ پر تھا کہ گاؤں پہنچو گئے کے بعد دایین مڑا اور نہایت تیزی کے ساتھ دریا کی طرف لپکا تاکہ ضرورت کے وقت اپنی پیدل فوج سے مدد لے سکے۔

فولاد خاں گولے کی طرح لہراتا ہوا جب واوی میں پہنچا دیورائے نکل چکا تھا اور آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے بھی اس کے جوش انتقام کی مانند سرد ہوتے جا رہے تھے۔

بھمنی سردار اس کے قدموں کے نشانات پر پیچھے پیچھے چلا۔

واوی سے پلٹتے وقت دیورائے نے ایک اور فعل اختیار کیا۔ اس کے رستے میں جو گھاؤں آیا لوٹ مار کے بعد اسے آگ لگا دی گئی۔ فولاد خاں جلد سے جلد اس کے سر پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ مزید تباہی و بربادی نہ پھیلا سکے۔ اس نے اپنی رفتار پہلے سے بھی تیز کر دی تھی لیکن دیورائے بھی غافل نہیں تھا۔ وہ آندھی کی طرح اڑا جا رہا تھا اور کسی ایسے میدان کی تلاش میں تھا جہاں اطمینان کے ساتھ بھمنی سردار کا مقابلہ کر سکے۔ آخر اس نے اپنی پسند کا میدان ڈھونڈ نکالا اور لشکر کو دو حصوں میں بانٹ کر ایک پہاڑی کے دامن میں ٹھہر گیا۔ فوج کا ایک حصہ اس کی رکاب میں تھا۔ اور دوسرا راج گورو کی سرکردگی میں پہاڑی غاروں میں دھب کر جا بیٹھا تاکہ لڑائی کے وقت اچانک عقب سے نکل کر حملہ کر دے۔

فولاد خاں ماجہ کی جنگی چال سے بے خبر بھگم بھاگ آ رہا تھا۔ اس نے کسی بھی جگہ آرام نہیں کیا کیونکہ جب دشمن کا تعاقب مقصود ہو تو آرام کا خیال پاس بھی نہیں پھٹکتا پھر ایسے دشمن کا تعاقب جو حملہ کرنے میں شیر کی مانند بہادر اور بھاگنے میں لومڑی کی طرح چالاک تھا۔ کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اور بھمنی سردار یہ شان کر نکلا تھا۔ اس مرتبہ وہ دیورائے کو خنجر کر تھیں چلنے سے روکے گا۔ دشمن کا کھوج لگتا ہوا فولاد خاں جب ایک پہاڑی کے دامن میں آیا تو بیورج درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہا تھا اور کرناٹکی سوار پرے ہاتھ سے مقابلہ کے لئے تیار کھڑے تھے۔

یہ میدان دریائے جگہ بھدرا سے قریب ہی تھا اور ضرورت کے وقت راجہ فوراً کمک حاصل کر سکتا تھا۔ فولاد خاں نے نتائج کی پروا کیے بغیر جنگ کے خاتمے پر جوش لگائی اور میدان میں کود پڑا۔ دونوں فوجیں محکم گمٹا ہو گئیں اور دیورائے کو اس کی حماقت کا جواب مل گیا۔ فولاد خاں چاہتا تو اس وقت تک دشمن کو نامہ و پیام میں معذرت رکھ سکتا تھا۔ جب تک فیروز آباد سے کمک نہ آ جاتی لیکن وہ ایک لمحے کا انتظار بھی بے سود سمجھتا تھا۔ ”جو ہو گا سو ہو گا“ یہی سوچ کر وہ جنگ میں اُلٹ گیا۔ اس کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا۔

دیورائے کی سرکوبی۔۔۔ وہ ان بے گناہوں کے جوش انتقام سے پاگل سا ہو رہا تھا جو کرناگی سواروں کی تلوار کا لقمہ بنے تھے اور اب وہ اس وقت تک چین نہیں لے گا۔ جب تک دیورائے اپنی غلطی کا خیاں نہیں بھگت لیتا۔

پہلے ہی حملہ میں بھنی جانباڑوں نے دشمن کو پیچھے دھکیل دیا اور انہیں رگیدتے ہوئے دور تک لے گئے۔۔۔ دیورائے ایک ٹیلہ پر کھڑا جنگ کا نظارہ کر رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے سپاہی دبچے ہوئے میدان کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں تو اس کے اشارے پر ایک سپاہی نے خطرے کا سگھ بجا دیا۔ پہاڑی گھاٹیوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے سوار اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ٹوٹ پڑے اور جیکارے لگاتے بھنی سپاہ کو گھیرے میں لینے لگے۔

فولاد خاں اس اچانک حملہ کے لیے تیار نہ تھا۔ دوسری پہاڑی ترائی کی طرف پسا ہوتے ہوئے کرناگی سوار بھی سنبھل کر دائیں اور بائیں سمتوں میں پھیلنے لگے۔

بیابان ہوشیاری کے ساتھ بھنی فوج کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ ہولے ہولے یہ گھیرا تنگ ہوئے لگا اور فولاد خاں ہواچنے لگا۔ یہ گھیرا موت کے خونیں چکر کی طرح آہستہ آہستہ نزدیک سے نزدیک آ رہا ہے اور ذکر ایسے ابھی نہ توڑا گیا تو ایک بھی جانباڑ زندہ نہیں بچ سکتا گا۔ اس نے میدان جنگ کا بغور جائزہ لیا اور دشمن کا ایک گروہ پہلو بھانپ لیا۔ جسے توڑ کر وہ موت کے اس تنگ دائرے سے باہر نکل سکتے تھے۔

دیورائے خوش تھا اس کی چال سو فیصد ٹھیک بیٹھی تھی اور بھنی سپاہی پوری طرح گھیرے میں آچکے تھے۔ اس نے حکم دیا دشمن کو گھیر کر مار دو۔ ایک بھی سپاہی بچنے نہ پائے۔

فولاد خاں نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ دیورائے اس کے سامنے ایک بلند ٹیلہ پر کھڑا موت کے احکام صادر کر رہا تھا اور وہ اس کے قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اب تو اہم سوال یہ تھا کہ اپنے سواروں کو کھلے بہ لکھ سکتے ہوئے خویش گھیرے سے کس طرح باہر نکالے؟ چھ جانباڑوں کو ساتھ لے کر وہ مردانہ وار دشمن کے کمزور بازو پر حملہ آور ہوا اس نے تمام ساتھیوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور دشمنوں کے گھیرے میں محصور ہو کر لڑنا

موت کو دعوت دیتا تھا۔ مگر وہ گھبرا توڑ کر نکل سکیں تو محفوظ ہو جائیں گے۔ یہی سوچ کر دشمن کو مارتے کانٹے ہوئے وہ اپنے سپہ سالار کے پیچھے لپکے جو جان کی بازی لگا کر کرناٹکی بہادروں کی صف کانٹے میں مصروف تھا۔ اس کی تلوار لہو میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی اور موت کا پیغام لے کر حریفوں کے سروں پر چمک رہی تھی۔ اگرچہ وہ خود بھی زخموں سے چور ہو چکا تھا اور دشمن کا سارا زور اسی پر تھا لیکن ہمکنی سردار موت سے کھیلتا ہوا آخر گھبرا توڑنے میں کامیاب ہو گیا اور موت کے دائرے سے نکل آیا۔ دوسرے سوار بھی اس کے پیچھے تھے۔ اب سنبھل کر لڑنے سے پہلے انہیں کچھ دیر آرام کی ضرورت تھی مگر دیورائے موت کے بھیاٹک دیوتا کی طرح ان کی تاک میں تھا۔ وہ جوش غضب میں بیچ و تاب کھا رہا تھا کہ حریف اس کی چال کو مات دے کر موت کے خطوط سے نکل چکا تھا۔ اب ان کا تعاقب کرنا گویا اپنی جان سے دشمنی کرنے کے مترادف تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے بہادر سپاہیوں کو تعاقب سے باز رکھا اور ہمکنی سواروں کو نکل جانے دیا تاہم وہ اس بات سے سرد رہا کہ پہلے معرکہ میں اسی کا پلہ بھاری رہا۔

لیکن کب تک، ہمکنی سوار جب پلٹ کر آئیں گے تو کرناٹک کے سو رماؤں کے لئے موت کے فرشتے بن جائیں گے۔ وہ مدھل سے لڑنے اور مرنے کا فیصلہ کر کے نکلے تھے۔ دریائے تنگ بھدرا کے کنارے پہاڑی میدان میں بے شمار لاشیں گدھوں اور جنگلی جانوروں کی خوراک بنی پڑی تھیں اور زخمی گھوڑے خوفناک انداز میں ہنہار رہے تھے۔

روزِ دم و بزم

پہلی جھڑپ میں دیورائے جیت گیا تھا۔ فلواد خاں بمشکل تمام موت کے خونی پنجے سے نکل کر بھاگا تھا۔

تیناگر کے سوار اپنی کامیابی پر تازاں تھے لیکن دیورائے کو یہ کامیابی کافی مہنگی پڑی تھی اس کے چھ بہترین سوار ہمکنی تلواروں کا لقمہ بن گئے تھے اور وہ ایک بھوری چٹان پر کھڑا خوجوار بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا۔

”فلواد خاں نکل گیا۔“

جیسے فلواد خاں نہیں، وقت کی کمابن سے زندگی کا تیر نکل گیا تھا۔

سوار بھوری چٹان کے آس پاس اکٹھے ہو رہے تھے۔ دشمنوں کو میدان سے اٹھایا گیا تھا راج گورو نے آگے بڑھ کر مہاراج کو فتح کی مبارک بات دی لیکن دیورائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جیسے وہ کسی اہم فیصلے پر غور کر رہا۔ پھر اس نے سپہ سالار کو حکم دیا کہ مدگل پر حملہ کے لئے گھوڑوں کی باگیں موڑ لو۔ ہم فواد خاں کو جین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔

جسوت رائے کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ اس نے سر اطاعت خم کر دیا لیکن حملے کا حکم سن کر گورو کے ہاتھ جھٹی ہریں کی طرح چونک اٹھا۔

”مہاراج!“

دیورائے نے تیز نگاہوں سے بڑھتے راج گورو کی طرف دیکھا وہ کہہ رہا تھا۔

”ابھی مدگل پر حملے کا وقت نہیں آیا۔ شاید فواد خاں راستے سے لوٹ پڑے۔“ یہ اندیشہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

”میدان سے بھاگنے والے لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔“

راجہ غصے میں اپنی رائے تہمتانے لگا۔ معلوم ہوتا تھا اسے کوئی غیر معمولی فکر کھائے جا رہی ہے۔ اس نے دو تین حربہ سائنس کی چٹان تک چکر کاٹے پھر تیزی کے ساتھ پلٹا اور بولا۔

”بہت بہتر ہم مدگل پر حملہ نہیں کریں گے لیکن پڑاؤ میدان سے اٹھا لو۔ ہمیں گھاٹ سے کچھ اور قریب ہو جانا چاہیے۔“

اُس کا فیصلہ یقیناً عقل مندی پر مبنی تھا۔ جنگی نقطہ نگاہ سے اس کا دریا کے قریب آ جانا ہی بہتر تھا تا کہ اس سپاہ سے تعلق قائم رہے جو دریا کے دوسرے کنارے اس کے حکم کی منتظر تھی۔ پھر اسی وقت پڑاؤ اٹھایا گیا۔ کوچ کا ننگہ بجا اور فوج ایک کھلے میدان میں اتر پڑی جس کے شمال مشرق میں اونچے نیچے ناہمواریوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔

دریا یہاں سے چند میل کے فاصلے پر تھا اور ضرورت کے وقت زیادہ فوج کی مدد با آسانی حاصل کی جاسکتی تھی۔

تیر انداز ناہمواریوں پر پھیلا دیئے گئے اور بخشی سواروں نے دو میل کے علاقہ کو اپنے گہرے میں لے لیا۔ اب کسی بھی طرف سے اچانک حملہ یا شیخوں کا خطرہ نہیں تھا لیکن خطرہ تو ان کے آس پاس ہی رہا۔ موت کی طرح اچانک دبوچ لینے والا

خطرہ۔۔۔

مہلج کا کوہرا اس وقت تک اپنے بل میں نہیں جاسکتا تھا۔ جب تک دشمن کو موت کی واوی میں نہ پہنچا دے یا اسے یہاں سے بھگا نہ دے۔

دیورائے نے صرف ایک عارضی فتح حاصل کی تھی اور اس فتح نے اسے پہلے سے کچھ زیادہ دلیر اور مطمئن کر دیا تھا لیکن کیا اس کے سر پر آسمان کی وہ گردش بھی ختم ہو گئی تھی جو بڑے بڑے بہادروں کو پیش کر رکھتی ہے؟

میدان کے وسط میں مہاراج کا خیمہ نصب تھا۔ جس کے ارد گرد ایک خوبصورت شامیانہ کھڑا کیا گیا تھا اور اس پاس سپاہی لنگی تلواریں لئے کھڑے تھے۔

زرنگار خیمے میں شراب کی صراحی ہولے ہولے خالی ہو رہی تھی اور ایک حسین رنگی جو شاہی رتھ پر سوار محض مہاراج کا دل بہلانے کے لئے ساتھ آئی تھی۔ کیف و سرور میں رقص کے توڑے کاٹ رہی تھی۔ دیورائے روپ ساگر کی لہروں پر ہلکولے کھاربا تھا۔ جو سکت بھی تھا اور حلاطم بھی۔ رنگی اس کے آس پاس ہی چکر کاٹ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس قدر قریب آ جاتی کہ دیورائے اس کی خیمانچھتوں کی چھٹک پر بے خود ہو کر جمجم اٹھتا۔ یہ جھانچھٹیں اس کے دل پر بج رہی تھیں اور اس کا انگ انگ ایک نئی لذت محسوس کرنے لگا تھا۔

”پہلی جیت کا پہلا ناچ۔“

اس کے نکلنے ہونٹ آہستہ آہستہ قہر توڑائے اور اس نے خالی جام نضا میں لہرا دیا۔ نشر کی طلب بڑھ رہی تھی۔ رنگی رقص کا دائرہ فنی ہوئی آگے بڑھی۔ صراحی اٹھائی اور شراب جام میں انڈیل دی پھر جھانچھتوں کی تیز جھٹکار کے ساتھ تیزی کے ساتھ ٹپٹی اور رقص کے دائرے میں ناگن کی طرح جھومنے اور بلن کھانے لگی۔ دیورائے کسی دوسری دنیا کے خواب دیکھ رہا تھا۔

گورے گورے حسین اور نازک پاؤں اچانک رگ جھپے۔ رنگی دم بخود ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ دیورائے نے غصے میں شراب کا پیالہ خیمے کے چوٹی کی سیڑیوں کے ساتھ دے مارا اور خوفناک آواز میں پھنکارا۔

”اسے ہمارے قریب لاؤ۔“

جیسے کے دروازے پر نیرہ مردار سپاہی ایک آدمی کو جکڑے ہوئے نمودار ہوئے جو اپنے لباس سے بھیٹی لشکری نظر آ رہا تھا۔ اس کا سر ڈنڈی تھا اور خون اس کے چہرے پر متعدد لکیریں بناتا ہوا کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کے خون آلود چہرے پر خوف کی بجائے غصہ کے آثار تھے اور وہ ایسی نگاہوں سے دیوارے کو گھور رہا تھا جن میں بجلی کے کوندے لپک رہے تھے۔

آٹھ بھالوں کی چمکدار رابایاں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔

”کون ہے یہ؟“

دیوارے شیر کی طرح گر جا۔

ایک افسر نے آگے بڑھ کر ”مہاراج کی جے ہو“ کا نعرہ لگایا اور بتایا کہ یہ بھیٹی فوج کا ایک خطرناک جاسوس ہے جسے جتنی سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گرفتار کیا ہے۔ گرفتاری سے پہلے اس نے ہمارے کئی سپاہی ڈنڈی کر دیے ہیں۔“

دیوارے غصہ سے کانپنے لگا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے قیدی کی طرف دیکھا اور بولا۔
”یقیناً تم نواز خاں کے خاص سپاہی ہو۔ ہم نے تمہیں اس کے پہلو بہ پہلو لڑتے دیکھا تھا۔ کیا تم انکار کر سکتے ہو؟“

قیدی جیسے کہ وسط میں پہنچ چکا تھا۔ قص کے اس دائرے میں جہاں چند ساعت قبل بیجاگر کی سندرنگی اپنے روپ کے جلوے بکھیر رہی تھی۔ اس نے اپنے لبوں کو جھینٹ نہیں دی بلکہ زبان کا کام لگا ہوں سے لیا۔ آف وہ نگاہیں جو شرارے اُگل رہی تھیں۔

”جواب دو..... کیا نام ہے تمہارا۔“ دیوارے چلایا۔

”شمشیر خاں.....“ قیدی کے لہجے میں بھی تلوار کی کاٹ تھی۔

”شمشیر خاں.....“ مہاراجہ نے حذارت سے یہ نام دہرا دیا۔ پھر کہنے لگا۔

”کیا تم نہیں جانتے۔ ہم ہر اس شخص کو کات بھیکتے ہیں جو ہمارے مقابلے پر اُٹھے۔“

قیدی خاموش رہا۔

”بیجاگر کے قانون میں جاسوسی کرنے والوں کے ساتھ کتوں سے بدتر سلوک کیا جاتا

”جے۔“

”میں جاسوس نہیں۔“

"پھر کون ہو؟"

"صرف اپنی۔"

یہ الفاظ سن کر دیورائے یوں اچھلا جیسے اسے کسی بچھونے ڈس لیا ہو۔ وہ پیچھے ہٹا اور سنبھل کر اس چوٹی تخت پر بیٹھ گیا جس پر خوب صورت کالین بچھا تھا۔

"کیا سندس لے کر آئے ہو؟"

"وکن کی سرزمین سے نکل جاؤ۔ ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہو گا تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔"

قیدی کا انداز گفتگو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں لیکن اس کے جواب میں مہاراجہ کا ایک بھیا تک قہقہہ خیمہ میں گونجا۔

"ہم سب کچھ سوچ کچھ کر آئے ہیں۔ یہ بتاؤ تم نے فواد خاں کو کہاں چھوڑا تھا؟"

"وہ مدگل کے دروازے پر سلطان کی ملک کا انتظار کر رہے ہیں۔"

دیورائے کے لبوں سے پھر بھیا تک ایسی اہل پڑی۔ اس کی آواز خیمہ میں یوں ابھری جیسے موت کے غونی دیوتا سیارہ ہوں۔

"کیا وہ پھر حملہ کی حماقت کرنا چاہتا ہے۔ مہاراجہ کی سوگند! ہماری تلوار اس کا لبو چاٹ کے رہے گی۔ ہم اسے خوفناک سزا دیں گے۔"

خاموش رہو۔ "قیدی دیوانوں کی طرح چلایا۔ "فواد خاں کا لبو چائے والی تلوار ابھی کسی لوہار نے نہیں بنائی۔"

دیورائے خیمہ میں یوں کانپا جیسے ایک شاخ تیز ہوا میں جھول جاتی ہے۔ جوش غضب میں آگے بڑھ کر اس نے تلوار کا دست اپنی کے منہ پر دے مارا اور اس کے دانتوں سے خون چکنے لگا۔

"ہم اس زبان کو تالو سے کھینچ لیا کرتے ہیں۔ جو ہمارا اہمیان کرے۔"

"تمہیں یہ ہاتھ اٹھانا بہت مہنگا پڑے گا۔" شمشیر خاں نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

"قاصدوں پر صرف کمزور اور کم ظرف بادشاہ ہی ہاتھ اٹھایا کرتے ہیں۔"

اس کے دانتوں سے نکلنے والے خون کی سرخ لکیر ٹھوڑی پر بہتی ہوئی گردن تک آگئی تھی۔ رنگی جو نیم عریاں لباس میں ایک طرف دھب سی گئی تھی۔ حیرت پاش نگاہوں سے

اچھی کو دیکھنے لگی..... وہ خیران تھی کیا مہاراج کے سامنے کوئی شخص ایسی مستی بھی کر سکتا ہے؟

اچانک موت کی پراسرار آہٹ کی طرح ایک مست سے ماپوں کی آواز بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی لشکر گاہ میں شور و غل کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ دیوارائے ایک لمحہ آوازوں کی دھمک سننا رہا پھر اس نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ شور کیا ہے؟"

جب راج گورو اندر داخل ہوا تو اس کی پریشان حالت سے صاف ظاہر تھا کہ باہر کوئی خلاف توقع حادثہ رونما ہو گیا ہے۔ وہ بوکھلائے ہوئے لہجہ میں بولا۔

"مہاراج! فولا دھال نے حملہ کر دیا۔"

"فولا دھال.....؟"

دیوارائے کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا..... اس نے سوالیہ نگاہوں سے اچھی کی طرف دیکھا "وہ تو مدغل میں تھا؟"

"اس نے مہاراج کی آواز سن لی ہوگی۔"

اچھی کے لہجے میں بڑی زہریلی تلخ تھی۔ "فولا دھال بکے کان ہر وقت دشمن کی آہٹ پر رہتے ہیں۔"

"تو تم صرف ہمیں دھوکا دینے کے لئے آئے تھے؟"

اچھی کو بھول کر دیوارائے دروازے کی طرف لپکا اور پردہ اٹھا کر باہر آ گیا۔ راج گورو بھی بہن کے ساتھ تھا۔

قرض کی ادائیگی

لشکر گاہ میں بھگدڑ مچ رہی تھی۔ دور اونچے ٹیلوں کے عقب سے کبھی سوار اپنے گھوڑے کداتے اور کرتا کی سپاہیوں کو ماتے کاتے چلے آ رہے تھے۔ سپہ سالار نے اگرچہ خطرے کا سکہ بجا دیا تھا مگر حملہ کچھ ایسا منظم اور اچانک ہوا تھا کہ بعض سپاہی گھوڑوں پر زمین بھی نہ کھن پائے تھے۔

دیوارائے نے یہ منظر دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے موت کی دیوی گھٹن گئی۔

اور خوف کی لہر اس کے بدن میں زخمی سانپ کی مانند رینگنے لگی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے راج گورو کی طرف دیکھا۔

"دشمن چال کھیل گیا ہے راج گورو!"

پنڈت گوروکھ ناتھ نے اس کی آواز کی پکپکپاہٹ سے خطرے کی نوعیت سمجھ لی۔ اب صرف ایک راستہ باقی تھا۔ گھاٹ کی طرف پسپائی۔ اس نے مہاراج کو مشورہ دیا۔

"یہ سوچئے اور افسوس کرنے کا سہ نہیں۔ ابھی وقت ہے گھاٹ کی طرف نکل چلئے۔"

شاید دیورائے خود بھی اس نتیجے پر پہنچا تھا کیونکہ اب پسپائی اور فرار کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ دونوں لپک کر گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ دیورائے نے تلوار کھینچ لی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس طرف بڑھا جہاں کرناٹکی سوار دشمن کی یلغار کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جسوت رائے موت کی بازی لڑ رہا تھا۔ جب اس نے مہاراج اور راج گورو کو بڑھتے دیکھا تو اپنے سپاہیوں کو لٹکانے لگا۔ ہریمت خوردہ سوار پھر سنبھل کر لانے مرنے پر تیار ہو گئے مگر حملہ آوروں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہر اس چیز کو فنا کر دیں گے جو ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرے گی۔ دیورائے کو دیکھ کر انہوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور ایک ساتھ سینکڑوں تلواریں فضا میں بلند ہوئیں جیسے بجلیاں کوئٹہ جاتی ہیں۔۔۔ جیسے آئینے چمکتے ہیں۔۔۔ جیسے موت لپکتی ہے اور بیسیوں کرناٹکی سوار خاک و خون میں تر پنے لگے۔ دیورائے اس بھیانک منظر کی تاب نہ لا سکا اور جلدی سے جسوت رائے کی طرف بڑھا جو ایک زخمی سوار کو سنبھال رہا تھا۔

"جسوت! تم دشمن کو کچھ دیر روکو پھر گھاٹ کی طرف نکل آؤ۔"

یہ حکم دے کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور خیمے کی طرف پلٹا۔ صرف یہی ایک راستہ تھا جو اسے موت کی وادی سے نکال سکتا تھا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بیٹنی سواروں نے عقب کی طرف سے نکل کر یہ راستہ بھی مسدود کر دیا تھا اور موت کے ایک ہزار فرشتے برق آسا تلواریں سوئے ہوئے کرناٹکی سپاہیوں کو موت کے بازو کی طرف ہانک رہے تھے۔ اس دست کی کمان خود فولا دھاں کر رہا تھا۔ وہ زرہ بکتر پہنے ہوئے ہر طرف فولا دی خود اواز دے اور ہاتھ میں برچھا لہرائے سفید گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھا۔

یہ زرہ بکتر، یہ فولا دی خود، یہ خون چاننے والا برچھا۔۔۔۔۔

یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب وہ خون کی مریاں بہانے سے دریغ نہیں کرنے گا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا۔ جب تک فتح یا موت اس کا ہاتھ نہیں روک لیتی۔

فولاد خاں کو اس حالت میں دیکھ کر دیورائے نے اپنے جسم میں سر سے پاؤں تک ایک خشک لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ یقیناً یہ موت کا خوف تھا جو اس کے خون میں سرایت کر رہا تھا۔

وہ بزدل نہیں تھا۔ کرناٹک اور مہجرات کے راجوں اور راجپوت سواروں میں اس کی بہادری ضرب المثل تھی۔۔۔ دیس کے سپاہی اس کے نام کی سوگند اٹھاتے اور یہ جانتے تھے کہ بیجا نگر کا مہاراج جب دشمن پر حملہ کرنے نکلتا ہے تو موت کی کالی دیوی اس کے ہنر کا بچلتی ہے۔ وہ مدت سے سلطان دکن فیروز شاہ بہمنی سے جنگ آزمائی کے سنے دیکھ رہا تھا اس نے بہمنی لشکروں سے کئی معرکے لڑے تھے۔ وہ کرناٹک کے پہلے میں ابھرتے ہوئے اسلامی خطرے کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا تاکہ رائے رایاں کا زور پھر براجنوبی ہند پر لہرانے لگے مگر یہ قسمت کہاں تھی اسے ہر مرتبہ ناکامی ہوئی تھی اور آخری جنگ میں اسے سلطان کا ہانگوار بنا پڑا تھا مگر وہ بزدل نہیں تھا۔ وہ ذلت کا جزا اٹار بھینکا چاہتا تھا۔ وکن کی سرحدوں کو تاخت و تاراج کرنا اس کا سہول بن چکا تھا پھر کون کہہ سکتا ہے۔ وہ موت سے خائف تھا۔

موت دیورائے کی کتاب حیات میں ایک بے معنی سا ورق تھا لیکن فولاد خاں کو آتے دیکھ کر اسے زندگی میں پہلی مرتبہ موت کا خطرہ محسوس ہوا شاید وہ سوچ سکتا اس خطرے سے دوچار ہی نہیں ہوا تھا۔

اس کا زور کار خیمہ جہاں کچھ دیر پہلے بیجا نگر کی سندور رنگی اپنے حسن و شباب کے جادو چکا رہی تھی۔ اس وقت بہمنی سواروں کے گھوڑوں کے سیموں سے پامال ہو چکا تھا پیرے وار موت کا لقمہ بن گئے تھے خون میں نہایا ہوا ایچی شمشیر خاں موت کا سرخ لبادہ اوڑھے فولاد خاں کے گھوڑے سے گھوڑا ملانے چلا آ رہا تھا۔ دیورائے کو دیکھ کر اس نے دور ہی سے اپنا ہر چھاٹھا مین لہرایا اور خفاک آواز میں دھاڑا۔ ”دیورائے“۔

وہ دیورائے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ بہمنی ہوار خونی دیوتاؤں کی طرح اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اب لانے اور مرنے کے سوا دوسرا راستہ ہی کون سا تھا؟ تقدیر نے اس کے ہاتھ کیسا فریب کھینچا تھا۔ چھ دی سہتوں کے اندر شطرنج کی چال کی طرح جیتی۔

ہوئی بازی ہر گئی تھی۔

سوچ بچار کا سہ بیت چکا تھا اس نے راج گھوڑ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور حملہ آوروں کے گھیرے میں ایک خلا دیکھ کر گھوڑا اس طرف سر پٹ ڈال دیا۔ فولاد خاں کے مقابلے سے بہتر تھا کہ وہ بھمنی سوار کی تلوار کا دھم کھا کر نکل جائے۔

گرو دغبار کے بادل لہرائے اور بچا نگر کا مہاراج اپنی سپاہ کو موت کے رحم و کرم پر چھوڑ کر غبار کے بادلوں میں روپوش ہو گیا۔

شمشیر خاں نے دور ہی سے اسے فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور دیورائے کا قرض چکانے کے لئے اس کے پیچھے ہونیا۔

دیورائے ہوا کی طرح اڑا جا رہا تھا۔ جیسے وہ جادو کے کسی کل وار گھوڑے پر سوار ہو۔ تقریباً ایک کوس کا فاصلہ پلک جھپکنے میں طے ہو گیا۔ بھاگتے وقت اس نے بد نصیب سپاہ کی بھی خبر نہ لی جسے وہ بچا نگر سے ساتھ لے کر لانے کے لئے نکلا تھا لیکن سپاہ تو راجہ کے لئے لڑتی مرتی ہے۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ اس وقت خطرے کی سرحد سے بہت دور نکل آیا تھا اور دربا کا گھاٹ تین چار کوس باقی تھا۔ جہاں میں ہزار بہادر اس کے ایک اشارے پر اپنی جانیں لڑا دینے پر تیار بیٹھے تھے لیکن خطرہ تو اس کے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔

جونہی وہ ایک ٹیلے کا موڑ کاٹنے کے لئے مڑا۔ شمشیر خاں نے اپنا گھوڑا بڑھا کر اس کا راستہ کاٹا اور برچھا تھام کر بولا۔

”گھوڑا اردک لاد دیورائے! میں تمہارا قرض لوٹانے آیا ہوں۔“

دیورائے شمشیر خاں کو دیکھ کر بوکھلا اٹھا۔ یقیناً وہ اس وقت لڑنا اور وقت ضائع کرنا نہ چاہتا تھا۔ اگر اس دوران میں خود فولاد خاں اپنے سواروں کو لے کر اس کے سر پر آدھکا۔ تو بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ اس نے اپنی کٹی کو طرح دے کر نکل جانا چاہا۔ وہ گھوڑے کی باگ کھینچتے ہوئے بولا۔

”ہمیں نکل جانے وہ شمشیر خاں! ہم تم سے الگنا نہیں چاہتے۔“

شاید شمشیر خاں کا گھوڑا بھی دشمن کو پہچان گیا تھا۔ وہ پچھلے قدموں پر اچھل کر زور سے نہنایا اور اس کی نہنناہٹ تلواروں کی جھنکار کی طرح خاموش فضا میں گھر گئی۔ شمشیر خاں نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ اس اثنا میں دیورائے نے اپنی گردن سے سفید و شفاف

موتیوں کا قیمتی ہار اتار کر اس کی طرف اچھال دیا۔

”ہمارا راستہ چھوڑ دو۔ یہ رہا تمہارا انعام۔“

اس کے جواب میں شمشیر خاں نے ہاتھ بڑھانے کی بجائے ایک خونک قہقہہ لگایا اور موتیوں کا ہار گھوڑے کے قدموں میں جا گرا۔

”شمشیر خاں انعام لینے کے لئے نہیں۔ انعام دینے کے لئے حاضر ہوا ہے۔“ آف کتا بھیانک مذاق کیا تھا اس نے۔

”ضد نہ کرو شمشیر خاں! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر انعام ٹھوڑا ہے تو تم قیمت بڑھا سکتے ہو۔“

”سپاہی میرے اور موتی نہیں کھایا کرتے مہاراج! وہ تو دشمن کا لہو پی کر زہرہ رہتے ہیں۔“ شمشیر خاں نے پرچھا تو لے ہوئے کہا۔

”اس وقت! ہمیں نکل جاتے دو۔ ہم تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“

دیو رائے کے نیچے میں ہارے ہوئے جوار کی التجا تھی۔

شمشیر خاں کے خون آلود لیوں سے بے اختیار ٹپسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ اس نے حذارت سے دیو رائے کی طرف دیکھا اور بولا۔

”کم طرف بادشاہ سپاہی کا احسان نہیں صرف اس کی تلوار کا۔ کھانا یاد رکھتے ہیں۔ تم نے تو فولاد داخاں کو پیس ڈالنے کی سوغند کھائی تھی۔ اب تمہاری بہادری کیا ہوئی؟“

دیو رائے کا چہرہ ہولے ہولے تہمتانے لگا۔ شمشیر خاں کہہ رہا تھا۔

”شاید تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ میں ملک لے کر آیا ہوں لیکن اطمینان رکھو۔ میں بالکل جہا ہوں۔ تم پر پیچھے سے حملہ نہیں ہوگا۔“

شمشیر خاں کا چہرہ خون کے سیاہی مائل سرخ وجہوں کی وجہ سے بڑا خوف ناک اور بھیانک نظر آ رہا تھا۔ جب وہ ہنستا تو اس کی کھروری کھال پر خون کی بے ترتیب لکیریں سینے اور پھینے لگتی تھیں جن سے اس کے چہرے کی سنگینی دور ہولناکی میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس نے دیو رائے کو لالکار کر کہا۔

”تلوار سنبھالو!“

”شمشیر خاں! کیا تم یہ لڑائی کسی دوسرے وقت پر نہیں اٹھا رکھتے؟“

"میں نہیں جانتا تھا۔ بیجا نگر کا مہاراج اپنے ظرف کی طرح دل کا بھی اتنا ہلکا ہے۔ مجھے تو صرف ایک قرض چکانا ہے اور میں وہ قرض چکائے بغیر نہیں لوٹوں گا۔"

یہ کہہ کر شمشیر خاں نے ہرچھا سنبھالا اور گھوڑے کو دیوارے کی طرف ہانک دیا۔ اب مقابلہ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ دیوارے نے بھی تلوار سنبھالی اور حریف کے حملہ کا انتظار کرنے لگا مگر برچھے سے بھی زیادہ خوفناک شمشیر خاں کے خون آلود چہرے پر دوچمکتی ہوئی آنکھیں تھیں جو بھالے کی نوک دار انہوں کی طرح دیوارے کے سینے میں کھتی جا رہی تھیں۔ شاید یہ خوفناک آنکھیں ہی تھیں جن کی وحشیانہ چمک نے اسے اس قدر راسیمہ کر دیا تھا۔

لوہے سے لوہا ٹکراتے ہی گھوڑوں نے اپنی کتوتیاں بدلنا شروع کر دیں۔ دیوارے نے حریف کا دار تلوار پر روکا۔ وہ کمزوری جس کا چند لمحے قبل اس نے اظہار کیا تھا۔ اب زائل ہو چکی تھی اور اس وقت وہ زخمی سانپ کی طرح گھوڑے کی پیٹھ پر بیچ دتاب کھا رہا تھا۔ جب لڑائی ٹھن ہی گئی تو تلوار کا دار بھرپور پڑنا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے گھوڑے کو ہلکا سا چکر دیا اور شمشیر خاں کے گرد اس طرح گھوما جیسے اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن یہی حریف اس کی کسی حرکت سے غافل نہ تھا۔ جونہی دیوارے کی تلوار فضا میں ابھر کر نیچے آئی۔ شمشیر خاں نے نیچے سے برچھے کا ایسا ہاتھ مارا کہ دیوارے کی تلوار ٹوٹ کر دوڑ جا گری اور اس کے ساتھ ہی برچھے کی نوک اس کے چہرے پر ایک گہری لکیری کھینچتی ہوئی نکل گئی۔ فوراً ہی خون کی تیز دھار بہہ نکلی اور راجہ کا چہرہ لہلہاں ہونے لگا۔ اگر وہ جلد ہی سے اپنا گھوڑا پیچھے نہ بنا لیتا تو شمشیر خاں کا ہرچھا اس کی گردن کاٹ چکا ہوتا۔ اپنے مہاراج کو بے بس اور نہتہ دیکھ کر راج گوردھنے جو ایک طرف چپ چاپ کھڑا لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا اپنی تلوار اس کی طرف پھینک دی۔ جسے اس نے ہوا ہی میں دبوچ لیا۔

شمشیر خاں اپنے دوسرے خوفناک حملہ کے لئے گھوڑا کندانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چیتے کی سی وحشیانہ چمک پیدا ہوئی۔ شاید حریف کے چہرے پر خون کی لہجی ہوئی لکیر نے اسے بے رحم بنا دیا تھا لیکن دیوارے کے نزدیک ایک ایسے انسان سے مقابلہ کرنا بے سود تھا جو اس کا خون پینے کی قسم کھا کر تائب میں نکلا تھا۔

لبو کی بوندیں لب لب اس کے سینے پر گر رہی تھیں۔ برچھے کا زخم اگرچہ کاری نہیں تھا

مگر ایک ہی وار نے اس کے چہرے کو خون کا غسل دے ڈالا تھا اور اب وہ اس فکر میں تھی کہ شمشیر خاں کے دوسرے حملے سے پہلے ہی کسی سمت کو بھاگ نکلے اچانک اس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور گھاٹ کی طرف نکل گیا اُسے بھاگتے دیکھ کر راج گورو نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے پیچھے ہولیا۔ شمشیر خاں نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔ صرف بھاگتے ہوئے حریف کو بلند آواز سے پیغام دیا۔

”دیورائے! یہ منت بھولنا میں اپنا قرض ادا کر چکا ہوں۔“

پہاڑی ٹیلوں میں اس کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔ مگر دیورائے نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز دور دور دور ہوتی ہوئی آخر خاموشیوں میں ڈوب گئی۔ ٹیلے کی ترائی میں شمشیر خاں نے بھی گھوڑے کی باگ موڑی اور واپس ہولیا۔



حبیبی

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

شب خون

کی اڑان

کناٹکی سوراخوں میں صرف گنتی کے چند خوش نصیب اپنی جان بچا کر بھاگ گئے
یا تو لڑائی میں مارے گئے یا زندہ گرفتار ہوئے۔
دیورائے کوئٹہ کی حالت کا جواب مل گیا۔

صبح اور تاہوار میدان میں یہاں وہاں لاشیں یوں بکھری پڑی تھیں جیسے مٹی کے
تودے اُبھر آئے ہوں۔ وہ سب کے سب اپنے مہاراج کی خونیں ہوس کا لقمہ بنے
اور اس ویران میدان میں اب کوئی ان کی سب کفن لاشوں پر رونے اور ماتم کرنے والا
نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا جو ان پر دو آنسو بھی بہاتا اور پوچھتا کہ موت کی دیوی نے تمہیں
یوں دیوبھج لیا؟ زندگی تم سے کیوں روٹھ گئی؟ تمہارے بعد تمہاری اولاد تمہاری ستی
تربیاں، جوان بھینٹیں اور بوڑھی مائیں جو دروازوں کے پٹ کھولے تمہاری راہ دیکھ رہی
تھیں گی۔ اب تمہیں کہاں سے وضو کر لائیں گی؟ جب بیٹا مگر میں یہ خبر پہنچے گی کہ کرناٹک
تین ہزار سوراخ میدان جنگ میں کھیت رہے ہیں اور حریف کے گھوڑوں سے ان کی
سواروں کو اپنے ہموں سے پھیل ڈالا ہے تو کتنے گھروں سے دردناک چیخیں بلند ہوں گی کتنے
توں میں موت کا سیاہ ہواگا۔ کتنی لڑائیں اپنے بال بچ لیں گی اور ان کی ماتم کا سندور
جائے گا لیکن بیٹا مگر کا ظالم حکمران اپنے راج رتوان میں بیٹھا کسی حسین رنگی یا اشہم کی
کا گناہ دیورائی کے گھوڑے گوزے ہاتھوں سے دارو کا پیالہ پی رہا ہو گا تاکہ وہ شکست کا

صدمہ بھول جائے۔

دیورائے کی حاقق کی سزا اس کے سپاہیوں نے بھیجی تھی۔ کتنی خوفناک اور ہمایاں
سزا بھگتی سواروں کے نیزے اُن کے گردوں کو چیر کر پار نکل گئے تھے اور گھوڑوں کے سسوں
سے روکری ہوئی لاشوں کی صورتیں تک مسخ ہو چکی تھیں۔

اُن کا بہادر سپہ سالار جسونت راؤ زخمی حالت میں گرفتار ہوا تھا۔ اس نے فولاد خاں
کے برہمنے کا زخم کھایا تھا جو زہر بکتر کا کاٹا ہوا اس کے شانے میں اتر گیا تھا۔ بچاگر کا زہر
پھیرا جس پر جنگی سوز کا نشان تھا۔ خاک و خون میں لتھڑا پڑا تھا اور بے سوار گھوڑے ایک
طرف گھیر لئے گئے تھے جن کے ہنہانے کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

فولاد خاں میدان کے وسط میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں کچھ دیر پہلے مہاراج کا شاعری
خیمہ نصب تھا۔ اب وہاں بھٹی علم لہرا رہا تھا۔ اور فولاد خاں اس کے نیچے کھڑا اپنے سپاہیوں
کی فہرست دیکھ رہا تھا، جو لڑائی میں کام آئے تھے اُن کی تعداد ستر سے زیادہ نہیں تھی مگر فولاد
خاں کو اُن جانفروشیوں کی موت کا بڑا قلق تھا وہ ظلم و بربریت کے خلاف لڑتے ہوئے شہید
ہوئے تھے۔

شمشیر خاں خود بھی زخموں کی شدت سے بڑھ چلا ہوا تھا۔ اس کے سر سے دو پیالے
خون بہ چکا تھا اور چہرے پر زردیاں سی کھنڈ رہی تھیں۔ فولاد خاں نے فوراً اس کی مرہم پٹی
کا حکم دیا۔ وہ شمشیر خاں ایسے بہادروں پر جان قربان کر سکتا تھا۔ جو موت کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر سکراتے تھے پھر اس نے بتایا کہ ہم اُسی میدان میں پڑاؤ کریں گے گھاٹ
یہاں سے تین چار کوس کے فاصلے پر تھا اور دریا کے اُس پار ”زرد خطرہ“ پر پھیلانے لکھڑا تھا
بھگتی سردار اس وقت تک چھین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا جب تک خطرہ بالکل نیست و نابود نہ ہو
جائیے۔

کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ہارا ہوا دشمن رات کے اندھیرے میں دریا عبور کر کے اپنی
ٹکست کا بدلہ لینے کے لئے پھر سرحدی بستیوں پر ٹوٹ پڑے؟

فولاد خاں اب کوئی خطرہ بول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے دیورائے کے بچ نکلنے کا بے
حد افسوس تھا۔ اگرچہ میدان میں تین ہزار کرناٹکی سواروں کی لاشیں ابدی خاموشی کی زبان
سے اپنے مہاراج کی آشاؤں کا نوحہ پڑھ رہی تھیں اور اب بظاہر کسی سے جھلے کا اندیشہ بھی

نہیں تھا۔ مگر فواد خاں اس کی فتنہ جو عادات سے غافل نہیں تھا۔ جو بار بار اسے دکن کی سرزمین میں قتل و غارت گری پر ابھارتی رہتی تھی۔

شہداء کو دفن کرنے کے بعد دشمن کی لاشیں گڑھے کھود کر دبا دی گئیں۔ طلایہ گردستہ گھاٹ کے قرب دجوار تک چکر کاٹنے لگا۔ سپاہیوں کو آرام کرنے کا موقع ضرور مل گیا مگر انہیں ہتھیار کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ فواد خاں نے خود بھی زور بکتر نہیں اتارا تھا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ جنگ جاری ہے اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک تقدیر دیو دے کے لبو سے فتح نامہ تحریر نہیں کرتی۔

رات ابھی اپنے آشیانہ فلک سے نہیں اترتی تھی۔ صرف میالے اندھیرے ریگتے لگے تھے کہ اچانک فیروز آباد کی سمت سے گرد و غبار کے بادل نمودار ہوئے۔ صرف ایک اشارے پر سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنی سناٹیں اور تلواریں سنبھالے تیار کھڑے تھے۔ فواد خاں بھی اپنی پرچم سنبھالے خود فوج کے آگے موجود تھا۔

غبار کا دھن چاک ہوا اور کئی سوار گھوڑے وہڑاتے نظر آئے۔ انہیں دیکھتے ہی فوج نے غلغلہ انداز غرہ بلند کیا۔ سوار قریب آتے تو پتہ چلا شہزادہ حسن خاں خود فوج لئے آیا ہے اور یہ اس کے دست ہرادل کے سپاہی تھے۔ ولی عہد کی آمد کی خبر زندگی کی ایک سرت بخش لہر بن کر دوڑ گئی۔ جنگ کی کوفت سے مرجھائے ہوئے کھردرے چہرے اللہ صحرا کی طرح کھل اٹھے۔

دیو دے کے جملے کی خبر سنتے ہی شہزادہ حسن نے گھوڑے کی باگ موڑ لی تھی۔ اس نے کوچ میں ایک پلی کی کوتاہی بھی نہیں کی تھی اور گولے کی مانند اڑتا آیا تھا۔ وہ اس مرتبہ خود دیو دے کی بابت ایک خطرناک، بھیاںک اور تباہ کن عزم کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ بیجا نگر کا لیرا اس کی محبوبہ کو لوٹنے اور گرفتار کرنے کا ارادہ لے کر مدیگن پر حملہ آور ہو۔ شاداب بستیوں کو تاخت و تاراج کرے۔ گاؤں کے گاؤں پھونٹیں پٹا جائے۔ بے گناہوں کے خون کے چھینٹے اڑائے اور ہر اس شے کو تباہ و برباد کر دے جسے زندگی سے کوئی واسطہ ہو اور وہ خود فیروز آباد کی ٹکسرا میں آرام کی غیند ہو سکے؟

کاگ ایکٹ باز کی کوچ پر چھینٹے کی جسارت کرے اور باز اپنی شکاری اڑائیں بھولی کر کسی چٹان کے گوشہ میں ڈبک جائے؟

ایک کسان کا تیار کھیت بھڑکتے ہوئے شعلوں کی مژدہ کر دیا جائے اور وہ کھیت کی منڈیر پر بیٹھا مہار کی تائیں اڑائے؟

پر تھاں کی خاطر حملہ۔۔۔ بس یہ خبر سن کر دیوانہ کر دینے کے لئے کافی تھی غیرت عشق نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا وہ چاہتا تھا۔ ان آنکھوں کو آگ کی مانند دہکتی ہوئی سلاخوں سے پھوڑ دے جو اس کی محبوبہ کی طرف اٹھتی ہیں ان لشکروں کو موت کی داوی میں دھکیل دے جو پر تھاں کے گاؤں پر حملہ آور ہوئے تھے دکن کا شہزادہ اتنی طاقت ضرور رکھتا تھا کہ وہ دیورائے کو اس کی گستاخی کی سزا دے سکے اس کی کھائی کو مروڑ دے اس کے ناپاک بیٹے میں ایک تیز تر از کر دے جس کے اندر ایک ہوس آلود دل دھڑک رہا تھا۔

دیورائے نے یقیناً اپنی موت کو آواز دی تھی ہمہی خون دشمن کی ہر خطا معاف کر سکتا تھا لیکن اپنے وطن کی دو شیرہ پر۔۔۔ اپنی عزت اور غیرت پر ہاتھ اٹھانے کا جرم کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔

دیورائے کا جرم اب زندگی کی آخری ہنگی تک اس کا تعاقب کرے گا کیونکہ ہمہی شہزادہ غیرت عشق کا جوش کھیا کر محل سے نکلا تھا۔ اس نے بکوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی۔

”اب دیورائے کا بدلہ چکائے بغیر فیروز آباد میں قدم نہیں رکھوں گا۔“

کاش، بیجا نگر کے مہاراج نے ہمہی غیرت کا اندازہ لگایا ہوتا۔

شہزادہ پانچ ہزار سرفروشن کو لے کر چلا تھا۔ آنے والے سواروں نے بتایا تھا وہ اس قدر مشتعل ہے کہ پہلے اس کے چہرے پر غصہ کی ایسی قبر آلودہ کن کبھی نہیں دیکھی گئی فولاد خاں نے اگرچہ دشمن کو سانپ کی مانند کچل کر رکھ دیا تھا اور خود مہاراجہ بھی بمشکل اپنی جان بچا کر نکلا تھا پھر بھی دلی عہد کی قسم کا ذکر سن کر وہ ہڑا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہمہی شہزادے جو کہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔

دلی عہد کے استقبال کے لئے اس نے فوج کو شاہی آداب کے مطابق آراستہ کیا اور افروں کو درجہ بدرجہ جگہ دی۔ پرچم اس نے خود منجھال رکھا تھا۔ یہ ان بات کی علامت تھی کہ ابھی اس نے جنگ سے متنبہ نہیں ہوا۔

شام کے اندھیرے آہستہ آہستہ گہرے ہو چکے تھے اور قطار در قطار دور تک پھیلے

سواران اعدا ہروں میں تاریک دھبوں کی طرح ہلتے چلتے نظر آتے تھے۔
 فولاد خاں کے حکم پر پندرہ بیس سواروں نے بڑی بڑی مشطیں روشن کر لیں اور انہیں
 دلوں پر چڑھا لیا۔ سوار اور گھوڑے الٹی زرد روشنی میں نہا سے گئے۔ ان کے زور بکتروں،
 ادی گویوں، نیزوں، برچھوں اور تلواریں پر شعاعیں تھر تھرائے لگیں۔ چند گھوڑے
 تارے۔۔۔ اور دور جھاڑیوں کے جھنڈ میں گیدڑوں کی ہوا تک سنائی دی۔ پھر نضا پر خاموشی
 مچی۔ اس خاموشی میں شاہی فوج کے گھوڑوں کی ٹاپیں ابھریں اور ان کی آواز بدرتج
 ہوتی چلی گئی۔

دلی عہد کی سواری قریب دیکھ کر سپاہیوں نے ایک مرتبہ پھر نعرہ لگایا ”اللہ اکبر“ کی
 شگاف آواز سے نضا گونج اٹھی اور فولاد خاں نے گھوڑا ایڑھا کر شہزادے کا خیر مقدم
 کیا۔ فولاد خاں یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ کہ نوجوان شہزادہ لوہے کا لباس پہن کر نکلا
 اور رفتی بیگ کے ساتھ دوسرے خاص افسر بھی لوہے میں غرق تھے۔

تو اس کا مطلب ہے۔ سپاہیوں کی زبانی اس نے جو کچھ سنا تھا وہ حرف بحرف
 سچ تھا اور دلی عہد دیورائے سے نہیں موت سے نبرد آزما ہونے کے لئے آیا تھا۔ اس
 و عصب میں پانچ ہزار منتخب جانناز ہتھیاروں سے لیس تھے۔

گھوڑے کی لگام کھینچتے ہی اس نے سب سے پہلے دیورائے کے متعلق سوال کیا۔

”میں بیجا نگر کے بد بخت راجہ کے سوا دوسری کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔“

فولاد خاں نے مختصر الفاظ میں دونوں جھڑپوں کی روداد سنائی۔

”اُس کے تین ہزار سپاہی گڑھوں میں دفن کر دیے گئے ہیں۔“

”لیکن وہ خود بھاگ نکلا۔“ شہزادے کے تلخ لہجہ میں غصہ، نفرت و حقارت کی
 کاریاں سی اڑیں، مشطوں کی روشنی میں فولاد خاں نے اس کے چہرے پر موت کے سبائے
 چتے ہوئے دیکھ لئے۔

”تم نے اس کا تعاقب کیوں نہیں کیا؟“

”بشمیر خاں نے اُس کا پیچھا کیا تھا۔ وہ میرے کادھم کھا کر فرار ہو گیا۔“

فولاد خاں نے شہزادے کا غصہ بدھم کرنے کی خاطر وضاحت کی ”لیکن اس کے
 رول کو بھانسنے کا موقع نہیں دیا گیا۔“

”ہم صرف دیورائے کا سراپا ٹھوکروں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”ابھی وہ دریا کے اس پار ہوگا۔ بھاگ کر کہاں جائے گا؟“

”دریا کے اس پار۔“ شہزادہ بدستور اسی چلتے ہوئے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ جو تلواریں

کی مانند تیز تھا۔ ”دیورائے کا سر کاٹنے کے لئے ہمیں دریا پار کرنا ہوگا۔“

نولاد خاں نے سر اطاعت جھکا دیا۔

”خانہ زاد صرف اشارے کا خطر ہے میں نے ابھی تک سپاہیوں کو ہتھیار کھولنے کی

اجازت نہیں دی۔“

”تو بس ٹھیک ہے ہم آج ہی رات دریا عبور کریں گے۔ مشطیں گل کر دو اور آسمے

بڑھو، دیورائے کو اپنے زخم پر مرہم لگانے کی فرصت بھی نہیں ملنی چاہیے۔“

دلی عہد کی بات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ سلطان معظم سے جنگ کے اقدام کے لئے کر

آیا ہے اور اب دیورائے کی موت دکن میں نہیں اس کے اپنے دیس میں ہوگی۔

نولاد خاں فوج کو بردارگی کا حکم دینے کے لیے مڑا ہی تھا کہ شہزادے نے اُسے روک

لیا۔

”شہزادہ نولاد خاں! مشطیں گل کرنے کی ضرورت نہیں۔ دشمن کو دھوکہ دینے کے لئے

انہیں ہمیں جتا رہے دو۔ فوج کا ایک دستہ یہاں رہے گا تاکہ دشمنوں کی نگہداشت کر سکے۔

باقی فوج ہمارے ساتھ کوچ کرے گی اور رات کے اندھیرے میں ہم دریا پار کر چکے۔“

نولاد خاں نے اس تجویز سے اتفاق ہی نہیں کیا بلکہ اُسے شہزادے کی جنگی قابلیت پر

دشک سا آگیا۔ دریا کے اُس کنارے سے دیورائے کی نگاہیں تمام رات بھر اس میدان

پر لگی رہیں گی جہاں اس نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔ جہاں تلواریں خون میں ڈوب ڈوب کر

ابھرنی تھیں جہاں اس کے تین ہزار سوار سپاہی موت کا داردہ پی کر ہمیشہ کی گہری نیند سو چکے

تھے۔ اس کی نگاہوں کو دھوکہ دینے اور حملے سے بے خبر کرکے کے لئے اس قتل گاہ میں

مشطوں کا روشن رہنا کتنا ضروری تھا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ سپاہ پڑاؤ ڈال چکی ہے۔

چند ہی لمحوں کے اندر دشمنوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے ایک دستہ متعین کر دیا

گیا۔ سپاہیوں کو ہدایت کر دی گئی کہ مشطوں کے علاوہ وہ الاؤ بھی روشن کریں تاکہ آگ کی

روشنی دور ہی سے نظر آسکے۔ جسے دیکھ کر دیورائے کے زخمی سینے میں بھی الاؤ دھک اٹھیں۔

تعاقب

شہزادہ دیورائے کے قتل کا عزم لے کر آیا تھا مگر دشمن کی سرزمین پر اترنے سے پہلے وہ ایک مرتبہ پر تھاں سے ضرور ملنا چاہتا تھا۔ اس کی پیاسی نگاہیں اپنی گل ابرام محبوبہ کے چہرے پر بکھرنے اور خشن یار کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں جس کے عشق کی غیرت نے اُسے دیورائے کے قتل پر اکسایا تھا اور ظاہر ہے وہ اس ارادہ کو پورا کرنے بغیر لوٹنے والا نہیں تھا۔ مگر ایک سار کی لڑکی نے شخص اُس کے پیار کی خاطر بیجا مکر کے مہاراجہ کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا تو کیا وہ کن کا ولی عہد ہو کر اُس کی توہین کا انتقام بھی نہیں لے سکتا؟ محبت کے لئے اُسے خون کے دریا میں کودنا ہی تھا اور نتیجہ جو ہو سو ہو۔ اسی لئے وہ پر تھاں سے ملنے۔ اُسے دیکھنے اور اُس سے دو باتیں کرنے کے لئے بے قرار تھا لیکن بے رحم وقت نے اُسے مہلت ہی کب دی تھی کہ اُس سے ملاقات کر سکے۔ رونق بیگ کی زبانی اُسے جو حالات معلوم ہوئے تھے۔ وہ بڑے الم انگیز اور دردناک تھے، موت کے ڈر سے پورا گاؤں پہاڑی دروں میں ڈھکا پڑا تھا جیسے بھیڑ بکریوں کو کسی باڑے میں جمع کر دیا جائے اور کیا معلوم ان قیامت خیز دنوں میں اُن لوگوں کو کھانے کے لئے بھی کچھ میسر آیا تھا یا نہیں؟

اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے دماغ میں لپک گیا اُس نے رونق بیگ کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ اپنے سواروں کو لے کر اُن پہاڑی دروں کا رخ کرے جہاں تکھپت ستار اپنی ”جوان پونجی“ کو لے کر چنپا بیٹھا ہے۔ وہ انہیں بتائے کہ ہمیں تو جیس دیورائے کی سرکوبی کے لئے پہنچ گئی ہیں اور اب مدخل میں کسی جگہ کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ لوگ پہاڑی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئیں اور حسب معمول زندگی بسر کریں۔

رونق بیگ کو اُس نے یہ ہدایت بھی کی۔ وہ پر تھاں اور اس باپ کو اپنے ساتھ لے آئے اور واپسی پر اسی میدان میں قیام کرے، اطلاع ملنے ہی میں کچھ دیر کے لئے آؤں گا اور ان سے ملوں گا۔

رونق بیگ یہ خوشخبری بھی ساتھ لے جا رہا تھا کہ تباہ شدہ گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے شاہنشاہ خزانہ سے روپیہ دیا جائے گا اور سب لوگوں کے انتخابات سلطانہ عالی پور سے

یہ ملاقات کا ایک بہانہ بھی تھا اور ان کی تسلی اور دل دہی کا ایک ذریعہ جو دیورائے کے وحشی اربابوں کو بھونک کر خود بھی انتقام کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

ادھر مدتی بیک اپنے سواروں کو لے کر پیمازی دروں کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر شہزادہ کی سرکردگی میں فوج دریا کی طرف بڑھی لیکن اس گھاٹ پر پہنچنے کے لئے جہاں دریا پایاب تھا اُسے کئی کوس کا چکر کاٹنا تھا۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ دشمن کو اس کی آمد کی خبر نہ ہونے پائے اور وہ اچانک ان کے سر پر پہنچ کر موت کا ٹھل بھاوے۔

رات کے اندھیروں میں فوج سیدھا راستہ چھوڑ کر اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان پایاب گھاٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ راہبر آگے آگے راستے کی نشاندہی کرتے جا رہے تھے اور گہری تاریکی میں ان کی نگاہیں چھتے کی سی تیزی اور ہوشیاری کے ساتھ مڑی مڑی پگ ڈنڈی پر دوڑ رہی تھیں۔

گھوڑوں کی رفتار مذہم تھی اور سفر خاموشی کے ساتھ جاری تھا۔ فولاد خاں شہزادہ کے پہلو پہ پہلو چل رہا تھا۔ یہ دونوں سب سے آگے تھے اور راہبروں کے اشارے پر بڑی احتیاط سے گھوڑے بڑھائے جا رہے تھے۔ جت جانتے تھے وہ ایک خطرناک مہم سر کرنے جا رہے ہیں دشمن کی سر زمین پر اپنے سے تین گنا زیادہ فوج سے لڑنے کا فیصلہ یقیناً خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن اس مہم کی کمان خود ولی عہد کر رہا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے شہزادہ کوئی غلط فیصلہ کرنے کا عادی نہیں، وہ جنگ کی گھات کو سمجھتا ہے اور اپنی سپاہ کو صرف اسی وقت لڑائی کی آگ میں جھونکتا ہے جب کامیابی یقینی ہو آٹھ فوکوس کا چکر کاٹ کر آدھی رات کے قریب فوج گھاٹ پر آ گئی۔

دریائے تنگ مسجد راوکن اور بیٹا نگر کے درمیان کوہستانی ندی کی طرح بچ دھم کھاتا ہوا بہتا تھا اور دونوں سلطنتوں میں پانی کی نیلی تل کھاتی ہوئی لکیر حد فاصل تھی دریا کا پاٹ کچھ زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن پایاب جگہوں پر جہاں پانی کی روانی کا زور کم تھا اور پاٹ کافی دور تک پھیل جاتا تھا۔

ساحل کے ساتھ ساتھ جہازوں اور سرکنڈوں کا ایک طویل سلسلہ تھا کہیں کہیں چھتری دار درخت بھی تھے نور رات کے اندھیرے میں کالے بکھوئے دیو نظر آ رہے تھے اور جب ہوا

سے ان کی شاخیں جھومتی تھیں تو یوں لگتا تھا جیسے سیاہ خام بھوتے تاج رہے ہوں۔ گھاٹ سے تقریباً نصف فرسنگ کے فاصلہ پر کھینے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک ذخیرہ بھی تھا جو کانٹوں اور تنک چلا گیا تھا۔ یہ ذخیرہ گیدڑوں کا مسکن تھا۔ جنگلی سؤر اور کبھی کبھار بھیڑیے بھی سیرا لینے کے لئے اُھر آ نکلتے تھے۔

گیدڑوں کی ہوا تک دور ہی سے سنا کی وچتی تھی۔ شاید ”پدرم سلطان بوڑ“ کا نعرہ لگا رہے تھے لیکن انسانوں اور گھوڑوں کو دیکھ کر وہ خاموشی سے دب گئے اور جھاڑیوں میں سے اپنی تھو تھنیاں نکال کر گھاٹ کی طرف دیکھنے لگے۔

ماہر پانی میں اتر گئے اُھر اُھر چل پھر کر انہوں نے پیاب جبکہ کاتھن کیا پھر شہزادہ نے سب سے پہلے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ ولی عہد کی اس جرأت نے سپاہیوں کو ہر خطرہ سے بے پروا کر دیا۔ وہ بھی دیوانہ وار دریا میں کود پڑے۔

ہوا کے سرد جھونکوں سے بعض سواروں کے دانت بجنے لگے ایک تو سریلوں کا زمانہ دوسرے دریا کی سفر لیکن ان کے سینوں کے اندر دل انگاروں کی طرح دھک رہے تھے۔ پانی یہاں کم گہرا تھا۔ بہاؤ بھی خیز نہیں تھا اور لہروں کے تصور بھی خطرناک نہیں تھے گھوڑے لہروں کو کاٹتے ہوئے بڑھے اور گھاٹ کی خاموش غصا ”خروپ خروپ“ کی آوازوں سے بیدار ہو گئی۔ کبھی کبھی کسی گھوڑے کی شہناہٹ کی گھنٹیاں ہی بج اُٹھتیں۔

سیاہ رات میں ستارے جگنوؤں کی طرح ٹٹٹھا رہے تھے اور دریا کی لہروں پر ان کے تھر تھراتے ہوئے عکس یوں رقص کر رہے تھے جیسے سطح آب سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں جیسے دریا کو آگ لگ رہی ہو لیکن جب ایک ساتھ متعدد گھوڑے پانی کو کاٹنے لگے تو لہروں کے ارتعاش کے ساتھ روشنی کے دیے تیز تھر تھرائیوں میں چکڑے لکھاتے ہوئے پانی میں ڈوبنے لگے۔ کرنوں کے خطوط سیلاب کی لکیروں کی مانند بھاگے دوڑے اور ٹوٹ گئے۔

ستاروں کے دیے بجتے رہے فوج دریا کو پار کرتی رہی اور تھوڑی ہی دیر میں سات ہزار بہمنی سوار دشمن کی سر زمین پر جا اترے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بھی جھاڑیوں، سرکڑوں کا سلسلہ ساحل کے ساتھ ساتھ چلا تھا اور ان سے پڑے پہاڑی نیلے شروع ہو گئے تھے جو پچا کر تک پہلے ہوئے تھے۔

دیورائے کی فوج تک پہنچنے کے لئے اب انہیں چار پانچ کوس واپس چلنا تھا اور شہزادہ حسن نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ فواد خاں کے سپرد کر دیا اور حکم دیا کہ وہ ساحل کے ساتھ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھے، دوسرا حصہ اپنے ساتھ رکھا جسے دریا کا ساحل چھوڑ کر آگے بڑھنا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ سب سے پہلے فواد خاں گھاٹ کی جانب سے حملہ کر دے اور شہزادہ بالکل اس کی مخالف سمت سے دشمن پر ٹوٹ پڑے اس نے ہدایت کی دیورائے اگر ہاتھ لگے تو اسے زندہ گرفتار کیا جائے۔ شاید وہ حسن کے مجرم کو پرتھال کے حضور قیدی بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا۔ فوج دو حصوں میں منقسم ہو کر تیزی کے ساتھ آگے بڑھی۔ رات ڈھلتا شروغ ہو گئی تھی اور وہ جلد سے جلد دشمن کے سر پر پہنچ جانا چاہتے تھے تاکہ اسے خواب خرگوش سے بیدار کرنے کا لطف اٹھا سکیں۔

رفتار تیز تر کر دی گئی دونوں دستے موت کے خطوط بن کر دیورائے کی طرف بڑھنے لگے۔ بائیں بازو کا خطرہ بھی تھا کہ دشمن کے پیہر بیدار کہیں خبردار نہ ہو جائیں ان کی غفلت ہی بیجا گم کے مہاراج کے لئے موت کا حکم بن سکتی تھی۔ وہ شکست کھا کر بھاگا تھا اس نے دریا کے گھاٹ پر یقیناً کڑا سپرہ لگایا ہو گا تاکہ کبھی لشکر شب خون نہ مار سکے لیکن حملہ آور نہایت خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے جیسے موت رسکتی ہے۔

”خون کی تحریریں“

کچھلی رات کا زرد چاند آہستہ آہستہ افق پر ابھرنے لگا اور کپاس کے پھولوں کی مانند بڑو شعائیں بلند درختوں کی شاخوں پر بکھرنے لگیں، رات کے پچھلے لمحوں میں ہر شے خفیدہ کے اتھاہ شگفت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چاروں طرف بھیا تک اور مہیب سناٹا طاری تھا لیکن گہرے سناٹے میں ساحل کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک پُر اسرار، پُر ہول سی آوازیوں ابھری جیسے دور کہیں موت کے گھنگروں رہے ہوں۔

ہاں یہ موت کے کارواں کی گھنٹیوں ہی کی تو آواز تھی۔ فواد خاں اپنا لشکر لئے ساحل کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا۔

دیورائے کی فوج گھاٹ سے صرف ڈیڑھ کوس جٹ کر خیمہ زن تھی اور اس کے زخمی کم و بیش ایک کوس تک چلے گئے تھے۔ لشکر گاہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مرا کے چاند کی

مدم می زرد روشنی میں خیمے سیاہ دھبے سے بن کر رہ گئے تھے۔

سیاہ چیتا جب شکار کے لئے نکلتا ہے۔ تو بلی ایسے نرم قدموں سے چلتا ہے اور تیز لگاؤ میں اعداؤں کو چیرتی ہوئی اپنے شکار کو بھانپ لیتی ہیں۔ مدگل کے پیچھے نے بھی دشمن کا پراؤ اڑھوٹ نکالا تھا۔

تین ہزار سوار دائیں بائیں ایک کوس طویل خط بنا کر پھیل گئے پھر جس طرح کمان سے تیر چھوٹے ہیں فولاد خاں کے اشارے پر وہ اپنے گھوڑے اڑاتے ہوئے آگے بڑھے۔ کرناٹک کے طلائی گرد محافظ جو لشکر سے صرف اڑھائی سو گز کے فاصلہ پر پہرہ دے رہے تھے۔ پہلے ہی حملہ میں تھمے اجل ہو گئے۔

سپاہی اپنے خیموں میں گہری ٹینڈ کے مزے لوٹ رہے تھے لیکن تین ہزار گھوڑوں کے سریت دوڑنے کی آواز خوفناک دھماکے کی مانند ان کی سماعت سے کھرائی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھے لیکن موت ان کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ جلدی جلدی کھوار میں سنبھالی کر وہ خیموں سے باہر نکلے۔ مقابلہ بے سود تھا۔ حملہ آوروں نے آتے ہی انہیں نیزوں کی ہانڈھ پر رکھ لیا اور لشکر گاہ میں دردناک جھپٹیں گونجنے لگیں۔ موت کے دیوتا رقص کرنے لگے۔ نیزوں کے پھل خون میں ڈوب گئے اور زندگی کی تلاش میں بیچانگر کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔

دیورائے اپنے پُر تکلف خیمے میں اس زخم کی شدت سے تکلا رہا تھا۔ جوش شیر خاں کے ہاتھ بے کھا کر آیا تھا جب اسے خبر دی گئی کہ ہماری سواروں نے موت ایسے نرم قدموں کے ساتھ دیا عبور کر کے شب خون مارا ہے اور اس وقت ایک ہزار کے قریب سپاہی خاک و خون میں تڑپ کر ٹھنڈے ہو چکے ہیں تو وہ دم بخود رہ گیا۔

یہ خبر اس کے لئے قطعی غیر متوقع تھی وہ جانتا تھا۔ فولاد خاں کی رکاب میں ڈھائی ہزار سے زیادہ سوار نہیں ہو سکتے اور اتنی کمبل تعداد کے ساتھ بیس ہزار کے لشکر جرار پر حملہ کرنا اگر اپنی موت کا دروازہ کھٹکھٹانا نہیں تو اور کیا تھا؟ شاید جوش انتقام میں بھیجی سوار پاگل ہو گیا ہے۔ دیورائے خونی بھیڑیے کی طرح غرایا۔

”یقیناً فولاد خاں کی موت ہی اسے گھیر کر لائی ہے۔“ پھر اس نے حکم دیا۔
”دشمن کو روکو، کھواروں سے اس کا سواگت کرو۔ آج وہ جان لے گا کہ شیر کی کچھار پر تیرہ دوڑنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔“

آہ بد قسمت دیورائے جو اتنا بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ فولاد خاں نہیں بلکہ دکن کے عہد شہزادہ حسن کی تلوار تھی جو بجلی کے کوندے کی طرح اس کے سر پر جھمکائی تھی۔

جلدی جلدی ایک سپاہی نے اُسے زرد بکتر پہنایا۔ سر پر فولادی ٹوپی رکھی۔ کمر میں پنکا اور شمشیر باندھی اور وہ لپک کر باہر آیا۔ اس کا خیمہ لشکر گاہ کے وسط میں تھا اور شاہی خیمے سے صرف تین چار فرلانگ کے فاصلے پر یعنی سوار بیچانگر کے سپاہیوں کو کاٹ رہے تھے۔ مہاراجہ گھوڑے پر سوار ہوا تو فوج کے بڑے بڑے افسر، راؤ اور مہاترا اُس کے گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ سالار فوج دردمن سر جھکائے حاضر تھا اور راج گورو اس کے پہلو میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ کیا حکم دیتا ہے۔

”دشمن کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں۔ اُسے اپنی جیت کا گھمنڈ ہے مگر اس یہ گھمنڈ توڑ ڈالو۔ ایک بھی سوار زعہ بچ کر نہیں جانا چاہیے۔“

دردمن یہ حکم سنتے ہی ہوا ہو گیا۔

بھمنی سواروں نے لشکر کا ایک بازو صاف کر دیا تھا۔ اب دردمن نے دوسرا بازو آگے بڑھایا لیکن سواروں اور پیادوں کی جنگ میں لمبے گھوڑ سواروں ہی کا بھاری ہوتا ہے دیورائے بھی اپنے مصاحیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔

غیر میں ڈوبے ہوئے سپاہی آنکھیں ملتے ہوئے بجائے اور موت کی بجٹی میں جھونک دیے جاتے۔

جب زرد چاند نے افق سے سرا بھار کے دیکھا تو دریائے ننگ بھڑوائے کے جنور مشرقی گھاٹ کی دھرتی پر کرناٹکی سپاہیوں کا خون اپنے مہاراج کے ”نوس آلود عشق“ داستان تحریر کر رہا تھا۔ دکن کی مہ جبین حید کو پاب زنجیر لے کر آنے کی تمنا رنگ لا رہی تھی پر قتال کے جیلے ہوئے گاؤں کا دھواں چٹا کی بھڑکتی ہوئی آگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اب بیچانگر کی سرزمین پر مدھل کی بستیوں کو تاخت و تاراج کرنے کا حساب بیاں کیا جا رہا تھا۔

سیکڑوں لاشیں خاک و خون میں لتھڑی پڑی تھیں۔ بھمنی سواروں کے نیزے سینوں میں اور تلواریں گروٹوں پر چمک رہی تھیں۔ زخم کھا کھا کر گرنے اور تڑپنے والے سپاہیوں ولدوز اور جگر خراش آوازوں سے قیام گاہ میدان حشر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ موت کے

وہاں اور کچھ نہیں تھا اور اگر کچھ تھا تو دیورائے کی ہاری ہوئی تھی۔

مہاراجہ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ ناقابل یقین اور ناقابل برداشت منظر اس کی روح مدافعت کو زخمی اور نحیف و زار کر دینے کے لئے کافی تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جس ہزار بہادر صرف دو اڑھائی ہزار سواروں کا مقابلہ کیوں نہیں کر سکتے اور دشمن کے ہاتھوں بھینڑوں اور بکریوں کی طرح ذبح کیوں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے وہ لڑائی کے تمام گرج بھول چکے ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے اُسے پھریری سی آگئی لیکن کچھ بھی ہو بہر حال اس وقت وہ اپنے دلس میں تھا۔ اپنی سرزمین پر اپنی ”مٹی“ میں اس نے جنگ کو ترجیح دی۔ آگے بڑھ کر سپاہیوں کو لٹکارا اور دجے نگر کے تازہ دم بہادروں کا ایک دستہ آگے بڑھایا جو اتنی دیر میں ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح ہو چکا تھا۔

یقیناً اب کوار می فولاد خاں اور دیورائے کے درمیان فیصلہ کرے گی۔

سواروں نے ایک مرتبہ پھر پیادوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ دجے نگر کے بہادروں میں ایک ہزار گھوڑا سوار بھی تھے۔ جو عاز پر پہنچ گئے تھے۔ دیورائے نے ان کو جنگ میں دھکیل دیا۔ پیادہ سپاہی زخم کھا کر بھاگ نکلے تھے۔ پچانگر سے اصراب اُن کی اور کوئی۔۔۔ منزل نہیں تھی۔

لیکن پچانگر دور تھا اور موت کی منزل قریب تھی۔

جوب کی طرف سے شہزادہ حسن کے چار ہزار سوار عقاب کی مانند چبھتے اور میدان جنگ سے بھاگنے والے پھر خوشخوار بھالوں کی زد میں آ چھنے ولی عہد نے لشکر گاہ کے جوبی بازو پر ہلہ بول دیا تھا۔

مہج کا ذب کا مکر اُجالا دیورائے کے سیاہ اُتھال پر خون کی لکیریں کھینچتا ہوا طلوع ہوا۔ جب اُس نے اپنے عقب میں بھی کواروں اور نیزوں کی چمک دیکھی تو سستہ میں آ گیا دوسرے لمحے ایک سپاہی نے یہ دل شکن خبر سنائی۔

”مہاراج! پیچھے سے دکن کا ولی عہد اپنی فوج لئے بڑھا آ رہا ہے میری آنکھوں نے پانچ چھ ہزار سواروں کو دیکھا ہے۔“

مہج کی نیپالی روشتی میں جوب کی سمت سواروں کا بادل بڑھتا ہوا نظر آیا۔ دکن کے سیاہ پرچم مہج کی ہواؤں میں پھر پھرا رہے تھے۔

اور سواروں کے حلقہ میں کھڑا شہزادہ حسن کف افسوس مل رہا تھا کہ دیورائے ہاتھ سے نکل گیا۔ دور دور تک پڑی ہوئی لاشوں کو بغور دیکھ لیا گیا تھا۔ ان میں بیجا نگر کے مہاراج کی شکل دکھائی نہ دی۔ وہ ایک مرتبہ پھر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے نو ہزار سوار میدان میں کھیت رہے اور صرف دو ہزار زخمی گرفتار ہو سکے تھے۔ ولی عہد کو قیدیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے فولاد خاں کو حکم دیا کہ اسی میدان میں پڑاؤ کیا جائے اور مگھوڑے سے اتر آئے۔

سینکھو کتب خانہ



نہی

[illegible]

محبت کی دھڑکنیں

بدشگونی

شک و تاریک اور گرد و غبار سے لٹے ہوئے پہاڑی درے انسانوں کا مسکن بن گئے تھے۔ اور موت کے خوف سے وہ ان اندھیرے غاروں میں یوں دبک گئے۔۔۔۔۔ جیسے خوفی بھیڑیے کے ڈر سے بکریاں بازار سے نہیں اہم جاتی ہیں۔

کھردری چٹانیں، آگے تو جھے، چوکور، مدور اور فوکیلے پتھر، گرد و غبار، کڑیوں کے جالے، چگادڑوں کی پیٹیں، گھٹی گھٹی سی متعفن اور پوچھن فضا، یہاں اور رکھا ہی کیا تھا۔ بس یہی قیمت تھا کہ ان پہاڑوں کے کھوکھلے سینوں میں انہیں پناہ مل گئی تھی۔

انہی دروں میں وہ وقت آگ روشن ہوتی تھی اور پیت کا دوزخ بھرنے کے لئے کچھ میسر آ جاتا کیا جاتا۔ جب لکڑیاں سلکتیں اور دھوئیں کی سیاہ لکیریں دروں کی تاریکیوں میں چمک اٹھتی تھیں تو کبھی دیر تک "کھوں کھوں" کی آوازیں پتھر کی دیواروں سے ٹکراتی رہتیں اور پہاڑوں کا سینہ جلا۔ سلکا اور ڈکھتا رہتا بعض اوقات تو بوڑھوں کی کھانسی کے نام ہی نہ لگتی لیکن انہیں مجبوراً سانس روکنا پڑتا کڑونے دھوئیں سے بچوں کے آنکھوں سے پانی بہہ نکلتا اور بوڑھوں کی "کھوں کھوں" کے ساتھ بچوں کی "ژڈ ژڈ" بھی شروع ہو جاتی۔ مگر یہ سب آوازیں پہاڑی دروں میں گھٹ کر رہ جاتیں۔

خوف اور دہشت کے مارنے کی ناؤں کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہو گیا تھا وہ اب محسوس بچوں کو کھپکھپ کر بھوکا ہی سلا دیتیں اور خود سینے پر پتھر کی سل رکھ کر لیٹ رہتیں۔

میں۔ فضا میں ایک عجیب سا لہجہ تو پہلے ہی کھل رہا تھا۔ اب سانسوں کے دباؤ سے ہوا
 زیادہ کثیف اور بوجھل ہو گئی تھی ان کا جی چاہتا تھا وہ کھلی فضا میں سانس لیں لیکن یہ خطرہ
 ان سول لیتا؟

سب جانتے تھے باہر موت ہے درم کی ہے۔ بیٹانگر کے سوار اور ان کے خوفناک
 آلے ہیں جن کے پھل سیدھے کلہوں میں اترتے ہیں پھر وہ باہر کیوں نکلتے؟ اور زندگی تو
 صرف ان تنگ و تاریک دروں ہی میں سمٹ آئی ہے جہاں لہجہ تھا، اندھیرا تھا، دھواں تھا،
 کھوں کھوں اور ”زوں زوں“ تھی موت کے ڈرے سے ہوئے مجبور انسانوں کے گہرے
 گہرے سانس تھے جن سے فضا اور بوجھل ہوئی جا رہی تھی۔

وحشت اور وحشت کے مارے پورا گاؤں لے لے پہاڑی غاروں میں گھس آیا تھا وہ
 ان آڑی ہوئی جاہ حال بستیوں کی کہانی سن چکے تھے جنہیں بیٹانگر کے سواروں نے کیموں
 سے جھلس ڈالا تھا۔ کتنے معصوم بچے شعلوں میں توپ توپ کر ٹھنڈے ہو گئے تھے کتنی بھگتی
 دی ماؤں کی مستاجل کر راکھ ہو گئی تھی۔ کتنے زردش بے گناہ آدمی بھالوں اور تلواروں کا
 کار ہو گئے تھے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا تھا کہ بیٹانگر کا مہاراج ہر اس شے کو نیست و
 بود کرنے پر تل گیا تھا۔ جو اس کے پاؤں کی ٹھوکر اور پرتھال کے سر کے درمیان حائل ہو
 سکتی تھی وہ اس مغرور حیزہ کو زعمہ گرفتار کرنے کی سوجھ بوجھ کھا کر نکلا تھا۔ جس نے بیابان کے
 پیغام کا جراب خنجر کی نوک سے دیا تھا۔ وہ اس کے سندر روپ کو شعلوں کی چٹا میں جلا کر بھسم
 کر دیا چاہتا تھا تاکہ آئندہ کوئی کنواری مہاراج کو خنجر دکھانے کی جرأت نہ کر سکے جیسی تو
 اس نے ورپا عبور کرتے ہی جابی ویربادی کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔

یہ تو بالکھیت سار ہی تھا۔ جس نے ہمایاک خطرے کی بودوری سے سوکھ لی تھی اور
 محسوس کر لیا تھا۔ کوئی نہ کوئی خوفناک مصیبت آنے والی ہے۔ پھر اس نے کھیا کا کا سے کہہ
 کر گاؤں والوں کو پہاڑوں کی طرف ہانک دیا اور وہ ان دروں میں آکر دیک گئے تھے
 رند جہاں ان کا گاؤں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ وہاں خود بھی جل مرے ہوتے بستی کو
 بھونک کر ویرائے اگرچہ واپس چلا گیا تھا لیکن مدگل کی فضاؤں میں خطرے کے گدھ ابھی
 تک اپنے مخوس پروں کو چنچھتا رہے تھے اور یہ متعفن، تنگ و تاریک درے ابھی بستی کی کھلی
 فضا اور صاف ہوا سے کہیں بہتر تھے۔ جس کے آتش پاس موت گھات لگائے بیٹھی تھی۔

ایک بار وہاں کی ترال ہی ہے مجھے جنگلات کا جلیب شروع ہو چکا تھا اندر میں نے فریاد
 چھڑی دی اور درختوں اور چھاڑیوں نے نہ تو کیا ایک چھار کی شکل اختیار کر لی تھی اب اس وقت وہاں کی
 رات کے اندھیرے میں چند نوجوان پہاڑی غاروں سے باہر نکلتے اور تھکے لگے
 چشمہ بننے والی کے کنارے بھر لاتے تھے وہ دن کے وقت تو ابھر کر لٹا لٹکا جا رہی تھی نظر
 نہ آتا تھا اور آتے ہوئے نیچے پھاڑوں کو دیکھ کر کوئل ٹھٹھکے پڑتا تھا یہی لگا بھینٹ لگا تھا کہ ان
 کے کچھ کھلے سینے ان کے دل انسانیوں کا دیکھ کر ہوا کے ہیں وہ جہاں ان کو لے گئے تھے وہاں ان کو لے
 زوں کی آواز میں خبردار کی گئی تھی کہ ان کے لئے وہاں کی سڑکوں میں ٹھٹھکے ہوئے تھے
 ہیں۔

... روز جیسے کھنٹ نے ایک چھوٹی سی شکل بنا کر رکھ لی تھی۔ جسے وہ دیکھ کر غصے میں سے خوش
 کرتا تھا اس کی بدیم ضخیم طور پر لٹکائی کے پڑی ہوئی تھی کہ اس نے کب تو عمرانی آتے تھے جن کی کو دشمن
 میں وفایت دوسرے کو دیکھ سکتے تھے یہ تو پہلے روز تو اسے چہرے میں نہیں دیکھا تھا وہ وہاں
 کا ایک کون تھا کہ اس نے وہاں سے وہاں کی سڑکوں کی پڑی ہوئی تھی کہ اس نے کب تو عمرانی آتے تھے جن کی کو دشمن
 لگے کہ یہ جیسے تھے اس کی بدیم ضخیم طور پر لٹکائی کے پڑی ہوئی تھی کہ اس نے کب تو عمرانی آتے تھے جن کی کو دشمن
 دن بھی کچھ ان کی طرح کرتا رہا ہے اور پھر اس کے پاس وہاں کی پڑی ہوئی تھی کہ اس نے کب تو عمرانی آتے تھے جن کی کو دشمن
 سننے کی خاطر حق میں گئے تھے وہاں سے اس کی زیادہ تر باتیں سنیں تھیں چھوٹا سا چھوٹا سا چھوٹا سا
 بچہ تھا کہ اس نے وہاں سے اس کی زیادہ تر باتیں سنیں تھیں چھوٹا سا چھوٹا سا چھوٹا سا
 "جی ہاں... یہ سب کچھ ان کی ایک دلچسپی تھی کہ اس نے کب تو عمرانی آتے تھے جن کی کو دشمن
 کبھی گہری سکی پر توئی تھی کہ اس نے کب تو عمرانی آتے تھے جن کی کو دشمن
 "تو خیر اسے تو وہاں سے اس کی زیادہ تر باتیں سنیں تھیں چھوٹا سا چھوٹا سا چھوٹا سا
 وہاں ایک خوشحال گھر تھا کہ اس نے کب تو عمرانی آتے تھے جن کی کو دشمن
 دیوار کے نیچے کے خیمے کے پاس وہاں کی پڑی ہوئی تھی کہ اس نے کب تو عمرانی آتے تھے جن کی کو دشمن
 "تو خیر اسے تو وہاں سے اس کی زیادہ تر باتیں سنیں تھیں چھوٹا سا چھوٹا سا چھوٹا سا
 "لیکن یہ تو وہاں سے اس کی زیادہ تر باتیں سنیں تھیں چھوٹا سا چھوٹا سا چھوٹا سا
 کی وہاں سے اس کی زیادہ تر باتیں سنیں تھیں چھوٹا سا چھوٹا سا چھوٹا سا
 "تو خیر اسے تو وہاں سے اس کی زیادہ تر باتیں سنیں تھیں چھوٹا سا چھوٹا سا چھوٹا سا

[illegible]

میں آیا جا چکے ہیں۔ یہ یقیناً اپنے بچے غریبوں میں گئے گی اور سب سے زیادہ

اسی پر جمال محمد: جس کی مہر آویز ایک چاہو کی طرح ابھری البتہ جان کے آخری گوشے پر
تک ابھری۔ اس کے سب پر جمال کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر ایک کوسے سے کھانسی کا سلسلہ

کی برائی سے بچنے کے لیے ہمیں اپنے دل سے اس برائی کو نکال دینا چاہیے۔

۱۰۰

چنانچہ ہوا اس سے کہ ان میں سے ہر ایک کے پیروں کا پچھلایاں کھنڈ چکر کر چکر گئے اور اسی طرح کئے دو عین کے پیروں کا ایک ساتھ چنگی نکل گئی۔ ایسے میں چوکانہ دھری سڑی کے

[illegible][illegible][illegible]

تاریخ احمدیہ کی کہانی اور پھیلنے کے ساتھ ساتھ اس کی بنیاد پر مبنی کتاب کے بارے میں

خداوند کے سایہ کے ماتحت خرد و دل کی قیادت میں اپنے دل کے نور سے

تقریر قرائت میں جس طرح غلطی چھوڑنے کے خطرہ کا غم کی یا غم کی وجہ سے اس کا اثر ہو گا۔

مشکل کا بھجوا اور چکاؤ کا مرنا یقیناً ایک منحوس سائنس تھا اور یہ "جیو ٹیکنالوجی" کی مٹی کی بنیاد پر تھا۔

کا پیش خیرہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ سب کسی گہری فکر میں ڈوب گئے تھے کم مہم کیا کا کا کی بوڑھی کمال کی جھریاں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر خوف کے سائے لرزاں تھے۔ وہ ہولے ہولے زیر لب کچھ بڑا رہا تھا۔ شاید اس شخص شکن سے ڈر کر پراگھتا کر رہا تھا۔ گہری اس کے قریب ہی ایک کونے میں دیکھی بیٹھی بیٹھی بیٹھی بیٹھی تھیں۔

پر تھا ان کے چہروں پر ایک نئے خوف کو کر رہی تھیں۔ دیکھ لیا تھا اور وہ بھاپ مچی تھی۔ اُس وقت ان کے دلوں میں کیا کھد بھور رہی ہے۔ ان پر سب جانی، بربادی اور مصیبت محض اسی کی وجہ سے آئی تھی۔ اُس کا سند روپ اُن کے لئے موت کا خطرہ بن گیا تھا لیکن وہ خاموش تھے، اُن کی زبانیں مگ ہو چکی تھیں۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر خُش کی قوت سے مرعوب ہو گئے تھے یا پر تھا ان کو انہوں نے کوئی اعلیٰ ہستی سمجھ لیا تھا اور نہ کل تک جس کی جوانی پر اُنھیں اُٹھتی تھیں۔ مگر گھریاں ہوتی تھیں اور لوگ جس کے بیاہ سے انکار کا ذکر سن کر ہاتھوں میں اُٹھ کر اب لیا کرتے تھے۔ آج وہی سند کنیا ان کے نزدیک پوتر سادری۔ آکاش کی دیوی اور مقدس اپرا کا روپ و حار چکی تھی جس نے ساہو کاروں، بڑے بڑے زمینداروں اور ایسے لوگوں کے بستے ٹھکرا دیئے۔ جہاں سردار رلے تھکمار کا پیغام قبول نہ کیا اور بچا مگر کے مہاراج دیہائے کے رتوں کی مہارانی بنے سے انکار کر دیا۔ وہ بھیت کوئی معمولی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ احساس تھا جس نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی زبانوں پر خاموشی کی مہر لگا دی تھی۔ مورتیں اُسے لٹکی لٹکیوں سے دیکھتیں۔ جن میں ایک عجیب سا خیر لرزتا تھا اور جان لڑکیوں کے دلوں میں تو بیک وقت حسد اور شک کے جذبات آہیں میں گنڈھ ہو رہے تھے وہ سوچیں کاش کوئی راج تھکمار اُن کے بھی بیاہ کا سند میں بھیجتا۔ ان کی خاطر بھی کسی مہاراج کی سوازی آتی اور وہ شاعی چتر کے سایہ میں راج سکھیں پر کسی مہاراج کے پیلو میں چھتیں لیکن ان کے خیال کے برعکس۔ میں بس پر تھا ہی رقص کرتی۔ اسی کا سند روپ جلوئے بکھیرتا اور اب ان کی خوفزدہ۔ دشت آلود نگاہوں نے پر تھا ان کو یوں گھیر لیا تھا۔ جیسے وہ پوچھ رہی تھیں۔

”اے سندری! تمہارا روپ ابھی اور کیا گل کھلائے گا؟ ہمارے سروں پر منڈلانے والی خوشیں کب ختم ہوں گی؟“

پر حال جانتی تھی۔ چگاڑ کی موت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں اُن کے یہاں ہوا گزری ہونے سے پہلے یہ پہاڑی دے انہی منحوس پرعدوں کے مسکن تھے اور ہر شام ایک دو نہیں بیسیوں چگاڑیں چٹانوں کی دھاڑوں اور پتھروں کے سوراخوں سے نکل کر ہر شام ہی فضا میں منڈلایا کرتی تھیں۔ یہی اُجاڑ سنسان اور ویران عمار اُن کی سوگ تھے لیکن جب اس "سوگ" میں انسان آئے تو وہ جیتی چلاتی اور لے لے پرے کو پھڑ پھڑاتی کسی ماسطوم جگہ کی طرف پرواز کر گئیں۔

اور لوگ تو مصیبت کے وقت خواہ مخواہ ہر بات سے شگونی لیتے ہیں۔ دل کے کسی گوشہ میں دھڑکتا ہوا خوفِ نحوست کے سیاہ خباب اڑھ کر باہر آ جاتا ہے اور آنے والی خیالی مصیبت کے تصور ہی سے کانپنے لگتے ہیں بد شگونی کا یہی ساتھ یہاں پیش آیا تھا۔ سب کے سب یوں ہر اسماں نظر آرہے تھے جیسے کچ کچ اُن کی موت کے فرمان جاری ہو چکے ہوں۔ سکھ دیو کا کاکی بیڑا ہٹ ابھی تک جاری تھی اور لکھپت بھی یہی نظروں سے چگاڑ کی سیاہ لاش کو گھور رہا تھا۔ مرگ آسا خاموشی سے تنگ آ کر وہ تعجب سے بولی۔ "بابا۔۔۔ کیا تم بھی۔۔۔"

اور لکھپت کی نگاہیں بیٹی کی طرف پلٹیں وہ حیران لگا ہیں کہہ رہی تھیں۔ "ہاں بیٹی! میں بھی۔۔۔"

"یعنی تم بھی یہی سمجھتے ہو۔ ہم پر کوئی مصیبت آنے والی ہے؟"

"تو نہیں جانتی بچی! چگاڑ ایک منحوس پرعد ہے سیانے کہتے ہیں اس کا سر پر منڈلانا برا لگن ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی کشت آتا ہے۔"

لکھپت ستارے جیسے لوگوں کے دل کی بات کہہ دی تھی انہوں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلائے اور اس کی تائید کر دی۔ سب لوگوں کے دلوں میں یہی اندیشہ رینگ رہا تھا۔ کوئی نئی مصیبت، جی تباہی نہ کھولے ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔

"تم سمجھ نہیں بابا۔۔۔" پر حال کے لیوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "چگاڑ بے شک ایک منحوس پرعد ہے مگر اس کے مرنے سے ہمارے سر پر منڈلانے والی نحوست ختم ہو گئی ہے تبھی یہ کشت کٹ گیا ہے اب ہمیں کوئی چٹا نہیں کرنی چاہیے۔"

اُس کی آواز میں ایک عجیب سی کپکپاہٹ تھی۔ ایسی کپکپاہٹ، ایسی لرزش جو دکن کی عورتوں کی زبان پر صرف اپنے محبوب کا ذکر کرتے وقت طاری ہوتی ہے۔
 ”وہ دیوارے کا تعاقب کر رہے ہیں۔“

روشنی بیگ نے جواب دیا۔ ”شاید انہوں نے اس وقت دریائے نگ بھدرا کو عبور کر لیا ہوگا۔ جان عالم بچا مگر کے ظالم راجہ کو قتل کرنے کی قسم کھا کر نکلے ہیں۔“
 پر تھاں یہ سن کر دم بخود رہ گئی پھر روشنی بیگ نے مختصر الفاظ میں دیوارے کے فرار اور دلی عہد کے تعاقب کا قصہ سنایا اور بتایا کہ وہ اسے اپنے ہمراہ لے جانے آیا ہے جان عالم اس سے ملنے کے لئے بڑے بے قرار اور مضطرب ہیں۔

اپنے محبوب شہزادے کا سندس اور شوقی ملاقات کا ذکر سن کر پر تھاں کے انگ انگ میں بجلی کی سی لہر دوڑنے لگی۔ دل سے طرب انگیز احساس کی کرنیں سی پھوٹیں اور من مندر میں اُجالا ہو گیا۔ اس کا بدن ایک عجیب سے کیف، ایک لطیف سے سرور میں جھوم گیا اور دُور مسرت سے لرزتی آواز میں وہ بولی۔

”میں جانتی تھی روشنی بیگ امیری بیٹا، کا حال سن کر جان عالم ضرور آئیں گے لیکن کہیں وہ مجھ سے خفا تو نہیں۔ میں انہیں یاد تو آتی رہی ہوں نا؟“
 ”وہ بھلا تم سے خفا کیوں ہونے لگے؟ تم تو ان کی زندگی میں جھکی ہو۔“

چند قدم کے فاصلے پر لکھت اندھیرے میں ایک سایہ کی طرح کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا حیران و ششدر، مبہوت و متحیر، زمین اُس کے پاؤں کے نیچے یوں گردش کر رہی تھی جیسے کوئی لٹو گھومتا ہے۔ جیسے دریا کی تیز و تند لہریں بہنور میں چکر کاٹتی ہیں۔ اُس پر کیسا حیرت افزا تعجب انگیز انکشاف ہوا تھا۔ اس کی بیٹی، ایک غریب سار کی لڑکی، دکن کے دلی عہد شہزادہ حسن کی ”زندگی“ میں جھکی ہے۔ بوڑھا حیران تھا۔ اس کے کانوں نے یہ کیا سن لیا ہے کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ چھوٹی قدم کے فاصلے پر روشنی بیگ پر تھاں سے کہہ رہا تھا۔

”جب تک جان عالم تمہیں دیکھ نہیں لیں گے۔ انہیں جین نہیں آئے گا۔“

اور بوڑھے سار کو اپنے کانوں میں غار سے سے بجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے جسم پر ایک لرزہ خیز کپکپاہٹ طاری ہوئی اور ذہن آہستہ آہستہ جھلٹلا جے اجالوں کے

سیلاب میں ابھرنے ڈوبنے لگا۔

ردنی یک نے اجڑے ہوئے گاؤں کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے سلطان معظم کے احکام بھی پر تھال کو سنا دیئے تھے وہ خوشی سے لڑکھڑاتی ہوئی درے کی طرف مڑی۔
دوسرے ہی لمحے غم و فکر سے اترے ہوئے چہروں پر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دروں میں دیکھے ہوئے انسان خوشی سے اچھل پڑے۔

دیورائے بھاگ چکا تھا۔

شہزادہ حسن چھ ہزار بھگتی سواروں کو لے کر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔
موت اپنے مخوس آشیانے کو لوٹ گئی تھی اور مدھل کی ہر بستی اور ہر گاؤں میں زندگی کا البیلا رقص شروع ہو چکا تھا وہ بے خوف و خطر اپنے گھروں کو واپس جاسکتے تھے۔
سلطان معظم کی طرف سے یہ اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ اُن کے نقصان کی تلافی شاہی خزانہ سے ہوگی۔ انہیں اناج، کپڑا اور روپیہ عطا ہوگا۔

اور سندور پر تھال کو جس کے سر پر مہاوشو کے ہاتھ کا سایہ تھا۔ اس کے ماں باپ سمیت دلی عہد کے حضور میں طلب کر لیا گیا تھا جو دیورائے کی سرکوبی کے لئے فیروز آباد سے شاہی فوج لے کر نکلا تھا۔

اب پر تھال بھگتی راجہ کار کو وہ سب بتا سنائے گی جو آگ کے بھڑکے ہوئے شعلوں کی صورت میں اُن کے گاؤں پر آئی تھی۔ جس کے درے وہ جتنے بڑے گھروں سے بھاگ کر بچ چکا ہوں کی اس تاریک جنت میں آدیکے تھے اور جب ولی عہد یہ المناک کہانی سن چکا۔ تو مصیبت زدہ لوگوں کے زخموں پر خود مرہم لگائے گا انہیں انعام و اکرام سننے والا مال کر دے گا اور پر تھال دیوی اُن کے لئے زندگی کی نئی خوشیوں کا سونڈ لے کر لوٹے گی۔
نیم تاریک غاروں میں مسرت کا ایک عجیب سا اچھلا پھوٹ رہا تھا اس اجالے میں پر تھال اپنا سامان لیٹ رہی تھی اور کھفیت سار لڑکھڑاتی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”چھتا نہ کرو ہم جلدی لوٹ آئیں گے میں ولی عہد کو خود اپنی مصیبت کی کہانی سناؤں گا، اور اُن کی دیا ہمارے گاؤں کو نہال کر دے گی۔“
پھر یکھنت وہ یکھ دیوی کی طرف پلٹا اور کہنے لگا۔
”پر کھیا کا کا تم کیوں ہمارے ساتھ نہیں چلتے؟“

نجات کے لئے توفیق پہنچا دیا اور چھوٹا چھوٹا ہے۔ دیکھو ان کے چہرے پر کتنی مسرت ہے۔
 وہ تو ابسط سے اس کے قدم پر گرا رہے۔ لے لے چھوٹا چھوٹا دروازے سے نکلتے ہیں اور گوری جیسی
 ہونے لگے۔ ہاتھ لہر رہے۔ یہی دیکھ کر ہوا نکلا کر کھینچ لی گئی جسے لے کر دو چوٹی عہد کے سامنے
 اپنی چٹا خود بیان کرے جو آگ کے شعلوں کی صورت میں ان کے گھوس پر گرا کر لڑ جاتی
 ہے۔ اب اس کے ساتھ ساتھ۔

[illegible]

۱۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔
 ۲۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔
 ۳۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔
 ۴۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔
 ۵۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔
 ۶۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔
 ۷۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔
 ۸۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔
 ۹۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔
 ۱۰۔ کہ جو شخص کسی عورت کو نکاح کے لئے کہے تو اس کے لئے نکاح ہو گیا ہے۔

”یہ تو میرے راجہ کے گھوڑے کی ٹاپین کی دھجک ہے جس پر سوار ہو کر وہ مجھے اپنے آگے لے جائے گا۔“

یہ سن کر گہری کی ہنسی یوں نکھر گئی۔ جیسے چھاگل سے پانی چھلک جاتا ہے اس نے بعد مشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ہری! یہ تیرا دل ہے یا کوئی راستہ جس پر گھوڑے بھاگتے ہیں ہاپوں کی دھمک ابھرتی ہے۔“

اور پرتقال نے جواب دیا تھا۔

”گہری جب کسی سے پریم ہو جائے تو دل اس کے پاؤں تلے بچھ جاتا ہے اور نگاہیں اس کے راستے کا غبار بن جاتی ہیں۔“

حیرت سے گہری کی آنکھیں پھل گئی تھیں ابھی وہ کچھ کہنے کے لئے سوچ ہی رہی تھی کہ شام کے ٹکجے اندر سے میں دریا کی جانب ہاپوں کی آواز ابھری تھی۔ گرد و غبار کا ایک بیلا سا لہرانا دکھائی دیا تھا دوسرے ہی لمحے جب اس غبار کا دامن چاک ہوا تو انہیں ایک سوار سر پٹ گھوڑا اڈولنے آتا نظر پڑا تھا اور پرتقال کے ہونٹوں سے خوشی کے مارے ایک چیخ سی نکل گئی تھی۔

”وہ دیکھو میرے راجہ آگئے۔“

گہری نے خیرہ کے غرور میں سر ڈال دیا وہ شہزادہ حسن کو دیکھنا چاہتی تھی جس کے روپ کی تعریف وہ پرتقال سے سن چکی تھی۔ کچھ جھجکاتے ہوئے شہزادہ حسن ہی تھا۔ گہری دم بخود رہ گئی تھی اور پرتقال کا دل تو جیسے بیلیوں اچھلنے لگا تھا۔

بیک کا پیغام سننے ہی شہزادہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہوا سے باطن کرنے لگا تھا۔ وہ خبا آ یا تھا صرف ایک سوار اس کے پیچھے پیچھے تھا جو پیغام لے کر گیا تھا۔ ابھی آسمان پر شام کا ستارہ نہیں چکا تھا اور فضا میں ڈوبتے ہوئے سورج کی تمازت باقی تھی۔ کل وہ اپنی منزل پر آ پہنچا تھا۔ بیک نے خود آگے بڑھ کر گھوڑے کی کام تمام لی جو پیسے میں شہزادوں ہونک رہا تھا جیسے بھٹی دہکانے والی دھوکنی چلتی ہے گھوڑے کی اس حالت سے بیک نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ سر پٹ آیا ہے اور رستہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رکا۔ کلبے اور وسیع خیرہ کے جالی دار غرور سے پرتقال نے اپنے صندوق کے دیوتا کو آتے دیکھ لیا تھا اور اس کا دل تاج اٹھا تھا۔

بحر تھوڑی ہی دیر بعد جب اسے سندیس ملا کہ دلی عہد نے اسے اپنے خیرہ خاص

میں طلب کیا ہے تو اس کے سارے جسم پر ایک حیات افروز لرزش طاری ہو گئی تھی اور ملاقات کے پر کیف احساس سے اُسے اپنے بدن پر خوبیاں سی رنگتی معلوم ہوئی تھیں اور اپنے جسم پر وہی سرور انزالرزش لئے ڈولتے اور ڈلگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ ولی عہد کے خیمہ میں داخل ہو رہی تھی۔ جسے رونق یک نے سپاہیوں کی چھو لاریوں سے قریباً نصف فرسخ پر سے نصب کر لیا تھا۔

خیمہ پر ولی عہد کا خاص پھریرا لہرا رہا تھا اور چند ہمکنی محافظ لے لے بھالے اٹھائے اور گردن میں تلواریں لٹکائے اس کے ارد گرد پہرہ دے رہے تھے۔



ایک نے آگے بڑھ کر خیمے کا اٹلسی پردہ ہٹایا اور پر تھاں نے اپنے لرزتے ہوئے پاؤں اندر رکھے پھر ایک تو دروازے ہی پر رک گیا وہ ایک سحر زدہ انسان کی طرح ہولے ہولے چلتی ہوئی آگے بڑھی۔

خیمہ کے اندر قریباً چار گز چوڑی ایک گلی چاروں طرف پھیلی تھی اوپر سائبان تھا۔ اندرونی قنات میں شاہی خیمے کا دروازہ اڑھائی گز اونچا تھا۔ اور اس میں سرخ بنات کا پردہ لہرا رہا تھا۔

سلطانی پارکاپیں نصب کرتے وقت دروازوں کی بلندی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا تاکہ ان سے گزرتے وقت گردن کو خم دینے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

سلطانی منظم اور شہزادوں کے سر خدائے واحد کے سوا کسی کے آگے نہیں جھک سکتے تھے۔ گلی میں ایک بے دود مشعل روشن تھی اس کی روشنی میں خیمہ کی اندرونی دیواریں چمک رہی تھیں اندر ایک عجیب سی خوشبو پھیل رہی تھی۔ پر تھاں شاہی خیمہ میں داخلہ کے آداب سے آگاہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی۔ کتنے فاصلہ سے ولی عہد کو جھٹ کر سلام کرنا چاہیے اور سر جھکا کر کتنی مرتبہ ہاتھوں کو جنبش دینا ضروری ہے۔

مشعل کی روشنی میں سرخ بنات کا پردہ جھلجھل کر رہا تھا۔ پر تھاں نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹایا تو اس کا دل دھچک سے رہ گیا۔ اس کا محبوب، مملکت ہمکنی کا چشم و چراغ شہزادہ حسن اپنے بازو کھولے اس کے لئے چشم براہ تھا لیکن جوش محبت میں اُسے بڑھ کر بغل گیر ہونے کی بجائے آداب شاہی کے مطابق اُس نے کونفش بجا لانا ضروری سمجھا سلام

کرنے کے بعد وہ ہولے ہولے آگے بڑھی حتیٰ کہ ولی عہد سے دو گز کے فاصلہ پر جا کے کھڑی ہو گئی۔ دراصل وہ اپنے دل کے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کنیز کا ہدیہ سلام قبول ہو۔“ اُس نے شاہی مجلس کی عورتوں کے مخصوص لہجہ میں کہا۔ شہزادہ حسن چونک اٹھا وہ نہیں جانتا تھا یک نے اُس کی محبوبہ کو شاہی آداب سے خبردار کر دیا تھا تا کہ جب کبھی وہ مجلس میں داخل ہو تو اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرے۔

وہ چپ چاپ کھڑا اُسے پیاسی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ بے دود فانونوں کی روشنی میں پرتھال کا چہرہ یوں چمک رہا تھا۔ جیسے چاند نیلے اور سیاہی مائل آسمانوں سے ٹوٹ کر اس کی بارگاہ میں آ گیا ہو۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو عورت پر دگی دے رہے تھے اور ہونٹوں کے گوشوں پر ایک ناویدنی لرزش اس بات کا اظہار تھا کہ وہ بھی ملاقات کی مسرت سے ہلکا رہا ہے۔ ایک لمحہ... صرف ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ بے تاب کی کیفیت کے ساتھ آگے بڑھا پھر پرتھال اُس کے مسکراتے اور ہلکے حلقہ میں کھنکھاتا رہی تھی۔

اُف..... ہم آغوش کی وہ اولین ساعت، صبا محبوب کی پہلی کیفیت، سرور محبت کا پہلا تجربہ، کیف نہایت کا آغاز،

مگر یہ ہم آغوش تھی یا ملی ہوئی گھٹاؤں کے سینے میں بکلی کی تڑپ یا شیطانی دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔

کیسا عجیب سرور تھا۔ جس کی کیفیت و لذت سے وہ دونوں آج تک بے خبر تھے جیسے انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ شراب پی لی ہو اور نشہ کی لہر اُن کے ذہن و شعور کو سرور و کیف کی اُن دیکھی۔ اُن جانی رفتوں کی طرف لے آئے۔

پرتھال نے یوں محسوس کیا جیسے کہکشاں آسمان کی بلندیوں سے ٹوٹ کر اُس کے دامن میں آ گئی ہے یا وہ خود اوپر ہی اوپر سیلاب نوز کی وادیوں میں پرواز کر رہی ہے جن کے زمریں کناروں پر شمع اپنے رنگ بکھیرتی اور چاند اپنی شیشیں کرشمے پھیلاتا ہے کیف نہایت کے آغاز نے اُن کے سینہ میں بلاخبر جنم پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے محبوب کی آغوش میں ابدی اور سرمدی خوشیوں کا چھوٹا چھوٹا رہا ہے۔

خود شہزادہ حسن کی کیفیت بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ وہ بھی محسوس کر رہا تھا زندگی صرف انہی فانی اور گزر جانے والے لمحوں کا نام ہے جن میں وہ اپنی محبوبہ کو بازوؤں

"کیا ہوتا؟"

"میں تو سرگئی ہوئی۔"

"لیکن موت تمہارے دشمن کا مقدر بن چکی ہے۔"

پر تھاں نے سر اٹھا کر حسن کی طرف دیکھا۔ اس کی سفید اور راج فہن کی سی لمبی گردن میں موتوں کا وہ ہار جھللا رہا تھا جو شہزادہ نے اسے پہلی ملاقات میں بخشا تھا قانونس کی تیز روشنی میں موتوں سے شعاعیں سی پھوٹ رہی تھیں۔

شہزادہ آگے بڑھا تو کہنے لگی۔ "میری آتما اور شریر دونوں میرے پریم کی امانت ہیں دیورائے اگر مجھے قید بھی کر لیتا تو اُسے ایک سبے روح جسم کے سوا اور کچھ نہ ملتا۔ اُس کے راج رتوں کی چونکٹ عبور کرنے سے پہلے میری آتما اپنے پریم کی بھیٹ چڑھ چکی ہوتی۔" شہزادہ نے اُس کے بازو قلم لئے۔

"مطمینان رکھو، ہمارا بار بے بسی کی موت نہیں مرے گا۔ سلطان معظم کے کانوں تک یہ خبر پہنچ چکی ہے کہ دیورائے رکن کی ایک ہندو لڑکی کو گرفتار کرنے آیا تھا یہ سنتے ہی وہ مشتعل ہو گئے۔ بولے، اب دیورائے سے حساب لے باقی کرنے کا وقت آ گیا ہے اس نے ہماری سلطنت پر نہیں، ہماری عزت اور غیرت پر ہاتھ اٹھایا ہے، ہم ان ہاتھوں کو قلم کر دیں گے۔" پر تھاں کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کی چمک صاف نظر آرہی تھی۔

"تو کیا سلطان عالی کو میرے بارے میں علم ہو چکا ہے۔"

"بے شک!" حسن نے جواب دیا۔ "انہیں یہ اطلاع بھی مل چکی ہے تم نے دیورائے کے پیغام کا جواب خنجر سے دیا تھا۔" سلطان یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔

"ہم اس بہادر لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس نے زبان خنجر سے گفتگو کی۔"

سلطان عورتوں کے متعلق بڑی غیرت رکھتے ہیں انہوں نے دیورائے کے خلاف جنگ کے احکام صادر کر دیئے ہیں۔ احمد خاں خانخاناں کو کوچ کا حکم مل چکا ہے وہ دو ایک روز میں آیا ہی چاہتے ہیں، سلطان نفس نفس جنگ میں شریک ہوں گے ان کا ارشاد ہے سلطانی لشکر کے پہنچنے سے پہلے میں دشمن کو دریائے کے اُس پار بھی چین سے نہ بیٹھے دوں۔ دیورائے نے عہد نامے توڑ دیئے رکن پر حملہ کیا۔ مدگل کی بیٹیوں کو لوٹا اور پھونکا رہا۔ یہی نہیں اس نے مملکت رکن کی ایک بیٹی کی عزت لوٹا چاہی اور یہ جرم ناقابل معافی ہے۔

سلطان عورتوں کی عزت کی خاطر تو اپنی جان کی بازی لگا دیا کرتے ہیں اب وہ اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک بچانگر کی اینٹ سے اینٹ نہیں بچا دیتے۔ جب تک دیورائے کو اس کے جرم کی سزا نہیں مل جاتی۔ جب تک وہ پایہ زنجیر سلطانی بارگاہ میں پیش نہیں کیا جاتا۔“

شہزادہ کی باتیں سن کر پرتھال دم بخود رہ گئی وہ سمجھتی تھی دیورائے کے فرار کے ساتھ جنگ ختم ہو گئی ہے، اب زیادہ سے زیادہ بچانگر اور دکن کی درمیانی سرحد پر پہرہ سخت کر دیا جائے گا تاکہ دیورائے کو دوبارہ ماتحت و تاراج کا موقع نہ مل سکے لیکن اسے کیا خبر تھی۔ اصل جنگ تو اب شروع ہونے والی تھی۔ سلطان نے دلی عہد کو محض تعاقب کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ شہزادہ کے پیچھے پیچھے وہ خود بھی لشکر جرار لے کر چلا آ رہا تھا۔ امیر الامراء احمد خاں خانخاناں اور امیر فضل اللہ آنجو شیرازی عامل برادر فیروز آباد کے احکام مل چکے تھے اور ان کے پیچھے سلطان خود اپنے خاص لشکر کے ساتھ جنگ کا جھنڈا باندھنے روانگی کے لئے تیار تھا۔ اس نے دلی عہد کی جاگیر فیروز آباد ہی کو اپنا فوجی مستقر بنایا تھا کیونکہ گلبرگہ کی بہ نسبت فیروز آباد، بچانگر کی سرحد کے قریب تھا۔ سلطان کے ساتھ محلات کی بیگمیں اور خان زادیاں بھی گلبرگہ سے فیروز آباد منتقل ہو رہی تھیں۔

ایک عظیم اور فیصلہ کن جنگ کی تیاریاں، دیورائے کی تباہی و بربادی کے سامان بھٹی سرداروں کے بعد سلطان دکن کا نفس نفس لڑائی کے لئے نکلتا یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور اس کا سبب۔۔۔ اس کی علت خود پرتھال تھی۔

جنگ کی خبروں نے اسے متوجش سا کر دیا اور خاموش گم صم ہی کھڑی وہ حیرت پاش نگاہوں سے شہزادہ کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا اس کا وجود۔۔۔ اس کا حسن اتنی بڑی جنگ کا پیش خیمہ بن جائے گا؟ یہ بات اس کے اوہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔“
”تم حیران کیوں ہو گئیں؟“

”جنس نے اسے بیہوش و ششدر دیکھ کر پوچھا۔“ ”کیا تمہارے نزدیک ظالم و دیورائے کو اس کے ظلم و ستم کی سزا نہیں ملنی چاہیے۔“
”نہیں جان عالم! ظالم اور اپراوہی کو سزا ضرور ملنی چاہیے لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں

سکتی تھی۔ سلطان میری خاطر اتنی بڑی جنگ لڑنے پر تیار ہو جائیں گے۔

”سلطان عزت کو امارت اور غربت کی ترازو میں نہیں تولتے انہیں مملکت کی ہر لڑکی کی عزت عزیز ہے، وہ مسلمان ہو یا ہندو جو بادشاہ اپنی رعایا کی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ خود بھی قابل عزت نہیں۔“

پھر اُس نے پرتھالی کو بتایا کہ سلطان بہت جلد فیروز آباد پہنچنے والے ہیں اور وہ اُسے اپنے حضور بلائیں گے، سلطان کی بارگاہ میں حاضری کے آداب اُسے یک سجھا دے گا لیکن گفتگو کے دوران اُسے اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں بلکہ دلی عہد کی محبوبہ اور دکن کی ہونے والی ملکہ ہے۔ اسے اپنی باتوں سے سلطان معظم کو متاثر کرنا چاہیے تاکہ وہ اس کے بارے میں بہت اچھی رائے قائم کر سکیں اسی رائے پر اُن کی آئندہ زندگی کا دار و مدار ہے، شہزادہ نے یہ بھی بتایا۔ سلطان معظم کی آمد تک وہ روٹی بیک کے زیر تربیت رہے گی، بیک چند ہی روز میں اُسے ضروری باتیں سکھا دے گا۔ حاضری کے آداب، گفتگو کا بلیقہ، نشست و برخاست کے انداز اور رموز کی وہ باتیں جو سلطان عالم کو متاثر کر سکتی ہیں تاکہ وہ جان لیں کہ دلی عہد کی نگاہ انتخاب نے پھر نہیں پارس تلاش کیا ہے۔ ایک انمول ہیرا جو تاج شاہی کی زینت بن سکتا ہے۔

اب پرتھالی کو معطوم ہوا۔ وہ ایک بہت بڑے اور چاقی سے دو چار ہونے والی ہے اُسے محض اس لئے بلایا گیا ہے کہ سلطان کے حضور پیش کرنے سے قبل ضروری امور سے آگاہ کر دیا جائے۔ اُسے اپنے حسن و جمال کے علاوہ حسن گفتگو سے سلطان کو اپنا ہمنوا بنانا ہے اسے یہ ثابت کرنا ہے۔

وہ عام عورتوں سے مختلف اور حکمرانی کی صلاحیت رکھتی ہے ابور سلطنت میں مشورہ دے سکتی ہے۔

مزاج شاہی سے واقف اور شہزادوں کی محفل میں بیٹھ سکتی ہے۔

گھوڑے کی سواری کر سکتی ہے۔

تیر و شمشیر سے کھیلا جاتی ہے۔

شعر و نغمہ بے رغبت رکھتی ہے۔

مہربانی سے آشنا ہے۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بادشاہ اور راجا۔ درمیانی قاصلوں کو۔

شاعی تقاریب میں حصہ لے سکتی ہے۔

انعام و اکرام دے سکتی ہے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تحریر کلام سے اپنے مخاطب کو متاثر ہی نہیں کر سکتی بلکہ اپنی بات منوانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

شاہی مجلسِ را میں داخلہ سے قبل پر تھال کا ان سب باتوں میں دسترس حاصل کرنا ضروری تھا۔ وہ ایک سار کی لڑکی تھی جس کی تربیت گاؤں میں ہوئی، شاہی آداب و قواعد کو سمجھنا اور ان میں بہت جلد مہارت پیدا کر لینا دیہات کی ایک الہز و شیرازہ کے بس کی بات نہیں تھی لیکن پر تھال نے مسلسل ایک برس تک پنڈت گوروکھ ناتھ سے شعر و ادب اور موسیقی کی تعلیم و تربیت پائی تھی اور ایسی کئی باتوں میں مہارت رکھتی تھی۔ جو صرف شہزادیوں اور راجکماروں ہی کو سکھائی جاتی ہیں۔ گوروکھ ناتھ نے پر تھال کے ماتھے پر خوش بختی کی چمک دیکھ لی تھی اسی لئے وہ اسے اعلیٰ تعلیم دیتا رہا تھا اور آج وہی تعلیم اس کے پریم کی ماؤ کی پتوار بن گئی تھی۔

شہزادہ بہت جلد اپنے جنگی پڑاؤ کی طرف واپس چلا جانا چاہتا تھا۔ جہاں اُس کے خاص پرچم کے چھ ہزار بھگینی حواریں سوئے کھڑے تھے۔ پر تھال کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اُس نے لکھپت سار کو بلایا۔

بوڑھا جب ولی عہد کے خیمہ میں داخل ہوا۔ وہ حیرت و استعجاب کی سی کیفیت سے دو چار تھا جیسے وہ جاگتے میں کوئی پُر شکوہ خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک غریب سار کی ولی عہد و بگینی کی بارگاہ میں عزت و تکریم کے ساتھ پیش ہونا ایک ایجنہاء ایک خواب ہی تو تھا۔ حیرت و مسرت کے مارے اس کے بدن پر لرزہ سا طاری تھا۔ ولی عہد نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا روئی بیک اس کے ساتھ تھا۔

جب وہ کورٹش کی رسم ادا کر چکا تو ولی عہد نے اپنے قریب مسند پر بٹھایا اُس کی خیریت پوچھی اور اُسے یہ خوشخبری سنائی کہ سلطان معظم اس کی بگینی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں لہذا تربیت کے لئے وہ کچھ روز روئی بیک کے زیر نگرانی رہے گی۔ لکھپت کو بٹھار اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے یہی اعزاز بہت تھا کہ سلطان نے اُس کی بگینی سے

ملنے کی خواہش کی تھی۔

سنا سوچ رہا تھا پر تھا حال کی زندگی سنہرے سپنوں میں ڈھل چکی ہے شاید اب اُن سپنوں کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔

رخصت سے قبل ولی عہد نے لکھت کو ایک ظلعیت فاخرہ عطا کیا اس کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے اور دماغ میں جیسے پھلجھریاں سی جھوٹ رہی تھیں، اسی کیفیت میں وہ ولی عہد سے رخصت ہوا۔ پر تھا حال ہوئے ہوئے قدم اٹھاتی اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ خیمہ کے دروازہ سے اس نے پلٹ کر شہزادہ کی طرف دیکھا، اس کی نگاہوں میں ایک دعوت ایک التجا تھی۔ جیسے وہ خاموشی کی زبان سے کہہ رہی تھی۔ ”جان عالم! میں آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی گی۔ سلطان عالی کے بیٹے سے پہلے ہی آجائیے۔ میں تنہا اُن کے حضور نہ جا سکتی گی۔“

ولی عہد کی نگاہیں دُور تک اُن کا تعاقب کرتی رہیں حتیٰ کہ اُن کے سنائے اندھیرے میں گھل گئے۔



شہباز خاں کے رُخ بھر چکے تھے اور وہ ولی عہد کے ہمراہ جنگی گاڈو پر جانے کے لئے بیتاب تھا۔ شہزادہ نے اُسے اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی۔ دوسری صبح ابھی سورج کو طلوع ہوئے چند ساعتیں گزری تھیں کہ حسین نے اپنے گھوڑے کی باگ دریا ئے تک بھدرا کی طرف موڑ دی، شہباز خاں اس کے پیچھے پیچھے تھا اور اپنے خیمہ کے دروازہ پر پر تھا حال گم صم کھڑی انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد جب گوری نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا تو اسے معلوم ہوا شہزادہ کی سواری ابھی کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے اور وہ خیمہ کی طاب تھا گئے خالی راستے پر نظر میں جائے کھڑی ہے۔

وہ جلدی سے مڑی اور خیمہ کے اندر بھاگ گئی۔ گوری حیران و ششدر اسے دیکھتی رہ گئی۔



سپاہیانہ جوش

کوشک ہائے سلطانی

وکن کی تاریخ ایک نیا ورق اُلٹ رہی تھی۔

فیروز آباد۔۔۔ جسے سلطان فیروز شاہ بہمنی نے آباد کیا تھا اس وقت سلطانی فوجوں کی بہت بڑی چھاؤنی بن گیا تھا۔ گلبرگہ، دولت آباد، ساغر اور برار کی فوجیں شہر سے باہر جمجھورہ ندی کے کنارے کنارے خیمہ زن تھیں۔ فیروز آباد کے باہر ایک اور فیروز آباد فوجی چھاؤنی کی صورت میں آباد ہو گیا تھا۔

سلطان عالی کا لشکر خاص جو صرف سلطان کے سپاہ پرچم کے نیچے لڑتا تھا۔ قلعہ میں کوشک ہائے سلطانی کے آس پاس پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔

فیروز آباد فوجی شہر بن گیا تھا۔

قلعہ کی بلند و بالا مدور برجیوں اور بڑے بڑے کنگوروں پر سپاہ پرچم لہرا رہے تھے۔

فیروز آباد کا پُر شکوہ دربار عام فوج کے سپہ سالاروں اور لشکرچیوں سے چا پڑا تھا سلطانی امیر جنگی لباس پہن کر نکلے تھے اُن کے کمرورے نیچروں پر خشونت کے آثار تھے اور آہنکھیں غیظ و غضب کا اظہار کر رہی تھیں۔ یقیناً انہیں کوئی بڑا معرکہ درپیش تھا کیونکہ سلطان جنگی کونسل کا اجلاس اسی وقت کرتا تھا جب اُسے کسی اہم جنگ کے لئے اپنے امیروں سے صلاح مشورہ لینا ہوتا تھا۔

وہ اپنے لشکرِ خائن کے ساتھ خسن آباد گلبرگہ سے چل کر فیروز آباد میں آیا تھا جو اس کا

سرحدی دارالحکومت تھا۔ گلبرگہ سے روانگی سے پہلے ہی اُس نے دولت آباد، ساغر اور ہرار کے لشکروں کو فیروز آباد پہنچنے کے احکامات بھی دیئے تھے اور بھانگر کے مہاراج دیورائے کے خلاف اشتہار جنگ دے دیا تھا لیکن فیروز آباد کے دربار عام میں وہ اپنے سپہ سالاروں، لشکریوں اور شہریوں کے سامنے اشتہار جنگ کی وجہ بیان کرنا چاہتا تھا۔

سلطان کی فوج میں ترک، خطائی، افغان، راجپوت، بنگالی، گجراتی، تلنگی، کھتری اور مراٹھی، ہر نسل اور ہر قوم کے سپاہی موجود تھے اور وہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے ساتھ مریانہ سلوک کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی سپاہی بھی اُس پر جان چھڑکتے اور اُس کے اشارہ پر ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتے تھے۔

دیورائے نے کئی مرتبہ کوشش کی، وہ سلطانی فوج کے راجپوتوں، کھتریوں اور مراٹھوں اور بنگال، گجرات اور تلنگانہ کے ہندو بہادروں کو جو سلطانی پرچم کے نیچے داؤ شجاعت دیتے اور بھمنی فوج میں اہم عہدوں پر ممتاز تھے دھرم کے نام پر نہ صرف بغاوت پر آمادہ کرے بلکہ انہیں اپنے ساتھ بلا لے لیکن سلطان کے حسن سلوک، عدل و انصاف اور ہر مذہب و ملت کے ساتھ مساوی سلوک نے ہندو لشکریوں کو بھی اُس کا گرویدہ بنا رکھا تھا اور وہ اسی طرح سلطان کی ونا داری کا دم بھرتے، جیسے مسلمان سپاہی اس کے اطاعت گزار تھے۔

سلطان خود اگرچہ امامیہ کے شعار کا پابند اور ملامت خاں سرہندی کا معتقد تھا لیکن وہ سرزمین دکن کے لاکھوں ہندوؤں کا بھی بادشاہ تھا۔ دارنگل، تلنگانہ اور گونڈوانہ کے ہزاروں بہادر اس کی فوج میں ملازم تھے اور وہ اُن کے حقوق و مفاد کی نگہداشت خود کرتا تھا اس نے جہاں بزرگوں کے مقام اور اسلامی عبادت گاہوں کی تعمیر میں دل کھول کر روپیہ صرف کیا وہیں ہندوؤں کے لئے مندر اور شوالے بھی تعمیر کرائے تھے حتیٰ کہ دیو بھانگر کے اُن یاتریوں کے آرام و طعام کا بندوبست بھی کرتا تھا جو کاشی یا ترا کے لئے اس کی مملکت سے گزرتے تھے یہی وجہ تھی۔ جہاں دکن کی مسجدوں میں اُس کی فتح و نصرت کے لئے دعائیں ہوئی تھیں وہاں مندروں اور شوالوں میں پجاری اس کے نام کا سنگہ پھونکتے اور اُس کی ترقی اقبال کے لئے پراتھما کرتے تھے۔

ایک بے تعصب صلح جو اور رحمان تھا لیکن جب کوئی دشمن اس کے ساتھ کئے ہوئے عہد ناموں کی خلاف ورزی کرتا۔ صلح کے مفاد سے توڑتا اور اس کی مملکت میں تاخت

تھا۔ اس کا ہاتھ اچھل کر شمشیر کے قبضہ پر جا پڑتا اور اس کی آنکھیں شعلے اُگنے لگتیں۔

وہ اپنی مملکت میں کسی حریف کو جبر و تعدی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا اس کی موجودگی میں کوئی دشمن اُس کی رعایا کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا وہ اپنی رعایا کے جان و مال کا محافظ تھا۔ اگر وہ عزت کے لٹیروں کی سرکوبی نہ کرے تو ملک سے امن و امان اُنھ جائے اور بھیڑیے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح چیر پھاڑ کر کھا جائیں اُن کی شرارگوں کا خون چاٹ لیں اور اُن کے جسموں کی بوٹیاں اڑا دیں۔

دیورائے سے بھی یہی حماقت سرزد ہوئی تھی اگرچہ وہ سلطان کا باجگوار تھا لیکن پر تھاں کے شعلہ حسن نے اُس کے ہوش و حواس جلا کر خاک کر دیئے تھے وہ اس گلابدن کو حاصل کرنے کے لئے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ وکن کی سرحدی بستیوں پر حملہ آور ہوا تھا اور سلطان کے نزدیک اس کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ قطعی طور پر ناقابل معافی۔

لڑکی ہندو ہو یا مسلمان، مملکت کی عزت تھی اور کسی کی عزت پر اُٹھنے والے ہاتھوں کے متعلق سلطان کا ایک ہی حکم تھا "ان کو قلم کر دو۔"

دیورائے کے ہاتھ قلم کرنے اور اُسے وکن کی بستیوں پر حملہ کی سزا دینے کے لئے سلطان نے جنس جنس جس جنگ کا جھنڈا باندھا تھا۔ دیورائے کے خلاف اشتہار جنگ دیا تھا اور اپنے فوجی امیروں کو حکم بھیجا تھا۔ وہ لشکروں سمیت فیروز آباد پہنچ جائیں۔

اور فیروز آباد اس وقت ہمینی لشکروں کا خیمہ و درگاہ بن چکا تھا۔ چھوڑ دندی کے کنارے حیدر نظر تک سپاہیوں کی چھو لدا ریاں نصب تھیں۔ ترک، خطائی، افغان، بکتری، راجپوت، غزنی اور تلنگی سورا اپنے اپنے جھنڈوں کے نیچے سلطان عالی کے حکم کے منتظر تھے۔ فوجی امیر عامل، سپہ سالار اور معزز شہری جنہیں حاضری کا شرف حاصل تھا مددِ یارِ غایم میں سینوں پر ہاتھ باندھے ہمینی لشکران کے لئے چشمِ براہ تھے اور سب لوگ یہ سننے کے لئے بیتاب و مضطرب تھے وہ دیورائے کی قسمت کا کیا حکم سنائے کرتا ہے۔

جنگی کنسل

شاہی محل کی برجوں پر قرعہ بازی پر بیٹ آواز کے ساتھ ہی جیب سلطان معظم طرہ شاہی

سے مرصع فولادی خو اوڑھے، زرہ بکتر پہنے اور بازوؤں پر لوسے کی چمکدار آستینیں چڑھائے اپنے کمرۂ خاص سے باہر نکلا تو لمبے ترنگے نیزہ بردار محافظوں نے ایک ساتھ اپنی گردنیں خم کر دیں اور اس کے ساتھ عمل کی بلند بالا اور طویل راہداری میں شاہی نقیب کی آواز گونجنے لگی۔

”جد آداب..... پیش نظر..... آمد سلطان ظفر“

آداب و دستور کے مطابق مراہم و رہبر یا مشاورت پر سلطان کو اس کے تمام القابات و خطابات کے ساتھ پکارا جانا ضروری سمجھا جاتا تھا تاکہ ہر شخص اُس کی عظمت اور بلند درجات سے آگاہ رہے اس مقصد کے لئے خاص نقیب اور چادش مقرر تھے۔ جو سلطان کے آگے آگے القابات و خطابات کے ساتھ اس کی آمد کا اعلان کرتے جاتے تھے بعض اوقات ایک ہی شخص یہ خدمت سرانجام دیتا تھا اور کبھی کبھار کئی نقیب آمد شاہ کی خبر دیتے تھے۔

شاہ کی آواز آمد سلطان کا اعلان کر کے خاموشیوں میں تحلیل ہو گئی لیکن اس سناٹے میں نقیب کی پوزیشن اور رخسار پر آواز جس میں بگلی کی سی چمک لپک اور رعد کی سی کڑک دھمک تھی۔ بدستور گونجتی اور گرجتی تھی۔

جد آداب..... پیش نظر..... آمد سلطان ظفر

آفتاب و کن..... شاہ لشکر شمس.....

عالم پناہ..... فیروز بخت و سکندر خواہ.....

سلطان ابن سلطان.....

خاقان ابن خاقان، ظلی بجاہی..... ہادشاہ غازی، ابو المظفر الخاوری، سلطان فیروز شاہ بہمنی، الملقب بروز افروز شاہ ابن داؤد شاہ بہمنی، اورنگ نشین و کن خلد اللہ ملکہ، و سلطنت، تشریف لائے ہیں۔

جد دوسرے، پیش نظر، آمد سلطان ظفر سرگنوں، نثار دہرو۔

نقیب کی گرجتی ہوئی آواز نے قصر شاہی کے در و دیوار پر جیسے ایک زلزلہ سا طاری کر دیا تھا۔ یہ آواز برق و رعد کی طرح قصر عالی سے دربار تک گونجنی چلی گئی اور چاروں طرف ایک پر شکوہ، پر عظمت سناٹا چھا گیا۔

ی

سلطان تھے، اسے پروقار قدموں سے راہداری عبور کرنے لگا۔ اس کے آگے آگے
دس قدم کے فاصلے پر نقیب شاہی نشان اٹھائے اس کی جلال افروز سواری کی خبر دیتے جا
رہے تھے اور ان کی مصیبت آوازیں شاہی محل سے ایوان عام تک سنائی دے رہی تھیں۔
سلطان چلا رہا۔ آوازیں گونجتی رہیں۔

اُس نے پورے دو سال کے بعد جنگی لباس زیب تن کیا تھا۔ فولادی ٹوپی کے نیچے
لوہے کی جالی دار زنجیر کندھوں تک لٹک رہی تھی۔ آہنی سیز بند پر سلاطین ہمکنی کا خاص
نشان ”عقاب“ اپنے دونوں پردوں کو پھیلانے ہوئے جیسے فضا میں جھپٹ رہا ہے۔

فولادی ٹوپی کے نیچے اس نے سیاہ پٹکا باندھ رکھا تھا، جو اس کی ٹھوڈی پر حملے کے
ہوئے اوپر چلا گیا تھا۔ کمر میں وہ خاندانی کموار آویزاں تھی جو تلخ و تخت کے ساتھ اُس نے
بزرگ حاصل کی تھی۔ یہ اس امر کا اعلان سمجھتی جاتی تھی کہ اُسے کوئی اہم ہم درمیش ہے۔

سلطان کی عقابی آنکھوں میں سرخ زورے اس کے دلی جوش و خروش کے مظہر تھے اور
ہاتھ کے شکن کسی بد نصیب کے خیل تقدیر پر خندہ زن تھی۔

راہداری سے نکل کر وہ بڑے بڑے مدور ستونوں والے برآمدے میں نمودار ہوا۔ مسلح
پہرے داروں نے یہاں بھی اپنے سر جھکا دیئے جو جنگی کمواریں دو روپہ کھڑے تھے۔

دربار کے موقع پر محل سے ایوان عام تک پہلی محافظوں کا پیرہہ رہتا تھا نیزہ بردار اور
تاج بدست سپاہی جو ”جانباز“ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے ان راستوں پر چاق و چوبند
کھڑے رہتے تھے جہاں سے سلطان ”عظم کو گزرتا ہوتا تھا۔ نقیب کی آواز انہیں ہشیار و
مستعد کر دیتی تھی اور سلطان کے قدموں کی چاپ سننے ہی ان کے جسموں میں جیسے بجلی کی
سی لہر دوڑ جاتی اور ”سیرگون، نگاہ رو برد“ کی لٹکار کے ساتھ ہی وہ مؤدب کھڑے ہو کر اپنی
گردنیں خم کر دیتے تھے۔

جب ایوان عام کے محلاتی دروازے پر ”حبہ ادب، پیش نظر، آمد سلطان ظفر“ کی
پر شکوہ اور دلولہ انگیز جندا ابھری تو بیک ساتھ ہزاروں نگاہیں دروازے کے اٹلسی پردہ پر
سرنگر ہو کے رہ گئیں۔

دوسرے ہی لمحہ پردہ کو حرکت ہوئی مجاہد خاص نے اٹلسی پردہ اچک لیا ”اور سیرگون
نگاہ رو برد“ کی آواز کے ساتھ سلطان شاہانہ تمکنت اور رعب و وقار کے ساتھ ایوان عام

میں داخل ہوا۔

جب المل دربار نے ہنگی ہوئی گردنیں اوپر اٹھائیں، وہ تخت زریں پر مستکن ہو چکا تھا اور قاضی القضاۃ علامہ منہاج آئین دربار کے مطابق سلطان کی جلوہ آرائی کا مقصد بیان کر رہا تھا۔

قاضی منہاج کی آواز وسیع و بلند اور کشادہ ایوان میں سمندری موجوں کی طرح ڈونڈی اور ابھرتی رہی۔ سب لوگ دم سادھے چپ چاپ کھڑے تھے اور سلطان کی نگاہیں طاہرانِ اعزاز میں ان کے چہروں پر پرواز کر رہی تھیں۔

ایوان عام بیسیوں مدور ستونوں پر کھڑا تھا جن پر ہمکنی فن تعمیر اور نقش و نگار سے منقوش محرابیں ہلالی سنگروں کی شکل میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ ستونوں کے ساتھ سرسری خوشبو والی بنیں برآمد وعود اور لوبان سلگ رہے تھے اور معطر دھوئیں کی لہریں بیچ و خم کھاتی ہوئی ستونوں کے بلبلہ روان تھیں۔

مسند شاہی سے چند قدم کے فاصلے پر ایوان کے بیرونی دروازوں تک کم و بیش پانچ ہزار انسان سینوں پر ہاتھ باندھے تقاریر و آثارِ مذکورہ کھڑے تھے۔ امراء و وزراء، سردارانِ فوج، غلام ملک، مصاحبین دربار اور سلطنتِ ہندی کے وفادار اپنے اپنے منصب اور اعزاز کے مطابق حاضر تھے۔

جب قاضی القضاۃ سلطان کی مسند آرائی کا مقصد بیان کر چکا تو سلطان نے امیروں اور مشیروں پر نگاہ دوڑائی۔ دربار عام میں قاضی القضاۃ شہزادوں، سپہ سالاروں و کمال سلطنت، صدر جہاں اور علماء کرام کے علاوہ چند خاص مشیروں کے سوا اور کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی، حکم تھا کہ سب لوگ جنہیں حاضری کا شرف حاصل ہے دربار میں ایستادہ رہیں اور چند خواص کو بھی محض اس لئے بیٹھنے کی اجازت تھی کہ انسانوں کے جھوم میں تباہ بیٹھنا معیوب سمجھتا تھا۔

مسند کے دائیں بائیں ہوشیار عین الملک اور بہادر نظام الملک جلوہ فرما تھے جو اپنی کمال وفاداری کی وجہ سے سلطان کے اپنے حد منظورِ نظر ہو گئے تھے اور امیر سلطنت کی باگ و درانی کے بعد میں بھی حتیٰ کہ سلطان سے ملاقات کے لئے ان کی منظوری حاصل کرنا ضروری تھی۔

تختِ سلطانی کے نیچے قاضی القضاۃ اور خاص علماء کی مسند تھی جس پر علامہ منہاج، مولانا لطف اللہ سبزواری، قاضی سراج، عالم غلیات حکیم حسن گیلانی، سید محمد کاروئی وغیرہ بیٹھے اور بوقت ضرورت سلطان کو مناسب مشورے دیتے تھے۔

دائیں جانب فرزید سلطان شہزادہ حسن خاں جسے ولی عہد کا شرف حاصل تھا اور جس کی کمان میں آٹھ ہزار سوار ہر وقت احکام کے منتظر رہتے تھے اپنے مخصوص لباس اور نشان کے ساتھ کرسی نشین تھا۔ وہ دریائے ننگ بھدرا کے اس پار اپنے فوجی پڑاؤ سے سلطان کی آمد کی خبر سن کر اپنے چند مشیروں کے ساتھ حاضر دربار ہوا تھا اور اُس کے بعد حاکم مدگل فولاد خاں سیستانی محاذِ جنگ کا مقرر تھا۔

اس کے ساتھ ہی وکیلِ سلطنت صدر جہاں امیر فضل اللہ آنجو شیرازی کی کرسی تھی، جو امورِ سلطنت میں سلطان کا مشیر خاص ہونے کے علاوہ برادر کی فوجوں کا سالار بھی تھا۔ 703ھ میں اُس نے کھتر کے حاکم زنگہ رائے کے خلاف بڑی بہادری سے جنگ لڑی اور فتح پائی تھی۔ جس کے بعد وہ سلطان کا منظور نظر بن گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ سلطان کے ساتھ اُس کی رشتہ داری بھی قائم تھی۔ اس کی بیٹی فرزید سلطان شہزادہ حسن خاں کے نکاح میں تھی اور سلطان کی اپنی ایک بیٹی صدر جہاں کے بیٹے میر شمس الدین محمد آنجو کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے سلطان کے ساتھ اُس کے تعلقات خاص نوعیت کے تھے۔ صدر جہاں کا عہدہ یعنی سلطنت میں سب سے اعلیٰ تھا اور بادشاہ اُس کی رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا خود سلطان کو استاد فضل اللہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا اس لئے دربار میں اس کی عزت و تکریم کے متعلق کوئی شخص غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا۔ سکا، گوڈوانہ، دارنگل اور بیجے نگر میں اس کی بہادری کی دھاک بیٹھی تھی اور اتنی سی بات پر کوئی جانتا تھا۔ جس معرکہ میں صدر جہاں فضل اللہ شیرازی شریک ہوتا ہے اس میں کامیابی ہمیشہ سلطانی سپاہ کے قدم چومتی ہے۔

تخت کے بائیں جانب سلطان کا جنگجو، شجاع اور بہت اگلیں بھائی احمد خاں بمبئی جلوہ افروز تھا جو سلطانی افواج کا سپہ سالار، امیر الامراء اور خاں خانانوں کے معزز ترین لقب سے سرفراز تھا وہ سلطان کا وقار دار اور خود کو بمبئی تخت و تاج کا محافظ سمجھتا تھا۔ اس نے ہر معرکہ میں شجاعت اور تیغ زنی کے جوہر دکھائے تھے اور رگن میں لوگ اس کی بہادری کی قسم

کھایا کرتے تھے، شہزادہ حسن خاں کی طرح اُسے بھی شاہی کفنی، شاہانہ چٹا، چتر سراپہ وہ سپاہ خاص، ہاتھی اور تخت حاصل تھے۔

اس کے ساتھ ساغر کے قلعہ کا حاکم میاں سدھو جو سرنوتی کے منصب پر فائز تھا کرسی نشین تھا اور اس کی بائیں سمت حاکم کھتر لہ رنگہ رائے کا جواں امت بیٹا کوسل رائے جو ہراول دستوں کا نگران تھا۔ بقدر حکمت بیٹھا تھا۔ جس نے سلطان سے عزم و وفا باندھا تھا۔ علمائے کرام کی مسند کے سامنے میر فضل اللہ آنجو شیرازی کے لڑکے میر شمس الدین (سلطان کا داماد) اور میر غیاث الدین فرقید خانخاناں، علاؤ الدین، شیر خاں (خانخاناں کا بھتیجا) میر تقی الدین محمد (صدر جہاں کا داماد) اور دوسرے جنگجو سوارے، ارگو خاں، مظفر قباچہ اور قلعہ الدین وغیرہ ایستادہ تھے۔

سلطان کی طرح یہ سب امیر اور بہادر لوہے کا لباس پہن کر آئے تھے کیونکہ وہ جنگی کونسل کے خاتمہ کے بعد عموماً محاذ جنگ کی طرف کوچ کے احکام صادر کرتا تھا اور روانگی میں ایک ساجت کی بھی تاختیں ہوتی تھیں اس لئے ایسے موقع پر پہ سالار اور فوجی افسر عموماً جنگی لباس پہن کر حاضر دربار ہوتے تھے۔ اہم جنگوں اور مہموں سے قبل سلطان ایوان عام میں جنگی کونسل کا اجلاس بلاتا اور سرداران فوج کو اپنے فیصلوں سے مطلع کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس موقع پر کوئی شخص جسے دربار میں کوئی منصب یا اعزاز حاصل تھا غیر حاضری کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

سب لوگ جانتے تھے سلطان بجے نگر کے مہاراج دیورائے کے خلاف اہم فیصلہ صادر کرنے والا ہے۔ قاضی منہاج نے بھی اس کی جلوہ آرائی کا مقصد بیان کرتے وقت دیورائے کا تذکرہ کیا تھا۔ سلطان نے ایک ہاتھ سے تخت کے پایہ کو تھام لیا اور آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑے صبر و تحمل سے کام لے رہا ہے لیکن بدترجیح اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ سب لوگ گوش بر آواز تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔

”تم جانتے ہو ہم نے بچے نگر کو بڑے شہساز فتح کیا تھا۔ اگر چاہتے تو اس سلطنت کی ایک سے ایک شاخاویہ اسے اپنی سلطنت کا صوبہ بنا لیتے مگر ہم نے یہ پسند نہ کیا۔ دیورائے کی درخواست صلح منظور کی، اس نے ہمیں بندرانے اور تالان دے کر رخصت کیا اور یہ عہد کیا کہ وہ آئندہ ہماری حدود کے اندر

ناخت و تاراج نہیں کرے گا۔ مابعدت کو ہر سال جزیہ ادا کرے گا اور جب ہم اسے بلائیں گے۔ وہ ہمارے حضور میں پیش ہو گا، لیکن مہاراج دیورائے نے ان تمام وعدوں کو فراموش کر دیا۔ جزیہ کی ادائیگی روک دی۔ ہماری حدود سلطنت پر حملہ آور ہوا اور امن و آشتی کے تمام عہد توڑ کر ہماری سرحدی رعایا کے جان و مال کا دشمن بن گیا۔

بہیں بتایا گیا ہے اس نے مدگل کے علاقہ میں ایک ہندو سنار کی نو جوان اور حسین لڑکی پر تعال کو حاصل کرنے کے لئے اپنے راج گورو کے ساتھ ایک مہم روانہ کی تھی۔ جب پر تعال نے اس کا پیغام مسترد کر دیا اور بیگانہ جانے پر آمادہ نہ ہوئی تو دیورائے کا پیادہ ظلم و ستم لہریز ہو گیا اس نے اپنے سواروں کو ساتھ لیا اور رات کے اندھیروں میں دریائے ننگ بھندرا کو عبور کر کے اچانک مدگل کی بستیوں پر حملہ کر دیا۔ اس نے گاؤں کے گاؤں پھونک ڈالے۔ ہماری وفادار رعایا کو قتل کیا۔ ان کے گھر لوٹے اور باہی و بربادی کا دیوتا بن گیا۔

باہی کی خبریں پہنچتے ہی ہم نے شہزادہ حسن خاں کو دیورائے کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی فواد خاں سیستانی نے دیورائے کو دریا کے اُس پار بھجنا دیا تھا لیکن اُس کے اچانک حملہ سے جان و مال کا جو نقصان ہوا ہے ابھی اُس کی تلائی نہیں ہو سکی۔ دیورائے اس سے پہلے بھی عہد نامے کی خلاف ورزی کر چکا ہے لیکن ہم اس لئے خاموش رہے شاید ہماری خاموشی ہی اُسے براہ راست پر ڈال دے لیکن اُس نے ہماری مملکت کی ایک مجبور و بیکس لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈال کر ہماری غیرت کو لٹا کر اے ہم اُس کا یہ جرم کبھی معاف نہیں کریں گے۔“

سلطان کی آواز ایران میں گونج رہی تھی اور سب لوگ ہلاکت و مہانت اُسے جوش غضب میں شعلے اُگلنے دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں جبرست انگیز طور پر چمک رہی تھیں۔ اچانک اُس نے صدر دروازہ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تو نہ تیرا کہہ دے کہ میں نے یہاں سے جلا کر شہر لے گا۔“

پھر اُس نے بلند آواز سے حکم صادر کیا۔

”پرتھال کو حاضر کیا جائے۔“

صدر دروازے کے پاس ایک مصاحب نے گونگ پر ضرب لگائی ایک آواز یوں گونج گئی جیسے نوبت پر جوت پڑی ہو۔

سلطان کے حضور میں

شہزادہ حسن اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سب لوگوں کی مضطرب نگاہیں صدر دروازہ کی طرف اٹھیں اور حسین و ماہ جمال پرتھال رونق بیک کی معیت میں دربار میں داخل ہوئی۔ وہ شہزادیوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی اس کے پیچھے نکپت سنار اور گھاؤں کا کھیا کا کاسکھ دیو بھی سر جھکائے چلے آ رہے تھے۔

اہل دربار نے پرتھال کو دیکھا تو سب اُس کے جمال جہاں آفریں پر دم بخود رہ گئے۔ اکثر لوگ اپنی آنکھیں جھپکاتا بھول گئے۔ کئی دل دھڑکے اور بیٹھوں میں خون نہایت تیزی کے ساتھ سرسرا نے لگا۔ خود سلطان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اس کی حیرت پاش لگاہیں پرتھال کے منور اور درخشاں چہرے پر جم کر رہ گئیں اور حیرت و اضطراب کے عالم میں اس نے تخت شاہی پر پہلو بدلا۔

”کیا سچ ہے اسی چاند کے کڑے کا نام پرتھال ہے۔“

سلطان حیرتوں میں ڈوبے لگا اور پرتھال اپنی سحر انگیز رفتار کے ساتھ تخت شاہی سے چند قدم کے فاصلے پر رک کر کورٹش کی رسم ادا کرنے لگی۔ رونق بیک نکپت سنار اور کچھ دیو اس کے ساتھ ہی سرنگوں ہو گئے۔

”مڑی!“

سلطان کی آواز گونجی اور پرتھال سر دھڑکھڑی ہو گئی۔ شہزادہ حسن کے چہرے پر ہوائیاں ہی اُٹنے لگیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہیں پرتھال سلطان کی باتوں کا جواب دیتے وقت کوئی لغزش نہ کر بیٹھے۔

”کیا تمہارا نام ہی پرتھال ہے؟“

سلطان نے زعب دار آواز میں پوچھا۔

”سلطان معظم! کینرہی کو پرتھال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔“
لوگوں کو اپنے کانوں میں چاندی کی گھنٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہوئیں اور سلطان بھی
اس مترنم اور سحر آلود آواز پر چونک اٹھا۔ پھر اس نے رونق بیک کو اس کے ہمراہ دیکھ کر
حیرت سے پوچھا۔

”رونق بیک تمہاری موجودگی کا مطلب؟“
”ظلی سبحانی! جب سے پرتھال کا گاؤں تباہ ہوا ہے یہ اپنے والدین کے ساتھ خانہ
زادہ کے زیر سایہ رہتی ہے۔“

بیک کا جواب اگرچہ مختصر تھا لیکن سلطان نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا وہ جانتا تھا
اس کی تربیت میں رہنے والی لڑکیاں شاہی آداب سیکھنے میں دیر نہیں لگاتیں۔
”لیکن ہم نے تمہیں یہ اختیار نہیں دیا تھا۔“
”غلام جالب عالم کے حکم پر پرتھال کی نگرانی کر رہا ہے۔“
”بارک اللہ!“

سلطان نے معنی خیز نگاہوں سے شہزادہ حسن کی طرف دیکھا۔ سلطان کو اپنی طرف
متوجہ دیکھ کر شہزادہ بڑے باوقار انداز میں کھڑا ہوا اور بولا۔

”اہلی حضرت! دیورائے کے حملہ کے بعد میں نے پرتھال کی نگرانی ضروری سمجھی مگر
اور فیروز آباد کا علاقہ میرے ماتحت ہے میں جانتا تھا سلطان حضور مجھ سے باز پرس کر سکتے
ہیں۔“

شہزادہ کے جواب پر سلطان نے اپنی نگاہ سے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے بیٹے
ہی وہ پھر پرتھال کی طرف متوجہ ہوا۔ جو ایک سحر زدہ دیکر کی طرح مودب کمزنی تھی سلطان
کہنے لگا۔

”لڑکی! کیا تم کبھی بچے مگر گئی ہو۔“

”نہیں عالم پتاہ! کینرہ کو ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہے تم نے دیورائے کو نہیں دیکھا۔“

”دیکھا بے شک نہیں لیکن اس کے انسانے ضرور دے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

"عالی جاہ!" پر تھاں اپنی موتیقی نواز آواز میں بولی۔

"مہاراج دیورائے کا راج رتو اس عورتوں کا ایک باڑہ ہے۔ جہاں ان غریبوں کے ساتھ بھیل بکریوں کا ساسلوک ہوتا ہے جہاں ان کی جوانی ٹوٹے ہوئے پھول کی مانند مر جاتی ہے اور محسوزائی کلیوں کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" سلطان کے لہجے میں تعجب کی جھلک تھی۔

"کینز سب کچھ جانتی ہے سلطان نالی!" ایک لمحہ اس نے رک بکر جواب دیا۔

"بچے مگر کے راج گورو پنڈت گورو کا تاتھ میرے بھی گورو ہیں۔ میں نے راگ دڈیا انہی سے سیکھی تھی۔ دیورائے کے رتو اس کی حقیقت انہی کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ شاید عالم پناہ نے ساعت فرمایا ہو گا۔ وہی تو میرے لئے بیچے مگر سے سندس لے کر آئے تھے۔"

"الہم نے اس سندس کا کیا جواب دیا؟"

"میرے آقا اکثر نے اس سندس کے جواب میں ایک خنجر روانہ کیا تھا۔"

"خوب!" سلطان تخت پر اچھل کود کی قسم تم خنجر لے کر آئے جواب دیا۔

دکن کی ہر بٹی کو غیرت مند ہونا چاہیے۔ ہماری مملکت بدلی گریباں عیاش حکمرانوں کے لئے تفریح کا کھلونا نہیں۔ پر تھاں! مہاراجت تمہاری بہادری پر خوش ہوئے۔

"میرے آقا کی ذرہ نوازی ہے۔"

"اور اس واقعہ کے بعد دیورائے اپنے اڈو لشکر کے ساتھ تمہیں گرفتار کرنے آیا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"آقا حضور کو بالکل صحیح خبر ملی ہے۔" پر تھاں غصے اور بھیکے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میرے آقا پر مددگی کی بستیوں پر ایک قیامت بیت گئی۔ دیورائے خون کے چھینٹے اڑاتا اور لکڑیوں کے گاؤں نذر آتش کر رہا تھا آگے بڑھا۔ موت کی دیوی اس کی ہر کاب تھی اس بھیا تک سے زندگی کی تلاش میں ہم اپنے گھروں سے نکلے اور پہاڑی دروں میں روپوش ہو گئے۔ جہاں گھنی گھنی آتشیں نضا میں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ بعد میں ہمارے گھر پھینک دیئے گئے۔ ہمارے چھوٹی سی سوراخ۔" میں تہذیب اور دیورائے نے ...

ہینکروں ہونٹوں سے زندگی کی سٹرا نہیں تھیں۔ انیس موت کی چٹکیاں بخش دیں اس کے

جیون کی پانی لٹ گئی۔ اگر میرے پاس آتا ہے تو میں اسے چاہوں گی۔
 زاری سنی ہوتی۔ جنہیں بچا مگر کے سوراخوں نے نیزوں پر اچھا تو میرے آقا غم و اندام
 سے تڑپ اٹھتے۔ مدگل کی جلی ہوئی اجازتیں اور راکہ کی ڈھیریاں جہاں کبھی ہنستے ہنستے
 گھر وندے آباد تھے۔ سلطان معظم کے نام کی رہائی دے رہی ہیں۔۔۔۔۔ عالی جاہا موت کی
 پر چھائیاں ابھی تک زندگی کے دیوالوں میں سرگرداں ہیں۔ اور میں اپنے رحل آقا کے
 عدل و انصاف کا وہن تھام کر فریاد کرنے آئی ہوں۔ کیا ہمیں بہادروں کی تلواریں کند ہو
 چکی ہیں؟ کیا ان کے نیزوں کے پھل مڑ گئے ہیں؟ کیا ان کے تیروں کی انیاں ٹوٹ چکی
 ہیں؟

”لڑکی!“

اچانک سلطان کی رد بردوش آواز کا کڑکا سنائی دیا اور جوش غضب میں کانپا ہوا وہ
 مرمریں محراب کے ستون تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی شہزادے عائدین سلطنت
 اور ملائے کرام نہایت جلالت سے حرکت میں آئے اور اپنی جگہیں چھوڑ کر مؤدب طریق سے
 کھڑے ہو گئے۔ جب سلطان نفس نفیس کھڑا ہو تو دربار میں کوئی شخص بیچنے کی گستاخی نہیں
 کر سکتا تھا۔

ایوان پر ایک مبہب سناٹا طاری تھا۔ جیسے انسانوں کو سانپ موگھ گیا ہو لوگوں کے
 چہروں پر ایک خوف، ایک اضطراب کروٹیں لینے لگا۔ شہزادہ کی بھنوں دوڑ کر آپس میں مل گئی
 تھیں۔ پرتھال نے ایسی بات کہہ دی تھی۔ جس نے سلطان کا کلیجہ ہلا دیا تھا۔ اس کی غیرت
 پر ایک چرکہ لگایا تھا اور وہی گستاخی اس کے اشتعال کا باعث بنی تھی۔ غم و غصہ کی شدت
 سے وہ ابھی تک کانپ رہا تھا اس کی گردن پر لگتی ہوئی فولادی جالی پر ایک لرزش طاری تھی
 اور نوپے کے لباس میں اس کا بدن یوں کپکپا رہا تھا جیسے محراب کی جھنپ سے ستار کے تار
 تھر تھرا اٹھتے ہیں۔ ستار کی لڑکی نے ہمیشہ بہادروں کی کندھیاؤں، سڑپے ہوئے نیزوں اور
 ٹوٹے ہوئے تیروں کا طعنہ دے کر گویا ان بہادروں کے منہ پر سرد دربار طمانچہ مار دیا تھا اور
 سلطان کو محسوس ہوا تھا۔ جیسے یہ طمانچہ اس کے اپنے رخسار پر پڑا ہے۔

انف پرتھال نے کتنی بڑی جرأت کی تھی۔ روش یک بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور
 وہ گردن خم رکھ کر گوشہ ہیا لائے کے بعد یہی تھی۔ آقا حضور اکبر گستاخی کے لئے

معافی کی طلب گار ہے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ بھئی بہادر اپنے فرض سے غافل ہو چکے ہیں۔

”ہم تم سے ناراض نہیں لڑکی! سلطان نے ذرا دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

صاف ظاہر تھا۔ وہ انتہائی خطبہ و محفل سے کام لے رہا ہے۔

”مایدولت اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ تم نے خوشامد نہیں کی اور دل کی بات کہہ دی ہم تمہاری اس جرأت کو پسند کرتے ہیں لیکن یہ مت بھولو۔ ہماری خاموشی کا مطلب محض دیورائے کو دھمیل دینا تھا۔“

پر تھاں چپ چاپ سر نہواڑے کھڑی تھی اور سلطان کہہ رہا تھا۔ ”حکومت کی بعض مصلحتیں فوج کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور سپاہی احکام ملنے تک حرکت میں نہیں آتے۔“

بھئی، سلطان سرسریں محراب کے ستون تھاے جوش و غضب کی حالت میں کھڑا تھا۔

انگریز اس نے پر تھاں کے حوصلہ کی تعریف کی تھی۔ جس نے سر دربار بھئی بہادروں پر اتنی بڑی چوٹ کی تھی اور بڑے دھمے لہجہ میں اس کی جرأت پر تحسین کا کلمہ پڑھا تھا۔ لیکن اہل دربار ابھی تک خوف سے لرزان تھے اور شہزادہ حسن کا دل تو بچہ بچوں کی کجی شاخ کی مانند یوں تھر تھرا رہا تھا۔ جیسے چاروں طرف سے آندھی کے تیز و تند جھکڑا منڈ آئے ہوں۔

سلطان کی عادت تھی وہ عورتوں کو کبھی سخت لہجہ میں مخاطب نہیں کرتا تھا اور حتی الامکان ان سے نرمی اور شفقت کے ساتھ پیش آتا تھا لیکن ایک معمولی سزا کی لڑکی کو یہ اختیار کس نے دیا تھا وہ سلطان معظم کے حضور بھئی بہادروں کی شجاعت کا فوج پڑھے اور اس بے باکی و گستاخی کے ساتھ گفتگو کرے کہ خود سلطان بہ نفس نفیس زخمی شیر کی طرز پر تپ کر کھڑا ہو جائے کیا آج تک دکن کی کسی شہزادی نے بھی سلطان کے سامنے اس انداز میں گفتگو کی تھی؟

نہیں۔۔۔ پھر پر تھاں کوئی شہزادی نہ تھی کسی سردار کی لڑکی نہ تھی، وہ مدگل کے غریب سناڑ کی بیٹی تھی۔ جسے ملکی سیاست میں دخل اندازی کا کوئی اختیار نہ تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا۔ پر تھاں کا فقر و گمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند سلطان کے دل میں بیوست ہو چکا ہے اور وہ خود سینے میں اس کی چھین محسوس کر رہا ہے یا معلوم اس جبین اس غش کا رد عمل کس

قیامت کی شکل میں ظاہر ہو؟

اپنی اپنی جگہ ہر کوئی قیاس کے گھوڑے دوڑا رہا تھا لیکن بے سلطان معظم پر تھا۔ کی گستاخی کی سزا رونق بیک کو دے جو اسے نہیں سکھاسکا کہ بادشاہ کے حضور گفتگو کے آداب کیا ہیں؟

دربار پر سناٹا طاری تھا۔ بلند ستون اور متعش محرابوں پر ایک بڑا سراسر خاموشی رہ گیا رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس خاموشی کی تہہ میں کوئی بھیا تک خطرہ کر دینے بدل رہا ہو۔

سلطان کی آنکھوں میں ابھی تک خشونت کے سائے لرزاں تھے لیکن اس کا چہرہ بتدریج پرسکون ہوتا جا رہا تھا۔ چند لمبے خاموش رو کر اس نے اپنے سر کو ایک متنی خیر جنبش دی پھر پر تھا۔ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”لو کی! تم کچھ اور کہنا چاہتی ہو؟“

”نہیں میرے آقا! میں جو کچھ کہنا چاہتی تھی۔ کہہ چکی ہوں۔“

”لیکن ہم محسوس کرتے ہیں تمہارے پاس کہنے کے لئے ابھی کچھ باقی ہے۔“

”عالی جاہ!“

سلطان نے اپنا بازو پر تھا۔ کی طرف لہرایا اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہارے ہونٹوں کی کپکپاہٹ، چہرے کا رنگ، دل کا اضطراب اور نگاہوں کی زبان ابھی کچھ اور کہنا چاہتی ہے اور ہماری طرف سے تمہیں اپنے دل کی بات زبان پر لانے کی اجازت ہے۔“

”سلطان عالی! کینز صرف ایک سوال کی اجازت چاہتی ہے۔“

”جو کچھ بھی پوچھنا چاہو بے خوف ہو کر پوچھو ہم جواب کے پابند ہو چکے ہیں۔“

”شکریہ اُن داتا“ پر تھا۔ گردن جھکا کر بولی۔ ”کینز اپنے آقا سے صرف یہ پوچھنے

کی تہمت رکھتی ہے اگر کوئی لیرا کسی غریب لڑکی کی عزت لوٹنے پر قتل جائے تو باپ کو کیا کرنا

چاہیے؟“

”اس لیرے کا سر قلم کر کے بیٹی کے قدموں میں ڈال دینا چاہیے۔“ سلطان نے فوراً

جواب دیا۔

"میرے آقا! آپ سلطان ہیں، بادشاہ ہیں، عالم بناہ ہیں اور یہ کثیر آپ کی رعایا۔ بادشاہ رعایا کا باپ ہوتا ہے اس رشتہ سے میں آپ کی بیٹی ہوں۔ بیجے بکر کے مہاراج دیورائے نے آپ کی عزت اونا چاہی ہے، اس نے تہمنیوں کے دامن پر ہاتھ ڈالا ہے اب باپ کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے میں دیورائے کا سراپے پاؤں کی ٹھوکر دوں میں لے کر واپس جانا چاہتی ہوں کیا میری یہ تمنا پوری ہو سکتی ہے؟"

ایک لمحے کے لئے دربار پر بچھڑنا چھا گیا سب لوگ پرتھال کی اس جرأت پر حیران و ششدر رہ گئے۔ شیرادہ حسن کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا۔ اطمینان و اضطراب پر غالب آچکا ہے اس مرتبہ پرتھال نے جس انداز میں سلطان کی غیرت کو چھینچھوڑا اور جس حسین پیرانیہ میں اپنا مدعا بیان کیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے گنگو کا سلیقہ اور جذبات کو مشتعل کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔

سلطان کی ہتھکڑیوں کی غیر معمولی چمک بتا رہی تھی کہ پرتھال نے اس کے سینہ میں ایک پھل ڈال دی ہے اور اس وقت وہ کوئی اہم فیصلہ کر رہا ہے اچانک اس کی آواز کی گرج سنائی دی وہ فیصلہ کن ہے۔

"ہم اپنی بیٹی کی تمنا ضرور پوری کریں گے۔"

پھر سلطان اپنے بھائی احمد خاں غاٹھانوں سے مخاطب ہوا۔

"احمد خاں! لشکر کو آج ہی کوچ کرنا چاہیے۔ اپنی بیٹی کی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے ہم بیجے بکر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں تاکہ آگے والی تاریخ یہ نہ کہہ سکے۔ فیروز شاہ رعایا کا باپ ہو کر اپنا فرض پورا نہ کر سکا۔"

"سلطان معظم! فوج صرف آپ کے حکم کی منتظر ہے۔"

احمد خاں نے سر جھٹکا کر جواب دیا۔ "ہم آج ہی دریا عبور کر کے بیجے بکر میں داخل ہو جائیں گے۔"

احمد خاں کو کوچ کا حکم دے کر سلطان پھر پرتھال سے مخاطب ہوا۔

"لڑکی! اگر تمہارے دل میں کوئی اور تمنا ہو تو اسے بھی بیان کر سکتی ہو۔"

"عالی جاہ! ایک دفعہ کبھی اس کا خیال ہو کر مجھ کو یاد آئے گا۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

آج تک ایسی عزت نصیب نہ ہوئی ہوگی لیکن میرے دل کے گوشہ میں ایک اور تمنا بھی چھپی بیٹھی ہے جسے بیان کرنے سے پہلے مجھے اپنی اوقات یاد آ جاتی ہے۔"

"اپنی تمنا بیان کرو۔ اگر ہمارے بس میں ہوا تو اسے بھی ضرور پورا کریں گے۔ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔"

"پرتھال نے شکر گزار نگاہوں سے سلطان کی طرف دیکھا پھر جھک کر بولی۔

"سلطان عالی! سنئے کو اگر اپنے آقا حضور کے ہاتھوں کا سایہ میسر آ جائے تو وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت ہستی سمجھے گی۔"

"تم جیسی بہادر لڑکی کو یقیناً ہمارے ہی زیر سایہ رہنا چاہیے۔"

اور سلطان کی زبان سے یہ فقرہ سننے ہی پر پرتھال نے جھک کر کورٹس ادا کی۔ پھر سلطان بلند آواز سے پکارا۔

"زونق بیگ! آج سے پرتھال ہماری بیٹی بن کر محل میں رہے گی اسے چچی حضور بیگم جہاں کے قصر تک پہنچا دیا جائے انہیں کہو، مبادولت نے اُن کے لئے ایک انمول ہیرا بیجا ہے، بجے مگر سے واپسی کے بعد ہم اپنی امانت واپس لے لیں گے۔"

رواق بیگ نے اطاعت میں سر جھکا دیا۔ فرط مسرت سے پرتھال کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، سلطان غریبوں پر اتنا مہربان بھی ہو سکتا ہے اور معمولی لڑکی کی خاطر وہ بیچہ مگر کی اینٹ سے اینٹ عبادتیں پر عمل جانے گا۔ یہ بات اس کے دہم و دھماکے میں بھی نہ تھی۔ واقعی آج اسے ایسی عزت نصیب ہوئی تھی کہ وہ کن کی کسی لڑکی نے اس کا تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ شکرگزاری کا احساس اس کی آنکھوں سے پانی بن کر بہنے لگا اور وہ مکتو میر آواز میں نکلنے لگی۔

"آفتاب نے ذرے پر نوازش کی ہے میرے آقا! آپ نے غریبوں کی لاج رکھ لی ہے تمہیں بلکہ انہیں ایسی عزت بخشی۔ جو آسمان کے ستاروں کو بھی نصیب نہیں ہو سکتی، میں آپ کی کامیابی کے لئے پراعتقاد کروں گی۔ آپ کے جانے کے بعد میری نگاہیں بجے مگر کے راستوں پر منڈلایا کریں گی۔ میرے کان آپ کی آواز سننے کے منتظر رہیں گے۔ بھگوان لڑائی میں آپ کی رکھشا کرے جیت آپ کی ہوا اور۔۔۔"

”جیت ہیٹ سچائی کی ہوئی چاہیے۔“

سلطان نے پرتھال کی بات کا لی۔

”مگر آپ کی سکوار بھی تو سچائی کی حمایت میں اٹھے گی۔ آپ غریبوں کی عزت کے

رکھوالے ہیں میرے مالک! بھگوان آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔“

پھر سلطان نے ہاتھ سے اشارہ کیا جسے سمجھنے میں پرتھال نے غلطی نہیں کھائی۔ اس

نے نہایت احترام کے ساتھ جھک کر کورنش ادا کی اور اگلے قدموں چلتی ہوئی دروازے تک

آگئی۔ رونق بیک کھپت ستار اور سکھ دیو کا کاٹنے بھی اس کی پیروی کی۔ لکھپت اور سکھ دیو

کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ آج انہیں دربار میں ایسی عزت ملی تھی جس کے متعلق وہ صرف

سننے دیکھ سکتے تھے مگر یہ کوئی پسند تھا۔ کوئی خواب نہ تھا۔ سورج کی مانند چمکتی ہوئی حقیقت

تھی کہ سلطان نے پرتھال کو اپنی بیٹی ہالیا تھا اور اس کی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے

ہیمنی فوجیں آج ہی بچے مگر کی طرف کوچ کرنے والی تھیں، یہ عزت، یہ بڑائی، یہ شہنشاہ

آہستہ آہستہ کی دھار میں غرق ہو کر ان کے چہروں پر بہہ نکلی تھی اور لکھپت ستار کے ہونٹ

کپکپا رہے تھے۔

”بھگوان تیری لیلیا نیاری ہے۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ وہ کچھ

بولنا چاہتا تھا مگر زبان سلطان کے احسان سے ٹک ہو گئی تھی۔

واقعی بھگوان کی لیلیا نیاری تھی۔ دروازے پر پہنچ کر پرتھال نے وینکٹا شہزادہ حسن کی

مطمئن اور شورش نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ولی عہد نے نگاہوں کی زبان سے اس

کی کامیابی پر مبارکباد اور اپنے دل کی بے قراری کا اظہار کیا تھا۔

بے اختیار پرتھال کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی یہ گویا ولی عہد کی

مبارکباد کا جواب تھا پھر وہ نہایت تیزی کے ساتھ مڑی اور دربار سے نکل گئی۔

کچھ دیر ولی عہد کی نگاہیں دروازے کے آس پاس منزلاتی رہیں۔ پھر پلٹ گئیں۔

پرتھال رونق بیک کے ساتھ ہیگم جہاں کے قصر کی طرف جا رہی تھی۔

کوچ

غیر ذرا آباد سے سلطانی لشکریوں کی روانگی کا نظارہ کر کے تاریخ اپنے حافظہ سے کبھی نہ

سلطان ایک سفید کوتل گھوڑے پر سوار جس پر سرخ نبات کی چادر گھنٹوں تک لٹک رہی تھی۔ یہ نفس نفس فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کا دستہ خاص جو سیاہ پرچم اٹھائے تھا وہ بجاتا ہوا رواں تھا۔ اپنی خاص وردیوں اور لوہے کے چمکتے ہوئے ہتھیاروں کے ساتھ دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری کر رہا تھا۔

قلعہ اور کوٹنگ ہائے سلطانی سے لے کر چھوڑہ ندی کے کنارے تک چار کوس کے رقبہ میں پوری سپاہ اپنے اپنے امیروں اور سالاروں کی رہنمائی میں حرکت کر رہی تھی۔ ان دستوں کے فوجی نشان الگ الگ اور مختلف النوع تھے لیکن اپنے امتیازی نشانات کے ساتھ سیاہ پرچم جو پہنسی سلطان کا نشان تھا۔ ہر جگہ لہراتا اور ہوا کے تیز جھونکوں میں پرندوں کی مانند پھر پھڑپھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سورج کی شعاعوں میں نیزوں کے پھل ٹکاہوں کو ذخیرہ کر رہے تھے۔ جیسے ان سے کرنیں پھوٹ رہی ہوں اور گھوڑوں کی ہلکی ہلکی مسلسل ہنہانہٹوں سے فضا میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ جیسے بہت دور کہیں شہنائیاں بج رہی ہوں۔

کٹاہ دکانی کے علاوہ امیران فوج کی عام پہچان اُن کے گھوڑے تھے جن پر مختلف رنگوں کی منقش چادریں لٹک رہی تھیں۔ یادہ امتیازی پھریرے جران کے آگے آگے لہراتے تھے۔

اگر قلعہ کی فسیل سے (جہاں محسروں کے محافظ، خواجہ سرا، غلام اور کینیریں قطار در قطار کھڑے سلطانی لشکر کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے) اس پر شکوہ روائی کا نظارہ کیا جائے تو چھوڑہ ندی کے میدان میں پہلے ہوئے لشکروں کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی کچھ مشکل نہیں تھا جو اگرچہ پندرہ ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں پر مشتمل تھی لیکن اسے اس سلیقہ سے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا کہ کم و بیش ایک لاکھ کا لشکر جراز معلوم ہوتا تھا۔ جو اپنے امتیازی پرچم اڑاتا ہوئے ہوئے چھوڑہ ندی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

قباچہ خان اور کوسل زائے (جو ایک چوہان سردار تھا) ہر اول دستہ کو لے کر بہت پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے اور اُن کے گھوڑے آٹھ دس کوس آگے دھول اڑاتے چلے جا رہے تھے۔

ان کے بعد میر فضل اللہ ایجو شیرازی کے بیٹے اور داماد اپنے دوستوں کو لے کر ایسے

ہوتے۔

پھر لشکر ہائے سلطانی کا سپہ سالار امیر الامرا احمد خاں خانخاناں، جگر مراد آبادی سپاہ خاص اور ہاتھیوں کے ایک دستہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ امیر الامرا کی شاہنشاہی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے سر پر فوج کا علم خاص سایہ کناں تھا، جب اس نے گھوڑے کی باگ اٹھائی تو فیلابانوں کے اشارہ کے ساتھ ہی ہاتھیوں نے چنگھاڑ کر اپنی سوئیں بلند کر دیں اور سپہ سالار کو سلامی دی۔ پھر فوج کی آواز پر یہ لشکر بھی چلن دیا۔ خانخاناں کا فرزند میر غیاث الدین اور بھتیجا شیر خاں اس کے دائیں بائیں گھوڑے بڑھائے چل رہے تھے۔

امیر الامرا کے بعد ارگو خان کا دست آگے بڑھا جس کے سپاہی وحشت ناک جنگ لڑنے میں مشہور تھے۔ وہ دشمن کی سپاہ پر بھوکے بھڑیوں کی طرح حملہ کرتے تھے اور مدافعت کے وقت لوہے کی دیوار بن جاتے تھے ان کے نیزوں کے پھل سیدھے گردوں کو نشانہ بناتے تھے اور ان کا نشانہ شازدہ نادر ہی خطا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ ارگو خان کا یہ دستہ سلطان کے آگے بڑھتا تھا۔

ارگو خان بھی نکل چکا تو لشکر کا نیک نمودار ہوا جو سلطان معظم کی کمان میں تھا۔ جو مراد آبادی اور سلطانی علم کے سائے میں سلطان کو قتل گھوڑے سے سوار بیت و دید بہ بطاری کرتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ان جانبازوں کے گھوڑے تھے۔ جنہوں نے میدان جنگ سے بھاگنا نہیں سیکھا تھا۔ ان کے کھر درے پھروں پر وحشت اور وحشت کے آثار تھے۔ صاف ظاہر تھا لڑائی کے ہنگام میں وہ موت سے کھیلنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ ورنہ انہیں سلطان کی ہر کاری کا شرف حاصل نہ ہوتا ہشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک سلطان کے دائیں بائیں رواں تھے۔ سلطان کے دستہ خاص میں بھی چنے ہوئے جنگی ہاتھی شامل تھے جنہیں فیلابان مناسب فاصلہ سے لئے جا رہے تھے، یہ سدھائے ہوئے ہاتھی جن کو سپاہ چٹائیں کہنا زیادہ مناسب ہو گا صرف ایک اشارہ پر غنیم پر یوں حملہ آور ہوتے تھے۔ جیسے موت سپاہ لہاڑے اور زہر چنگھاڑتی ہوئی ٹوٹ پڑے۔

سلطان ہاتھیوں کو لڑانے پر بڑا باہر تھا اور خود بھی کبھی کبھار سردار ہاتھی ”خیرا“ پر بیٹھ کر فوج کی کمان کرتا تھا۔

سلطانی دستے کے گھوڑے اور سوار بھی بڑے چاق و چوبند اور موت سے کھیل جانے والے تھے اور بہادری کا بھی اعزاز انہیں سلطان کے دستے خاص تک لے آیا تھا۔ یہ لشکر خاص جو دوسو ہاتھیوں اور پانچ ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ زمین کا سینہ دھلاتا اور زلزلہ سا طاری کرتا ہوا گزر گیا۔

سلطان کے عقب میں امیر فضل اللہ آنجو شیرازی کے سوا کسی اور سردار کو چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ امیر کے ساتھ یہ شخصیں محض فوجی اعتبار ہی سے روانہ نہیں رکھی جاتی تھیں بلکہ سیاسی مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ سلطان کا عقب اس کے کسی معتمد ترین سردار کی سرکردگی میں رہے اور امیر فضل اللہ کے علاوہ یہ اعتماد کسی پر نہیں کیا جاسکتا تھا۔

سلطان کا جنگجو بھائی امیر الامرا احمد خاں روانگی کے وقت ہمیشہ سلطان سے آگے چلتا تھا لیکن ہمیشہ فرمانروا نے احتیاط اور تدبیر کا دامن یہاں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے امیر الامرا اور اپنے درمیان ارگو خان کو حائل کر رکھا تھا۔ احمد خاں بھی آخر داؤد خان ہی کا فرزند تھا اور حکومت کا ولولہ کسی وقت اسے بغاوت پر آمادہ کر کے بھائی کی گردن کاٹنے پر بھی ابھار سکتا تھا لیکن فیروز شاہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ بھائی کی طرف سے غافل رہتا۔ اس نے احمد خاں کو جہاں امیر الامرا اور خانخاناں کے خطاب دے کر سلطانی افواج کا سپہ سالار بنا دیا تھا وہاں ارگو خان ایسے بہادر کو اس پر مسلط کر رکھا تھا جس کے سپاہی بڑے بڑے بہادروں اور جری انسانوں کی شخصیں چھوٹ جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی ارگو خان کی موجودگی میں فیروز شاہ بھائی کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔

سلطان کا عقب صدر مملکت امیر فضل اللہ ایسے معتمد خاص اور جنگجو سردار کی وجہ سے محفوظ تھا۔ جس کی قیادت میں ہزار کے سپاہی، راجپوت، سورے، گجراتی، گجراتی اور مرہٹے بھی تھے۔ ترک اور خطائی جاہل بھی تھے جن کی شجاعت اور وفاداری ایک باؤ نہیں کٹی۔ بار آزمائی جا چکی تھی۔

دیکھیں سلطنت صدر جہاں امیر فضل اللہ کے بعد قطب الدین جو پیادہ فوج کا سالار تھا۔ اپنا سرخ پیر اٹھائے ہوئے روانہ ہوا۔ وہ علا جو ثواب جہاں کی خاطر شریک جنگ ہوتے تھے۔ قطب الدین ہی کے پرچم تلے داؤ شجاعت و جتے تھے اور سلطان بھی انہیں سخت

قلب الدین کے پیچھے خیر و خراگہ سامان رسد اور دوسری ضروری اشیاء تھیں ان کی حفاظت کا انتظام حاکم ساغر میاں مدعو کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ جو ہنگامہ معرکہ سرنوتی کے فرائض بھی ادا کرتا تھا میدان جنگ میں اسی کے اشارہ پر قرنا پھوکی جاتی اور نوبت پر چوٹ پڑتی تھی اور سپاہی لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے؛ حاکم ساغر کے ساتھ سلطان ہمیشہ مشفقانہ برتاؤ کرتا اور اسے فرزندوں کی طرح عزیز سمجھتا تھا اس نے بھی ایک معاہدہ کے تحت اپنے آپ کو سلطان کی سپرداری میں دے دیا تھا اور کمال وفاداری سے پیش آتا تھا۔

سلطان کسی بھی معرکہ کے لئے کوچ کرتا۔ فوج کی اس ترتیب میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تھا بلکہ حکم یہ تھا ہر سفر میں یہی ترتیب پیش نظر رہے۔

قلعہ کی فصیل سے لشکروں کی فوج و ر فوج روانگی کا نظارہ بڑا ہی روح پرور مگر ہیبت نواز تھا۔ نہ جھوڑی سے خوب کی طرف حد نگاہ تک سواروں، ہاتھیوں، پیادوں لے لے نیزوں، برچیوں اور مختلف رنگ کے ڈرتے ہوئے پرچیوں کے سوا اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی، بڑے بڑے ڈھلے ڈھلے کھاتے ہوئے راستوں پر کئی کئی ہتکت انسانوں کا سمندر رواں دواں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکن کے اپنے اپنی تمام فوج، تمام سپاہ بگے بگے نگر کی طرف دھکیل دی ہے۔ جب بار بار وادہ فوجوں کا آخری قافلہ مدی کا پہل پار کر کے اپنے راستوں پر ہولیا تو فصیل کے سنگوروں کے ساتھ ساکت و صامت، متحیر و ششدر کھڑے غلام، بکلی بکے سپہرے وادہ کشمیری، خواجہ سرا اور گوشک سراؤں کے محافظ ہیبت، اضطراب، تعجب اور سبست کے لئے جلے تاثرات لے کر پلٹنے لگے مگر بعض کے دل پر اس روانگی کا کچھ ایسا اثر بیٹھ گیا تھا کہ وہ محرومہ بچیوں کی طرح اس وقت تک وہاں جے رہنا چاہتے تھے۔ جب تک لشکر کا آخری سپاہی بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

اہل دکن نے یوں تو سلطانی لشکروں کی روانگی کے بیسیوں نظارے کئے ہوئے مگر فیروز آباد کے باشندوں نے سپاہ کے کوچ کا جو منظر دیکھا تھا۔ وہ قطعی ناقابل فراموش اور تاریخ کا ایک قیامت انگیز باب تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ فیروز آباد کوئی شہر نہیں ایک جواا مکھی ہے۔ جس کی بلندیوں نے گھوڑوں، ہاتھیوں، انسانوں اور پرچیوں کی شکل میں کھولنا ہوا لاوا اُٹھل دیا ہے اور وہ سنسانا، سرسرا تا بگے بگے کی طرف بہہ نکلا ہے اور ہر اس چیز کو فنا

کرتا چلا جائے گا جو اس کی براہ میں خاکن ہوگی۔
 فصیل کے کنگورے کے ساتھ ساتھ ابھی تک بے شمار انسان گم سم کھڑے تھے اور دور
 جہاں زمین اور آسمان ملتے ہوئے نظر آتے ہیں، سیاہ پرچوں کا کارواں شیا لے غبار کے
 بادلوں میں گم ہوتا جا رہا تھا۔



پاک سوسائٹی
 ڈاٹ کام

جمل سرائیں

سرخ لکیر

قصر سلطانی کی بیگمات جمل سرائوں کی جوان اور ماہِ رُبِ شہزادیاں امیروں اور سرداروں کی طلعت افروز اور خوش بخت بیگمات جن کی مسکراہٹیں ستاروں سے تابندہ تر اور جن کے شہابی رخسار گل ولالہ کی محبت بدوش عبا سبوں سے زیادہ حسین و رنگین تھے۔ اپنی خاص کمیزوں اور منہ چڑھے خواجہ سراؤں کے ساتھ نکلتے کے محرابی دہواڑوں، دریچوں، جالی دار کمر کیوں اور جھروکوں سے لگی (جن کے چوٹی پت پھوڑہ ندی کی طرف پھلتے تھے) چپ چاپ اور گم صم لشکروں کی روانگی کا نظارہ کر رہی تھیں۔

اُن کے دلوں میں جذبات کا ایک سمندر سا اُمنڈ آیا تھا۔ لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ احساسات کے ان گت بھور تھے جن میں ان کی تمناؤں کی کشتی ایک بھری کی مانند گھوم رہی تھی اور وہ نہیں جانتی تھیں۔ بھنور کی سرکش لہریں ان کی کشتی حیات کو بچے گرداب میں لے اتریں گی یا کوئی موج اُسے موت کے اس چکر سے باہر بھی نکال لائے گی۔

شاید یہی وہ الم انگیز احساس تھا جس نے ان کے یاقوت صفت لبوں پر خاموشی کا سحر پھونک دیا تھا۔ دردِ عورتیں اور وہ بھی مجلسِ اڑوں کی بیگمات، شہزادیاں اور خانزادیاں کہاں خاموش بیٹھنے والی تھیں۔ ان کے بوڑھے اور جوان بہت والے باپ بہادر شوہر، جوان بھائی اور جری بنے سلطان کے ساتھ ایک ایسی لڑائی پر جا رہے تھے، جس کے متعلق کوئی بھی شخص

میدان جنگ کا رخ کرتا ہے تو اُسے دشمن کے سوا دنیا کی ہر چیز بھول جاتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات وہ اپنے بوڑھے ماں باپ، جواں بیوی اور معصوم بچوں کو بھی فراموش کر دیتا ہے لیکن عورت اس وقت اپنے شوہر کے علاوہ کائنات کی کسی بھی شے کو یاد نہیں رکھتی۔ جب اُس کا محبوب زندگی اور موت کے درمیان مصروف پیکار ہو۔

اول تو یہی احساسات کچھ کم نہ تھے دوسرے لشکر کی روانگی کا منظر ہی ایسا ہوش ربا تھا کہ ان کی نگاہیں فوجی دستوں پر تنگ کے رہ گئی تھیں۔ البتہ جب کوئی امیر زادی اپنے شوہر یا بھائی کو دیکھ لیتی تو ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور اُسے لشکر میں ممتاز عہدے پر دیکھ کر اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا۔

کنیزیں بھی اپنی بیگمات کی طرح چپ چاپ تھیں البتہ خواجہ سرا تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ضرور باتیں کرنے آتے اور بعض سپاہیوں پر دلچسپ فخرے بھی چست کرتے جاتے تھے، اگر انہیں یہ احساس نہ ہوتا کہ اُن کی محترم بیگمات اپنے شوہروں سے جدا ہو رہی ہیں تو شاید ان کے قہقہے محلِ سرا میں شبرات کے چاخوں کی طرح گونجتے۔ وجہ دراصل یہ ہوتی تھی۔ آخری دستہ کے چند مسخرے سپاہی گھوڑوں کی بجائے بار برداری کے کچھ گدھے پکڑ لائے تھے اور ان پر کچھ ایسے انداز میں سوار ہوئے کہ دیکھنے والوں کو ہنسی روکنی دشوار ہو گئی تھی۔

انہوں نے گدھوں پر زمین کے انہیں لگائیں چڑھائیں، پھر دو دو مسخرے ایک ایک گدھے پر چڑھ بیٹھے، ایک کا منہ سر کی طرف تھا۔ دوسرے کا دم کی جانب، مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ پیچھے کی طرف منہ کر کے بیٹھنے والے سوار گدھوں کی دھڑکیوں کو بطور لگام استعمال کر رہے تھے اور انہیں آگے کی بجائے پیچھے چلنے پر مجبور کر رہے تھے لیکن گدھے آخر گدھے تھے۔ وہ اپنے سواروں کی خوش طبعی کو کیا سمجھتے۔ تنگ آ کر انہوں نے دولتیاں جھاڑنا شروع کر دیں اور سوار سر کے بل زمین پر آ رہے، یہ سارا کھیل کچھ ایسا اچانک غیر متوقع اور بے ساختہ تھا کہ تماشاخیوں کے پیٹ میں ہنسی کے مارے مٹی پڑنے لگے، حتیٰ کہ جھروکوں اور درجیوں کے ساتھ لگی شہزادیوں اور امراء کی بیٹیوں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ آئی۔ بلکہ بعض تو کھٹکھٹا کر فحش دین اور ان کی مستزیم آہاریں مجلسِ امیں یوں کھٹکنا لگیں۔ جیسے کسی نے طشتِ تری میں اشرفیاں بھر کر انہیں سنگ مرمر کے فرش پر اچھال دیا ہو۔ ایک حسین نقہ ابھرا نکھرا اور ٹوٹ گیا۔



سلطان فیروز شاہ کی چچی بیگم جہاں جسے سلطان کے حواج میں بھی بڑا دخل تھا۔ مجلسِ اہل کی عورتوں کی حاکم اعلیٰ تصور ہوتی تھی اور کوئی بیگم یا شہزادی اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی حتیٰ کہ سلطانِ عالی کی بڑی بیگم جسے ملکہ ہونے کا شرف حاصل تھا اور محلات میں عالیہ کے نام سے یاد کی جاتی تھی محل کی بوڑھی حاکمہ بیگم جہاں کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی ورنہ اس کے تعاون سے محروم ہو کر وہ چھوٹی بیگمات کی سازشوں کا شکار بھی ہو سکتی تھی جنہیں محل کے افسرِ خولہ سرا "زریں" کی ہمدردیاں بھی حاصل تھیں اور قصرِ سلطانی میں کوئی بھی مرد یا عورت زریں کے اختیارات سے بے خبر نہیں تھا۔

بیگم جہاں کا محل جسے "گل لالہ" کہا جاتا تھا، بیگماتِ سلطانی کے محلات سے کافی فاصلہ پر تھا۔ بعض لوگ اسے "دریائی قصر" بھی کہتے تھے کیونکہ وہ چھوڑی مدی کے عین سامنے واقع تھا اور اپنے عالی دارِ محرابی جھروکوں کے لئے خاص شہرت رکھتا تھا جہاں سے مدی کا نظارہ بڑا دلکش اور کشش انگیز تھا۔

بیگم جہاں اور بیگم عالیہ دونوں ہی ایک محرابی جھروکے میں بیٹھیں فوج کی روانگی کے نظارہ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

ان کے لئے یہ بات قطعی حیرت انگیز نہیں تھی کہ سلطان نے ایک معمولی لڑکی کی عزت کا انتقام لینے کے لئے بچے مگر پرچہ ہائی کا فیصلہ کیا تھا۔ انجام جو کچھ بھی ہو اور وہ لڑکی بھی تو بیگم جہاں ہی کی تحویل میں دی گئی تھی۔

مگر عورت وہم بن کر عالیہ کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ آخر اس نے اپنے شبہ کا اظہار کر ہی دیا۔

"چچی حضور! سلطان کہیں اس لڑکی کو اپنے حرم کی زینت تو نہیں بنانا چاہتے؟"

جس طرح آگ کے شعلے سے بارود پھٹتا ہے اسی طرح بیگم جہاں ٹرپ کر پڑے

تھ گئی۔ بوڑھے جسم پر جیسے ایک لرزدہ سا طاری ہو گیا۔ اس نے غضب ناک نگاہوں سے عالیہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

"بیگم! اگر تم نے یہ بات کسی اور جگہ کی ہوتی تو ضرور سلطان کے قانونِ سخت پہنچ

جاتی۔ خدا کا شکر کرو کہ تم اس وقت قصرِ لالہ میں ہو، اور وہ مردود زریں بھی موجود نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" بیگم عالیہ نے گھبرا کر پوچھا۔ اس کے چہرے پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

"مطلب؟" بوڑھی عورت نفرت سے بولی۔ "کیا تم نے نہیں سنا۔ سلطان نے غافل کو اپنی بیٹی کہا ہے۔"

"بیٹی؟" عالیہ کے ہونٹ بس تھر تھرا کر رہ گئے۔

"اللہ ذرا سوچو اگر تمہاری بات سلطان تک پہنچ جائے تو تمہارے متعلق کیا سوچیں گے۔ انہویں نے بھرے دربار میں پرغافل کو اپنی بیٹی بنایا ہے۔ کیا جو باتیں دربار عام میں آتی ہیں۔ تم اُن سے بھی غافل رہتی ہو؟ اتنی اپرواہی یقیناً کسی روز تمہیں لے ڈوبے گی۔"

"مجھ سے واقعی بڑی غلطی ہوئی۔ خدا معاف کرے میں نے ایک نازیبا بات کہی ہے۔"

"اور تم یہ ہر وقت عورتوں کی فکر میں کیوں کھوئی رہتی ہو۔"

بیگم جہاں نے ترش روئی کے ساتھ کہا۔ "وہ سلطان ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ تمہیں اعتراض کا حق نہیں۔"

"مجھے تو صرف ایک خدشہ ہے۔"

"کیسا خدشہ؟"

"بہن۔۔۔۔۔۔" عالیہ کہنے لگی۔ "مگر سلطان کوئی لڑکی حرم میں لے آئے تو شیرازی کی طرح وہ بھی میری دشمن نہ بن جائے۔"

"لیکن جب تک میں زندہ ہوں۔ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، تمہارے لئے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ تم شہزادہ حسن کی ماں ہو۔ بہن کی سلطنت کے ولی عہد نے تمہاری کوکھ سے جنم لیا ہے اور شیرازی تو ایک چہ بیا کو بھی جنم نہیں دے سکی۔"

بیگم جہاں کے لہجہ میں حقارت ہی حقارت تھی۔

شہزادہ حسن کے ذکر پر جھڑو کہ کے عظمیٰ پردہ کے پیچھے ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ جیسے ہوا کی ایک لہر پردہ پہ ٹھکن ڈال کے گزر جاتی ہے اور بیگم عالیہ نے اس کی سرسراہٹ پر کوئی توجہ ہی نہ دی، وہ کہنے لگی۔

"میں ولی عہد کی ماں ضرور ہوں لیکن جوانی مجھ سے روٹھ چکی ہے اور آپ جانتی ہیں مرد جب بوڑھا ہو جاتا ہے۔ جوان عورت شراب کا نشہ بن کر اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیتا ہے۔"

”میں سمجھتی ہوں۔ سلطان تمہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا تم اس کے بیٹے کی ماں ہو۔ سلطنت کی سب سے بڑی طاقت تمہارے ہاتھوں میں ہے، شہزادہ حسن۔“

پردہ کے اس طرف پھر ایک سربراہٹ ہوئی اور دوسرے ہی لمحے کسی کے ٹھوکر کھا کر مرنے کی آواز سنائی دی لیکن پھر جلد ہی کوئی سنبھل گیا۔ یہ بھی شاید داہمہ ہی تھا کہ کوئی اس طرف گیا ہے، ممکن ہے بیگم جہاں کی پالتو بلی کسی چڑیا پہ لگی ہو لیکن عالیہ نے پردہ اٹھا کر جھروکے کے اس طرف جھانکا تو اسے ایک سرخ لکیر کے سوا اور کچھ بھی نظر نہ آ سکا جو عجبی کمرہ کے دروازہ کے باہر بلی کے ایک کوندے کی طرح لگی۔ تھر تھرائی اور اچانک ہی غائب ہو گئی تھی۔ عالیہ کا ذہن اس لکیر کا تعاقب کرنے لگا۔

”یہ کیا شے تھی؟“

لیکن وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ شاید تو سب تزیج کی ایک لہر..... نہیں..... تو پھر ممکن ہے کسی دو پہیہ کا ٹکسن ہو؟“

”ہائے اللہ!“ عالیہ گھبرا سی گئی۔ ”تو کیا بیگم شیرازی پردہ کے پیچھے چھپ کر ہماری باتیں سن رہی تھی؟“ اُس نے دل ہی دل میں سوچا پھر گھبرا کر انہی۔

”کیا ہے؟“ بیگم جہاں نے پوچھا۔ وہ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ ”تم اچانک پریشان کیوں ہو گئیں؟“

”سرخ لکیر.....“ عالیہ کے ہونٹ تھر تھرائے اور اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

پیاسی نگاہیں

پر حال بیگم جہاں کی مجلس رائے ایک عربی جھروکے میں کھڑی لٹکروں کی روانگی کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے رونق بیک کی صنعت میں یہاں آئی تھی اور بیگم جہاں نے جس محبت اور شفقت کے ساتھ اُس کو ”خوش آمدید“ کہا..... اس سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ پہلے ہی اُسے جانتی ہو۔ اُس نے کہا تھا۔

”ارک! تمہارے متعلق میں جو کچھ سن چکی ہوں۔ تم اس کی شکل تصویر ہو، دیوارائے کے مقابلہ پر تم نے حیرت انگیز جرأت دکھائی ہے، میں دکن کی بہادر بیٹی کو خوش آمدید کہتی ہوں، قصر لالہ میں تم اپنے آپ کو انجی نہیں پاؤ گی۔ سلطان نے تمہیں اپنی بیٹی کہا ہے.....“

قصر لالہ کے خدام سلطان کی بیٹیوں کے آداب و مقام سے غافل نہیں۔“
تعب کی بات تو یہ تھی۔ پر تھال دربار سے سیدھی نہیں آئی تھی اور بیگم جہاں تک وہ باتیں بھی پہنچ چکی تھیں۔ جو تھوڑی دیر پہلے وہاں ہوئی تھیں اس کا مطلب یہی ہونا بیگم جہاں کی معلومات ہی حیرت افزا نہیں تھیں۔ ان معلومات کا ذریعہ بھی قابل اعتماد تھا پھر اسے روٹی بیک کی یہ نصیحت یاد آگئی ”مکسر! میں آرام اور اطمینان کی زندگی کا راز دربار میں مضمر ہے۔ ہر وہ بات جو سلطان کی مجلس میں ہر تمہارے علم میں ہونی چاہیے لیکن اس کا اظہار ضروری نہیں۔“

بیگم جہاں کی باتوں سے بیک کے خیال کی تائید ہو گئی تھی کیونکہ نہ صرف فیروز آباد بلکہ دار السلطنت گلبرگہ کے محلوں میں بھی بیگم جہاں کی زندگی قابل رشک تھی۔ جب بیک اسے چھوڑ کر واپس چلا گیا تو اس نے پر تھال کو ایک سرخ دوپٹہ بند کرتے ہوئے کہا تھا۔
”اگر تم چاہو تو کسی جہر کہ میں بیٹھ کر تھوڑے مدی کے نظارہ سے دل بہلاؤ تھوڑی دیر بعد لشکروں کی روانگی کا منظر بھی قابل دید ہو گا۔ مجھے یقین ہے۔ سلطان آج ہی کوچ کا حکم دیں گے میں تھوڑی دیر بعد تم سے آملوں گی۔ یہ کل بہت وسیع ہے جہاں چاہو جا سکتی ہو مگر مہندی کی اس بازو سے ہوشیار رہنا۔ وہ شیطان کی خالہ اُسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہے اگر تم نے مہندی کی ایک پتی بھی توڑ ڈالی۔ تو وہ کتیا کی طرح شور مچاتی ہوئی تمہارے سر پر پہنچ جائے گی۔ اس کی نگاہ دیواریں بھی چھید ڈالتی ہیں۔“
”کون ہے وہ شیطان کی خالہ؟“

”تم خواجہ مرادریں کے کارنامے جلد ہی سن لو گی۔“ بیگم جہاں نے جواب دیا تھا۔
لیکن تمہیں اس کے متعلق ابھی زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں اگر اس نے تمہیں پریشان کیا تو میں اس کی چوٹی کنوا دوں گی۔

اور پر تھال زیر لب سہراتی ہوئی جہر کہ کی طرف پھسل آئی تھی جہاں سے تھوڑے مدی کا نظارہ دیا تھی بڑا دلچسپ تھا۔ مکسر! میں کسی عورت کے سر پر سرخ دوپٹہ کا مطلب یہ تھا۔ وہ سلطان کی بیٹی ہے تاکہ کسی شخص کو سلطان کی بیٹیوں کو پہچاننے میں دقت نہ ہو اور وہ ان کا احترام کر سکے۔ سلطان کی بیگمات اور بیٹیوں کے علاوہ اور کسی عورت کو سرخ دوپٹہ اوڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

فصل کے نیچے وسیع و عریض میدان میں جو ندی کے ساتھ ساتھ لگی کوس تک پہنچا ہوا تھا۔ سلطانی فوجوں کے پراؤ کا نقشہ بیکانگر کے سرکش مہاراج کے خطہ تقدیر پر خندہ تھا۔ وہ سب سرخ کے ایک چھوٹے سے گول ستون کا سہارا لے کر جنوب کی طرف مدھلے ان اونچی نیچی پہاڑیوں کو دیکھنے لگی۔ جن کے عقب میں اس کا جلا ہوا گاؤں اُسے اب بڑی طرح یاد آ رہا تھا۔ گاؤں سے نکل کر اس نے انہی گنگی اور بہری پہاڑیوں کے درمیان میں پناہ لی تھی۔ اور ایک لمحہ کے لئے فیروز آباد کے دربار، مجلس اور کوشکوں کو ذہن سے جھٹک کر وہ پھر کالی چنگاؤں کی اس جنت کے دہانے پر کھڑی تھی، اچانک ایک سادہ متحدہ نوٹیوں کی لڑوہ خیر دھمک نے اُسے چونکا دیا۔ پھر قرنا کی دھواں آواز سنائی دی۔ ہتھوڑہ ندی کے میدان میں لشکروں کے پرچم بلند ہونے لگے۔ اُس نے سنبھل کر دیکھا۔ سلطان معظم کی سواری بڑے شاہانہ کردار کے ساتھ آ رہی تھی اور اس کے آگے پیچھے عوام سلطنت امراء خواتین، لشکروں کے سالار اور کماندار مناسب فاصلہ پر چل رہے تھے۔ سیاح پرچوں نے فضا کو ڈھانپ لیا تھا اور میدان کے وسط میں پہنچ کر جب سلطان ایک لمحہ کے لئے رکا تو اس کا اور سالار یوں تیزی کے ساتھ اپنے اپنے لشکروں کی طرف مڑے جیسے ایک ہی کمان سے مختلف سمتوں کو بیک وقت کئی تیر چھوڑ دیئے گئے ہوں۔ سلطان نے دسے خاص کی سلامتی کی اور ترتیب وار لشکروں کی روانگی شروع ہوئی۔ پرتھالی سرخ ستون کا سہارا لئے بڑی بے تابی کے ساتھ روانگی کا نظارہ دیکھنے اس کی نگاہیں بلی کی سی تیزی سے مختلف اطراف میں دوڑ رہی تھیں ابھی یہاں، ابھی اس لشکر سے اس لشکر تک، پھر قلب میں جہاں خاصا کے جنگجو ہاتھی کبھی کبھی اچی سوئے چنگاڑتے تھے، جوں جوں لشکر ندی کا پل عبور کر کے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی بے ادب اور پریشانی میں بھی اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ جب نصف فوج جا چکی اور امیر الامراء ارگو خان کا دستہ روانہ ہوا تو پرتھالی کے چہرے پر اضطراب اور پریشانی کے ساتھ ادا فکر کی پرچھائیں بھی گہری ہوتی گئیں۔ اُس کا مضطرب۔ نگاہیں ایک مرتبہ پھر سرعت کے ساتھ بقیہ لشکروں پر اڑتی ہوئی قلب پر آجھیں۔ اب سلطان بہ نفس نفیس مکر نے والا تھا اور فیلیان انگلس سنبھالے اشارہ کے منتظر تھے، پھر اچانک پرتھالی دل میں ایک درد کی لہر ابھرتی محسوس کی، اس کی پلکوں کے سائے کچھ بوجھل سے ہو

اس کے لیوں پر ایک لکھی سی گراہ تڑپ اٹھی۔ ادھر قربا کی آواز نے سلطان کے لشکر خاص کی روانگی کا بُرے شکوہ اعلان کیا۔ ادھر ایک بار پھر پرتقال کی پیاسی نظریں سلطان کے آس پاس تھر تھرائیں اور ناکام لوٹ آئیں۔ سلطان کے دائیں بائیں ہشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک کے گھوڑے اچھل اچھل کر چل رہے تھے جس سپاہی کو بس ایک نظر دیکھنے کی خاطر وہ اتنی دیر سے جھرو کہ میں کھڑی تھی۔ وہی کہیں دکھائی نہ دے سکا تھا پرتقال سنے مایوسی اور تشویش کے بوجھ سے دبی اور تھکی ہوئی نگاہیں دکیل سلطنت، صدر جہاں امیر فضل اللہ شیرازی کے لشکروں پر پھیلا دیں۔ مگر انہوں نے اس کا محبوب سپاہی یہاں بھی نہیں تھا۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر جو ابھی تک سرخ بندیا سے محروم تھی غم کی ایک نئی لکیر ابھری۔ غم فراق۔۔۔ اور ہجر یار کی لکیر۔۔۔

ہاں اس نے اپنے محبوب سپاہی۔۔۔ اپنے دل کے راجہ، اپنے من مندر کے دیوتا شہزادہ حسن خاں ہی کو دیکھنے کے لئے اتنی دیر تک کھڑا رہنے کی مشقت برداشت کی تھی۔ جو دیورائے کا سر قلم کرنے کے لئے میدان جنگ میں جا رہا تھا اور میدان جنگ میں جانے سے پہلے ہر عورت اپنے محبوب کو جی بھر کے دیکھنا اور اسے اپنی بھگتی پلکوں کے سائے میں روانہ کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا محبوب کہیں بے رحم سورج کی تھارت میں جھلٹ نہ رہے۔ اس پر زلفوں کی ٹھنڈی چٹھی چھاؤں کا رہنا ضروری ہے پرتقال نے ایک ایک لشکر، ایک ایک دستہ کو دیکھ ڈالا۔ سب کتنی وار طرے اور عمامے اس کی نگاہوں کے دائرے میں تھر تھرائے، وہ تمام فولادی ٹوپیاں جن پر امتیازی نشان چمک رہے تھے، اس کی نظروں میں گھوم گھوم گئیں مگر جس بکلاہ کی تلاش تھی۔ وہی نظر نہ آئی۔ چتر اور سراپہ وہ تو بس سلطان اور ان کے شیر دل بھائی امیر الامراء احمد خاں خاٹخاناں کے سوا اور کسی بھی جگہ نظر نہ آئے۔ تو وہی عید کہاں چلا گیا؟

پھر کھڑے کھڑے (حالانکہ اب کھڑے رہنا اس کے لئے دو بھرتا تھا) اس کے ذہن میں کئی اندیشوں نے سر ابھارا اور وہ سوچنے لگی۔

”ان کا لشکر تو یہاں سے ملبوں دور دیائے تنگ پھدرا کے اُس پار بجے مگر کی دھرتی پہ خیمہ زن ہے پھر وہ آج سپاہ کے ہنراہ کس طرح کوچ کرتے۔ وہ میری جا طر تھا آئے تھے۔ تنہا ہی لوٹ گئے ہوں گے۔“

”کبھی وہ سوچتی۔۔۔“

”سلطان عالی کی پیشوائی کے لئے انہیں پہلے ہی یہاں سے روانہ ہونا چاہیے تھا تاکہ جب سلطان دریائے ننگ بھدرا کو عبور کر کے بجے نگر میں اتریں تو ولی عہودان کا स्वागत کر سکیں۔“

ولی عہد کی واپسی کی یہ وجہ کافی معقول تھی مگر پرتھالی کو صدمہ اس بات کا تھا۔ شہزادہ جاتے ہوئے اسے مل کر کیوں نہیں گیا حالانکہ دربار میں اس نے سن لیا تھا۔ سلطان نے اسے اپنی چچی بیگم جہاں کا مہمان بنایا ہے وہ جانے سے قبل چند لمحوں کے لئے قصر لالہ تک تو آ ہی سکتا تھا۔

لیکن وہ نہیں آیا۔۔۔

”وہ کیوں نہیں آئے۔۔۔ کیوں نہیں آئے۔۔۔ کیوں نہیں آئے؟“

پرتھالی کو محسوس عوا جیسے احساس کی شدت اور غم بھر کی وحشت سے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ سرخ رویشہ جو ابھی تک کچھ دیر پہلے بیگم جہاں نے اسے دیا تھا۔ اپنے شانوں پر لہراتی ہوئی وہ بھڑکے سے ہٹ آئی۔ اس وقت شاید صدر جہاں کا لشکر کوچ کر رہا تھا۔ لیکن اسے اب فوج کی روانگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی پردے کے پیچھے اسے دوسرے جھروکے سے باتوں کی آواز سنائی دی پھر کسی عورت کی زبان سے اپنا ذکر سن کر وہ وہیں ٹپک گئی اور اس کے سینہ کے اندر دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بھلا وہ کسی گفتگو کا موضوع کیوں بن گئی؟ وہ یہی جانتا چاہتی تھی۔ اسے جلدی معلوم ہو گیا۔ دوسرے جھروکے میں بیگم جہاں ولی عہد کی مان بیگم عالیہ سے مصروف گفتگو ہے۔

بیگم جہاں نے اس کی وکالت کی تھی اور یہ ایک نیک شگون ہی تھا کم از کم بیگم جہاں تو اس کی حامی ہے اس لئے اطمینان کا سانس لیا وہ بیگم کی زبانی مجلسِ مذا کی سازشوں کا حال سن چکی تھی۔

پھر نہ جانے وہ کس خیال کے تحت اچانک پردہ کے پاس سے ہٹ آئی اور سرخ رویشہ اپنی پشت پر لہراتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔ بیگم عالیہ نے جب پردہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ تو کتنی ”شہرِ نکیر“ اس کی حیرت کی وجہ بن گئی تھی۔

کمرے سے نکل کر پرتھال ہو لے ہو لے ہندی کی باڑھ کی طرف چلے گی یہ باڑھ قصر لالہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور اس سے کچھ ہی فاصلہ پر سنگ مرمر کی ایک بڑی ہی خوبصورت بارہ دری بنی ہوئی تھی جس کے ہشت پہلو ستون، ہلالی محرابیں اور جالی دار غرنے ہر دیکھنے والے کا دل کھینچ لیتے تھے اس بارہ دری میں کھڑے ہو کر فیروز آباد کا نظارہ کیا جاسکتا تھا کیونکہ بارہ دری کافی بلندی پر واقع تھی۔ پرتھال کے قدم خود بخود اس طرف اٹھتے چلے گئے لیکن ابھی وہ دس بارہ قدم ہی چلی ہوگی کہ اس کے عقب میں ایک عجیب سی سرسراہٹ سنائی دی وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی پھر جب اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اس کے پیچھے شہزادہ حسن کھڑا اُسے محبت آفریں نظروں سے گھور رہا تھا۔

”جان عالم۔۔۔“ پرتھال کے ہونٹ تھرتھرائے پھر وہ بازو کھول کر تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپکی جیسے اس سے بغل گیر ہو جانا چاہتی ہو۔
شہزادہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا اور مسکرا کر بولا۔

”یہ خلوت نہیں ہے یہاں اس قسم کی غلطی سے اجتناب ہی بہتر ہے محل کی دیواریں صرف کان ہی نہیں آنکھیں بھی رکھتی ہیں۔“

پرتھال جہاں تھی۔ وہیں رک گئی اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی سرفی دوڑ گئی تھی۔
”میں کبھی تھی آپ واپس بجے مگر چلے گئے ہیں۔“

”تم سے ملے بغیر؟“

شہزادہ نے یہ فقرہ کچھ اس تعجب خیز لہجہ میں ادا کیا جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اُس نے ایسا سوچا ہی کیوں کہ وہ اس سے ملے بغیر واپس چلا جائے گا۔ وہ حیران کی رہ گئی حسن نے آگے بڑھ کر کہا۔

”میں تمہیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔“

”کس بات کی۔۔۔ کیا کل سرائین آگئی ہوں یا اس کے لئے کہ سلطان نے مجھے اپنی

بٹی بنا لیا ہے؟“

"اس خوشی پر تو تمہیں فخر کرنا اور اشرافیوں کے توڑے باغٹا چاہئیں۔" شہزادہ کہنے لگا۔
 "سلطان معظم کی بیٹی بن جانا کوئی کم اغزاز نہیں لیکن میں تو اس بات پر مبارکباد کہنے لگا ہوں۔ تم نے دوبار میں بڑے سلیقہ سے گنگو کی تھی۔ بڑے بڑے امراء بھی تمہیں رشک سے دیکھ رہے تھے شاید ان میں کوئی بھی سلطان کے ساتھ اس بے خوفی سے محکام ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ تو صرف خوشامد نور چالوئی کرنا جانتے ہیں سوائے امیر شیرازی کے۔"
 "لیکن میں نے کوئی گستاخی تو نہیں کی تھی؟"

"صرف ایک مرتبہ۔"

پر تھال منائے میں آگئی۔ شہزادہ کہہ رہا تھا۔

"شاید رونق بیگ تمہیں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ ہمیں بہادرروں کو بزدلی کا طعن دینا گویا سلطان معظم کی ذات پر حملہ کرنا تھا وہ فوج کے خلاف اس قسم کی طعن آمیز باتیں سننے کے عادی نہیں۔"

بیگ نے مجھے یہ بات بھی بتا دی تھی۔

"اور اس کے باوجود؟"

"ہاں میں دیکھنا چاہتی تھی۔ سلطان پر میری باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر میں ایسا کرتی تو شاید مجھے یہ عزت اور قریب نصیب نہ ہوتی۔"

شہزادہ ایک ٹائیے اُسے حیرت سے گھورتا رہا پھر وہ آہستہ آہستہ بارہ دری کی طرف چلنے لگا۔ اس نے پر تھال کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ محل کے اس حصہ میں کوئی بھی کثیر نظام یا خواہ سرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ سب ابھی تک قلعہ کی فیصل ہی پر کھڑے فوج کی روانگی تیار کر رہے تھے ورنہ اس وقت کئی نگاہیں ادھر ادھر جھانک چکی ہوتیں۔ شہزادہ بارہ دری پر بیڑیوں پر بٹک گیا تھا۔ اس نے چہوڑنے کے پاس پہنچ کر ایک ہشت پہلو ستون کو تھام لیا اور پر تھال کی طرف پلٹ کر بولا۔

"سب لشکر روانہ ہو چکے ہیں۔ یہ شام سے پہلے ہی دوایا پر پہنچ جائیں گے اور سلطان کی پیشوائی کے لئے مجھے بھی جلد سے جلد اپنے جنگی پڑاؤ پر پہنچنا ہے میرا گھوڑا کافی تیز اور صرف پانچ سو اسی سو گز میں یقیناً ہم شام سے پہلے ہی منزل کو جا لیں گے۔"

پر تھال حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے شہزادہ واقعی

وہ کہہ رہا تھا۔

”میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے میرے گھوڑے کو کافی محنت کرنا پڑے گی، لیکن میں تمہیں دیکھے بغیر کیسے چلا جاتا۔“

”جان عالم! آپ کو میرا اتنا خیال ہے؟“

”چند باتیں بتانے کے لئے مجھے رٹنا پڑا۔“ اس نے کہا۔ ”اس بات کا خیال رہے کہ تم کوئی عام لڑکی نہیں جو چند روز کسی مجلس میں مہمان بنائی جاتی ہے۔ سلطان معظم تمہیں اپنی بیٹی کا اعزاز دے چکے ہیں اب تمہاری حیثیت پہلے سے بہت مختلف ہے اور تمہیں اس حیثیت کے مطابق ہی مجلس کی عورتوں سے گفتگو کرنا ہوگی۔“

”میں سمجھتی ہوں جان عالم!“

”یہی جہاں پر تم ہر قسم کا اعتماد کر سکتی ہو۔ میری کوئی بات ان سے چھپی نہیں رہتی رونق بیک کی طرح وہ بھی جانتی ہیں کہ میرا تمہارا تعلق کیا ہے۔“

”جان عالم!“ پر تھاں تعجب سے چیخ اٹھی۔

”گھبراؤ نہیں، وہ تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گی پھر اب تو سلطان نے تمہیں بطور امانت یہی جہاں کے سپرد کیا ہے۔“

پر تھاں کی نگاہیں کہہ رہی تھیں ”لیکن آپ کے بغیر تو میں پھر بھی تنہا رہوں گی۔“

”اور آخری بات۔۔۔“

شہزادہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”میں نے تمہیں ایک انگشتری بھی دی تھی۔“

پر تھاں نے مسکرا کر اپنی چولی میں ہاتھ ڈالا اور ہیرے کی انگشتری اس کی پتیلی پر جگمگا رہی تھی۔

”میں نے اسے بحفاظت چھپا رکھا ہے۔“

”نہیں، اب اسے چھپانے کی ضرورت نہیں۔“ شہزادہ نے کہا۔

”یہاں تم اسے ہاتھ میں بھی بیٹھ سکتی ہو۔ یہ معمولی انگشتری نہیں۔ مجلسِ اول کی کنیریں اور خواجہ سرا اس کو دیکھ کر تمہاری ہر فرمائش پوری کر دیں گے۔“

”کیا یہ کوئی جادو کی انگشتری ہے؟“ پر تھاں کے لبوں پر مسکراہٹ ناسمجھ رہی تھی۔

”ہاں اس کے سرے میں ایک دیو بند ہے۔“ وہ بھی ہنسنے لگا۔

”یہ دیو تمہیں ہر خطرے سے محفوظ رکھے گا۔ یہ شاہی انگشتری ہے جو سلطان معظم کے بعد صرف ولی عہد کے پاس رہ سکتی ہے۔ اب تو تم نے اس کی طاقت کا اندازہ کر لیا ہو گا۔“
پرتھال نے حیرت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ تو خیرادے کو مجھ پر اتنا اعتماد ہے اُس نے اپنی شاہی انگشتری مجھے دے رکھی ہے اس احساسِ نرس کے دل کو کچھ لای تو دیا۔

”یہ تم اچانک خاموش کیوں ہو گئیں۔ کیا ماں باپ کی یاد تو نہیں ستا رہی؟“
”نہیں جانِ عالم! میں اپنی خوش بختی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ پرتھال نے جواب دیا۔

”کل تک میں ایک غریب شہر کی لڑکی تھی اور ہماری زندگی دوسروں کے رحم و کرم پر تھی۔ بھگت آج..... آج میں سلطان وکن کی بیٹی ہوں اور بے شمار زندگیاں صرف میرے رحم و کرم پر ہیں۔ میں جس قدر بھانگوان ہوں، کتنی خوش قسمت، میری تقدیر کے.....“
پرتھال فحشہ بھی مکمل نہیں کر پائی تھی کہ خیرادہ نے اُس کی بات کاٹی۔
”یہ مت بھولو! تقدیر کبھی کبھی یاد دہاؤں کو بھی دھوکہ دے جایا کرتی ہے۔“
”آپ..... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں میں نے ٹھیک کہا ہے۔ تقدیر کی ڈور سنبھالنے کے لئے تدبیر سے کام لینا پڑتا ہے ورنہ ذرا سی غفلت زنجیر بن کر پاؤں سے لپٹ جاتی ہے۔“
”میں سمجھی نہیں جانِ عالم!“

”آج میں تمہیں ایک ایسی بات بتا رہا ہوں جو رفتی یک بتانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مخلص اڈن کا وہ راز جو ان اونچی اونچی دیواروں سے باہر نہیں نکل سکتا اور تقدیر کے کھیل کی طرح پائے بدلتا رہتا ہے۔“
پرتھال نے تن گوش تھی۔ خیرادہ کہنے لگا۔

”ہیکم شیرازی میرے خون کی بیانی ہے اگر اس کے کانوں میں جہادی محبت کی بھنگ پڑ گئی تو وہ تمہاری بھی جان کی دشمن بن جائے گی اور کیا معلوم میری عدم موجودگی میں تمہیں نقصان پہنچانے سے بھی باز نہ آئے لیکن وہ زریں کے بغیر ایک بے جان لاش کے سوا کچھ

نہیں۔ تمہیں اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔“

پر قتال نے حیرت پاش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور سوچے گئی، یہ زریں آخر کیا قیامت ہے جس سے دلی عہد بھی خوفزدہ ہے۔ تھوڑی دیر پہلے بیگم جہاں نے بھی اُسے زریں کی طرف سے خبردار رہنے کی تلقین کی تھی۔ آخر وہ ایکہ خواجہ سرا ہی تو ہے لیکن محل میں ہر کوئی اس کے خوف سے لرزہ بر اندام تھا وہ بیگم عالیہ اور بیگم جہاں کی گفتگو میں بھی اُس کا ذکر سن چکی تھی اور اب۔۔۔ اب سلطان کے بعد دکن کا سب سے باعزت، سب سے با اختیار شہزادہ حسن بھی اُسے زریں کے خطرہ سے آگاہ کر رہا تھا اس کا مطلب ہوا کہ اس کے اختیارات ناقابل یقین حد تک وسیع ہیں۔ جس کے خوف سے بیگمات بھی کانپتی ہیں جس کی دہشت درد و دیوار پر طاری ہے جس کے ذکر پہ دلی عہد کی آنکھوں میں بھی خطرے کی ایک لکیر سی چمکنے لگتی تھی۔ تو کیا بھئی مجلسِ اراکین میں خواجہ سرا حکومت کرتے ہیں؟ یہ بات اس کے دماغ و دھماں میں بھی نہیں تھی۔ تعجب سے اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ایک لمحہ خاموش رہ کر ولی عہد نے پوچھا۔

”تم کیا سوچے لگیں؟“

”کچھ نہیں جانِ عالم! میں زریں کی تعریف پہلے بھی سن چکی ہوں۔“

”سن چکی ہو نا تو پھر اُسے منہ لگانے کی کوشش نہ کرنا۔“

”میں تو سوچتی ہوں یہاں رہ کر میں کچھ آرام کر سکوں گی۔ ماضی کے ان بھیانک

سمانوں کو بھولنے کی کوشش کروں گی۔ جو موت کی طرح میرا تاقب کرتے رہے لیکن یہاں

ان میں قدم قدم پر خطرے کی بوسنگھ رہی ہوں۔ یہ کیسی زندگی ہے یہ کیسا جینا ہے۔ اب تو

مجھے ان اونچی اونچی دیواروں سے خوف آنے لگا ہے یہ گونگے اور بہرے ستونِ موت کے

دیوتاؤں کی طرح سرد اور خاموش ہیں۔ یہاں پردوں کی اوٹ میں بیجا تک بر گوشیاں ہوتی

ہیں۔ جیسے موت جھنجھٹا رہی ہو۔ یہاں کی فضا میں میرا دم گھٹ جائے گا جانِ عالم مجھے

یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے چلنے میں ان محلوں میں زنجیر نہ رہ سکوں گی۔“

پھر وہ ایک خوفزدہ برنی کی طرح بہم کر جیسے اُس نے موت کی جھلک دیکھ لی ہو، دلی

عہد کے ساتھ لگ گئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ ”پیارے محلوں میں نہیں۔۔۔ دیرانوں

میں پلتا ہے جانِ عالم! مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے یہ اونچی اونچی بے رحم دیواریں میری محبت کا

گلا گھونٹ دے گی میں یہاں نہیں رہوں گی۔ نہیں رہوں گی۔“

”ہوش میں آؤ پر تھاں۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں جان عالم! تقدیر بادشاہوں کو بھی دھوکہ دے جایا کرتی ہے شاید قسمت مجھے بھی فریب دے کر یہاں لے آئی ہے لیکن اب میں ان غلوں میں نہیں رہتا چاہتی جہاں یگمات اور شہزادے ایک خواجہ سرا سے خوفزدہ ہیں۔ جہاں وجود اپنے سائے سے ڈرتے ہیں جہاں زوریں.....“

اپنا تک و لی عہد کے ایک بھیا تک اور خوفناک قہقہہ نے پرتھالی کی بات کاٹ دی اور وہ متحیر اور ششدر شہزادہ کو دیکھنے لگی جو ہنس رہا تھا لیکن اس کی بھیا تک ہنسی میں موت کے کھٹکھٹکے چمکنے لگے۔ تب پھر اس نے حقارت سے کہا۔

”بھئی شہزادے ایک خواجہ سرا سے ڈریں گے؟ اوں ہوں۔۔۔ وہ موت سے بھی نہیں ڈرتے۔ کل تم کو بچھڑی تھی۔ اس مرد و دو ڈریں کی لاش کتے فوج رہے ہوں گے۔“

پر تھاں نے دیکھا۔ ولی عہد کے چہرے آؤ آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں وہ سخت برا فروخت نظر آ رہا تھا۔ جیسے زہری لکڑی مل جائے تو ایسی اس کا سر قلم کر دے گا۔ اجانک وہ جانے کے لیے مڑا تو چند قدم کے فاصلہ پر کسی کو کھڑا دیکھ کر متحجب کر رہ گیا۔

وہ ایک خواجہ سرا تھا جس نے شہزادیوں کی سی پوشاک پہن رکھی تھی۔ سر پر ایک خاص نشان اُسے عام خواجہ سراؤں سے ممتاز کرتا تھا کمر میں سونے کی تاروں سے کشیدہ ایک سنہری بیٹی تھی جس میں ایک ہاتھ لبا بخر لٹک رہا تھا۔ بیٹی کا پھندا کمر پر جھول رہا تھا اس کے چہرہ کے نقش و نگار اس کے حسین ہونے کی شہادت دے رہے تھے مگر اس وقت وہ چہرہ خوف کی وجہ سے زرد ہو گیا تھا جیسے کسی نے اس کا خون چوس لیا ہو اس کے بدن پر ایک لرزش تھی۔ سر سے پاؤں تک ایک عجیب سی کیکیا ہٹ، جس میں موت کا خوف نمایاں تھا۔

پر تھاں اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اچانک اس نے دلی عہد کی گرجتی ہوئی آواز سنی۔

"زوریں..."

"...میں"

جیسے اچانک پاؤں پر بچھو کاٹ لیتا ہے زوریں کاٹا مٹتے ہی پر تھل اٹھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی پھر اس کی نگاہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

[illegible]

قدموں پر ڈھیر ہو چکا تھا اور ایک لرزتی ہوئی آواز رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔

”رحم۔۔۔ جاننا عالم۔۔۔ مجھ پر رحم کیجیے۔۔۔ میں بے تصور ہوں۔۔۔ میری جان بخشی فرمائیے شہزادہ عالی! میری موت کا حکم واپس لے لیجئے۔ میری جان آپ پر فدا ہو میں بالکل بے گناہ ہوں۔۔۔ مجھ پر رحم فرمائیے۔“

پرتھال نے دیکھا زریں نے دونوں ہاتھوں سے دلی عہد کے پاؤں تھام رکھے تھے اور اس کا سر پاؤں کو چھو رہا تھا۔ اس کی گلوگیر آواز بدستور گونج رہی تھی۔

”پرتھال کے مددے مجھے بخش دیجئے جاننا عالم! مجھے بخش دیجئے۔ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گی۔“

”کھڑی ہو جاؤ۔“ شہزادہ نے رعب دار آواز میں حکم دیا اور زریں پاؤں چھوڑ کر کاپتی اور تھر تھراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اس کے آنسوؤں کی دھار رخساروں پر بہہ رہی تھی اور آنکھوں میں ابھی تک موت کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں اس نے سکیکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا جاننا عالم نے میری موت کا حکم واپس لے لیا؟“

”تم پوچھنے والی کون ہوتی ہو؟“

اور زریں کا چہرہ پھر ایک مرتبہ زرد ہو گیا۔

”لیکن۔۔۔ ہم تمہیں مہلت دیں گے۔“

جسین کی زبان سے یہ الفاظ سن کر زریں کی جان میں جان آئی۔ وہ منہ مٹانے لگی۔

”آپ جو چاہیں گے وہی ہوگا۔ آپ آئندہ مجھے وقار دیا کریں گے۔“

”خوشامد کرنے میں تمہاری زبان قہقہے کی طرح چلتی ہے۔“ شہزادہ کہنے لگا۔ ”لیکن

یہ زبان کاٹی بھی جاسکتی ہے۔ تمہیں فیروز کا انجام یاد رکھنا چاہیے۔“

جسین نے کیا بات تھی۔ فیروز کے انجام کا ذکر سنتے ہی زریں کے منہ سے ایک چیخ نکل

گئی۔ جس نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اچانک بولا۔

”پرتھال۔۔۔ بیگم جہاں کے محل میں رہے گی۔“

”میں سن چکی ہوں جاننا عالم۔“

”اس بات کا وہ بیان رہے پرتھال ہمارا کی امانت ہے۔“

زریں نے سر جھکا دیا۔ ”آپ مطمئن رہیے گرم ہوا بھی ان کے بدن کو نہیں چھو سکے گی۔“

”اب تم جا سکتی ہو۔“

زریں اُلٹے قدموں چلتی ہوئی کچھ دور چل کر چلی اور آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی پھر وہ ایک عمارت کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔

حسن نے پلٹ کر پرتھالی کی طرف دیکھا جو حیران و ششدر کھڑی تھی۔ زریں کا سر اس کی آنکھوں کے سامنے ٹوٹ چکا تھا اور یہ اچھا ہی تھا اور نہ بچانے وہ اُسے کیا سمجھتی رہتی۔

”تم نے دیکھا وہ ایک کتیا کی طرح میرے پاؤں پر سر رکھے روتی رہی ہے اور مجھے امید ہے اب وہ تم سے الجھنے کی کوشش نہیں کرے گی، پھر بھی تمہیں محتاط ہی رہنا چاہیے وہ

سلطان معظم کی مقرب ہے بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا صلہ ساری عمر بھگتنا پڑتا ہے۔ زریں نے ایک مرتبہ نفل سبحانی کی جان بچائی تھی۔ خیر تمہیں ان باتوں سے کیا واسطہ

بہر حال وہ ایک خواجہ سرا ہے اور تم.....“

”اور اسی لئے آپ نے اسے آگ دکھا کر چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ وہ جلتی اور سلگتی رہے۔“

”لیکن وہ پاگل نہیں۔ ایک دلی عہد کے اختیارات کو خوب سمجھتی ہے۔“

یہ کہہ کر حسن نے سورج کی طرف دیکھا جو قیروز آباد کے مغربی درختوں پر چمک رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

”سورج دھل چکا اور مجھے شام سے پہلے دریائے جھک بھدرا کو عبور کرنا ہے اچھا تو

اب رخصت ادورائے سے نیٹ کر میں جلد لوٹ آؤں گا۔“

”لیکن مجھے آپ کی خیریت کی خبر تو ملتی رہے گی نا؟“

پرتھالی نے تشویش انگیز لہجے میں پوچھا۔

”گھبراؤ نہیں۔ میری آنکھیں اسی محل کا طواف کرتی رہیں گی۔ خدا حافظ!“

”خدا حافظ! بھگوان آپ کی رکشا کرے۔“

”پھر پرتھالی نے اُسے ایک دیوار کی اوٹ میں غائب ہوتے دیکھا اور وہ دل بکڑ کر

آہستہ آہستہ قعر کی طرف چلنے لگی۔

حسین ناگن

خوبی پرتھالی کرے میں داخل ہوئی۔ بیگم جہاں کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے

گئی۔ ”اے نرکی! تم کہاں چلی گئی تھیں، میں تو فکر مند ہو گئی۔ دیکھو! یہ کنیریں تمہیں سب کمروں میں ڈھونڈ آئی ہیں۔“

پر تھاں نے باہر برآمدے میں نظر ڈالی تو آٹھ کنیریں سینوں پہ ہاتھ باندھے خاموش کھڑی تھیں۔ ان کے چہروں کے اثرات سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی مالک کی طبیعت کو خوب سمجھتی ہیں اور اس کے معمولی سے دکھ کے لئے کافی پریشان ہو جانے والی ہیں۔ شاید مشرق کا یہی وہ جذبہ وفاداری تھا۔ جس نے عورت کو تقدس کا درجہ دے دیا تھا۔

بیگم یہاں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی تو پر تھاں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا اس محل میں کہیں کھو جانے کا اندیشہ بھی ہے؟“

بیگم جہاں نے تعجب انگیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ خوب سمجھتی تھی۔ پر تھاں نے یہ سوال کیوں کیا ہے آخر یہ محل تھا۔ جگہ تو نہیں۔ جہاں کسی کے کھو جانے کا خطرہ ہوتا اور اس کے لئے یوں پریشانی کا اظہار کیا جاتا مگر پر تھاں کو کیا معلوم بیگم اس کے لئے کیوں پریشان نظر آتی تھی۔

”بیگم جہاں کے محل میں پرندے بھی اس کی اجازت کے بغیر پر نہیں مار سکتے۔ سمجھیں؟ مگر جب تک تمہیں محل کی کنیروں اور خادماؤں سے واقفیت نہ ہو جائے تمہارا زیادہ دور تک جانا مناسب نہیں۔“

”مگر میں زیادہ دور تو نہیں گئی بس بارہ دری پہ تھی۔“

”اوہو..... ابھی کچھ دیر پہلے میں نے زریں کو بھی اُدھر جاتے دیکھا تھا۔ کہیں اس نے کوئی گستاخی تو نہیں کی؟ وہ نرکی آفت کی پرکالہ ہے۔“

”نہیں بیگم حضور! بھلا اُسے مجھ سے کیا ایر ہو سکتا ہے۔“

”تم نہیں سمجھتیں بانو! اس کی رگ رگ میں خطیبت کر دیں لیتی ہے مگر اس مردود کے ذکر پر لعنت سمجھو۔ آؤ ان کنیروں سے مل لو یہ تمہارا ہر طرح خیال رکھیں گی۔“

پھر بیگم جہاں اس کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے میں لے آئی۔ انہیں دیکھتے ہی کنیریں جھک گئیں۔

”میرے ہاں کوئی خواجہ سرا نہیں۔ میں ان کتوں سے نفرت کرتی ہوں انہیں لٹائی بچائی کے سوا کوئی کام نہیں۔ یہ کنیریں میری وفادار ہیں۔ میں بھی ان پر اعتبار کرتی ہوں۔“

پھر اس نے کنیزوں کی طرف انگلی اٹھا کر باری باری ہر ایک کا نام پکارا۔
 ”گل رخ، سون، مشتری، زہرہ، نورانی، زرینہ، گلزار اور اس کا نام ہے اتار بالا۔“
 بیگم جہاں آٹھویں کنیز کے پاس پہنچ کر رک گئی۔
 ”اتار بالا؟“ پر قتال کے لہجے میں تعجب تھا۔

”ہاں۔۔۔ یہ ملک گنہ سے آئی ہے۔ ہندو ہے اور بہترین رقص جانتی ہے۔ سلطان
 جب بھی بکھار میرے یہاں تشریف لاتے ہیں تو اتار بالا کا ناچ بھی دیکھتے ہیں۔“
 پھر وہ یگانگت پر قتال کی طرف ہلٹی اور مسکرا کر کہنے لگی۔
 ”اتار بالا! آج سے میں نے تمہیں بخش دی۔ یہ تمہارا دل بہلائے گی۔“
 ”شکر یہ بیگم حضور! آپ مجھ پر بڑی کرم فرمائی کر رہی ہیں۔“

اتار بالا کے ہونٹوں پر بھی ایک خفیف سی مسکراہٹ تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ
 مالک کا فیصلہ سن کر اسے خوشی ہوئی ہے۔

محلات میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ سلطان معظم نے پر قتال کو
 اپنی بیٹی بنا لیا ہے اور بیگمات سے لے کر کنیزوں تک ہر عورت کے دل میں رشک و حسد
 کے جذبات ابھر آئے تھے، وہ پر قتال کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھیں۔ یقیناً وہ لڑکی۔۔۔
 عجیب الہیت ہوگی، جو خنجر کی زبان سے گفتگو کرتی ہے۔

محلات میں دعوتوں کا عام رواج تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی امیر یا خان کی طرف سے
 دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں بیگمات اور شہزادیوں کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ ان
 دعوتوں کا مقصد قرب سلطانی حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا اور اگر تھا تو صرف
 اتنا کہ اونچی اونچی فیصلوں اور دیواروں میں گھری ہوئی زندگی کی بیکانی اور تہائی کا استنا
 توڑ دیا جائے اور معزز خواتین اس یہانے میل ملاپ کی لذت اٹھا سکیں۔ شاہی خاندان کے
 افراد ان دعوتوں میں شریک ہوتے، تو ان کی بہار ویدنی ہوتی تھی۔ نہ صرف شاہی بیگمات،
 امراء اور وزراء کی بیویاں اور خانزادیاں ہی زرق برق لباس پہن کر نکلتی تھیں بلکہ کنیزوں اور
 خواجہ سراؤں کی پوشاکیں بھی فائوسوں اور قدیلوں کی روشنی میں جگمگ جگمگ کرنے لگتی تھیں
 جیسے آسمان پر نھسے ستارے یا کبھی جھیل کے کنارے ان گنت جگنو جھلسا رہے ہوں۔ ہر
 بیگم اور امیر زادی کی بھی کوشش ہوتی تھی۔ لباس کے اعتبار سے نہ صرف وہ خود سب خواتین

میں ممتاز و منفرد نظر آئے بلکہ اس کی کینریں اور خادائیں بھی دوسری خدمت گزار عورتوں پر سبقت لے جائیں تاکہ وہ سلطان عالی سے اپنی نفاست پسندی اور خوش ذوقی کی داد لے سکے اور بیگمات کے جہرٹ میں اس کا وقار بلند رہے۔

بعض اوقات شاہی مہمانوں کے اعزاز و احترام میں بھی تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ لیکن یہ تمام دلچسپیاں، رونقیں اور بہار آفرینیاں دارالسلطنت گلبرگہ کے لئے مخصوص تھیں جہاں اگر ہر شب نہیں تو ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا رہتا تھا۔

فیروز آباد سلطان کا سرحدی دارالحکومت تھا اس نے وجیا نگر پر حملہ کے لئے اسی شہر کو اپنا فوجی مستقر قرار دیا تھا۔ جنگ نہ جانے کب تک جاری رہے اس لئے بیگمات اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد بھی فیروز آباد ہی میں نقل مکانی کر آئے تھے جو گلبرگہ کی بہ نسبت وجیا نگر کی سرحدوں سے زیادہ قریب تھا ان کے ساتھ بعض امیروں اور خواتین کے گھرانے بھی جو ہر حال میں شاہی خاندان کے ساتھ رہنا باعث شرف و عزت سمجھتے تھے۔ فیروز آباد منتقل ہو گئے تھے۔

دیورائے نے سرحدی لوٹ مار کو ایک مشغلہ بنا لیا تھا اور خود اس کے کھلیان میں جنگ کی چنگاریاں جھنجکی تھیں لیکن سلطان اب تک خاموش تھا، پر حال اچانک ہی تاریخ کے صفحہ پر ابھری تھی اور سلطان نے وجیا نگر پر فوج کشی کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے اپنے فوجی مستقر سے جس شان و شوکت اور دبدبہ کے ساتھ کوچ کیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ کسی چھوٹی موٹی سرحدی جھڑپ پر قناعت نہیں کرے گا بلکہ ایک فیصلہ کن جنگ کا ارادہ رکھتا ہے اور فیصلہ کن جنگیں ہمیشہ موت کے ساحلوں پر لڑی جاتی ہیں۔ یہی وجہ تھی، سلطانانے لشکروں کی روانگی کے بعد فیروز آباد کے شاہی محلات، کوٹھک، ہراؤں اور خواتین کی حویلیوں پر الم انگیز اور پراسرار خاموشی چھا گئی تھی۔

گلبرگہ میں آئے دن کسی نہ کسی دعوت کے سامان ہوتے رہتے تھے لیکن یہاں پہنچ کر ایک عجیب سی افسردہ گی طاری تھی۔ کسی کو تفریح کا خیال ہی نہیں آیا تھا صبح و شام، وقت کا ہر لمحہ جنگی تیاریوں، لڑائی کے نقشوں اور مشوروں کی گفتگو میں گزر گیا تھا اور اب شاید عورتیں اپنے شوہروں اور بھائیوں کے لئے اواس ہو گئی تھیں جو سلطان کے ہمراہ گئے تھے اگرچہ کہیں عورتیں لڑائی کے نام سے غزوہ تو نہیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن فوج کی روانگی کے بعد

فیروز آباد پر اسرار خاموشی میں ڈوب گیا تھا۔

دروڑ اسی اداسی اور خاموشی میں گزر گئے۔ پرتھالی ان دونوں میں قصر لالہ سے باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ تو بس سوتے جاتے بنے دیکھتی تھی۔ اس کا دھیان ہر وقت وجیا نگر کی طرف لگا رہتا تھا۔ سرحد کے اس پار سے اس کے سوا اور کوئی خبر نہیں آئی تھی کہ سلطان کے لشکر دریا عبور کر کے بیجا پور کی طرف بڑھے جا رہے ہیں اور ابھی تک دیوارائے کی فوجوں سے آسنا سامنا نہیں ہوا۔

وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھی انار بالا سے گلبرگہ کے محلات کی دلچسپ کہانیاں سنتی رہتی تھی۔ اگر طبیعت بے چین ہو جاتی تو جھروکے میں آ بیٹھتی اور اس کی ٹانگہاں سمجھوڑی کے اس پار مدھی کی لٹی پٹی بستیوں اور بے آب و گیاہ خشک پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی جنوبی افقی چرچم کے رہ جاتیں جہاں دکن اور وجیا نگر کی سرحدیں ملتی تھیں جہاں زمین اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے تھے اور ان کے درمیان خون کی ایک لکیری کا پٹی تھی۔ جھروکے سے اٹھ کر وہ کبھی کبھی بارہ درزی کی طرف نکل جاتی اس کے ہشت پہلو ستونوں کے ساتھ لگ کر کچھ سوچتی پھر بھندی کی بازو پھلانگ کر پائیں باغ میں چلی جاتی اور ناشپاتیوں اور سنکڑوں کے پودوں کے سایوں میں گھوم پھر کر واپس آ جاتی۔

اس دن کے بعد درزیں اُسے پھر نظر نہیں آئی تھی حالانکہ انار بالا کی زبانی وہ سن چکی تھی کہ وہ شیطاں کی خالہ دن میں ایک نہ ایک مرتبہ قصر لالہ کا چکر ضرور لگاتی تھی لیکن اس کی اچانک غیر حاضری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ انار بالا کا خیال تھا وہ یقیناً بیمار ہو گئی پرتھالی نے درزیں کی بے عزتی کے واقعہ کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس لئے دوسری کثیرین بھی اس کی غیر حاضری کو بیماری پر ہی محمول کر رہی تھیں۔

تیسرے روز جب قد ملیں روشن ہو چکی تھیں درزیں اچانک قصر لالہ میں رکھائی دی وہ بیگم جہاں کے نام اپنی جیتی مالک شیرازی کا کوئی پیغام لے کر آئی تھی لیکن خلاف معمول بڑی انسرودہ اور بھیجھی جی نظر آ رہی تھی اور حلاشی نگاہوں سے اوجھڑا دیکھ رہی تھی۔ شاید اُسے پرتھالی کی تلاش تھی۔

بیگم جہاں، درزیں سے پیغام سننے ہی برا فروخت ہو گئی اس نے غصہ میں تھر تھراتے ہوئے کہا۔

”انہیں میں اپنی بات کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی کہ ان اضطراب گیر ایام میں کوئی بیگم تفریح کا تصور بھی کر سکے۔ ہرگز نہیں۔ شیرازی سے کہو وہ کچھ چین سے بیٹھ جائے بھلا یہ کہاں کی عطلندی ہے۔ ابھی وجہاً مگر سے کوئی خبر نہیں آئی اور ہم قبل از وقت ہی عیش و مسرت کی تحفیلیں منعقد کرنے لگیں ہرگز نہیں۔ کیا مظلوم کس کا لہو زمین کو سیراب کرتا ہے لیکن خون بے گام ضرور۔ وجہ مگر کی زمین میری آنکھوں کے سامنے انسانوں کا خون چاٹ رہی ہے اور بیگم شیرازی کو دعوتوں کا خیال پریشان کر رہا ہے، استغفر اللہ خدا معاف کرے۔ جاؤ زریں! اپنی مالک سے کہو جب تک بد بخت دیورائے اپنے گناہ کی سزا نہیں بھگت لیتا۔ اس وقت تک فیروز آباد کے عکلوں میں بھی خوشی کی کوئی تقریب منعقد نہیں ہو سکتی۔

بیگم جہاں مسلسل بولتی رہی اور اس دوران میں اُس نے کئی مرتبہ زریں کی طرف قہر آلود نگاہوں سے گھورا لیکن زریں چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی۔

”انہیں بیگم حضور! آپ نہیں سمجھیں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”بیگم شیرازی یہ دعوت پر تھاں کے اعزاز میں دینا چاہتی ہیں۔“

”پر تھاں؟“

بیگم جہاں بھڑک اٹھی۔ ”وہ پر تھاں کی کیا لگتی ہے؟ اے کہہ دو۔۔۔ اس پھول کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے کانٹوں سے الجھنا پڑے گا۔ کیا میں شیرازی کو نہیں جانتی۔“

”آپ کی نگاہ در تک پہنچنے والی ہے۔“

”تو پھر اے میرے فیصلہ سے آگاہ کر دو اور یہ بھی یاد دلاؤ۔ پر تھاں میری حفاظت میں ہے۔“

”آپ کو غلط فہمی ہے بیگم حضور!“

زریں نے قدر سے جھک کر جواب دیا۔ ”وہ صرف یہ چاہتی ہیں جو لڑکی ایک بہت بڑی جنگ کا باعث بنی ہے اے روپوش نہیں رو رہا رہتا چاہیے۔ محسوس کی سب بیگمات اور خواتین سلطانِ عظم کی بیٹی سے ملنے کے لئے سبہ قرار ہیں لہذا اس دعوت کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔“

”تو پر تھاں سے ملاقات کرنے کے لئے بیگمات نے شیرازی کا سہارا لیا ہے؟“

”میں کیا عرض کر سکتی ہوں۔“

"اچھا" بیگم جہاں کچھ سوچے گئی۔ "میں خود ہی دعوت کا اہتمام کر کے ان کی یہ خواہش پوری کر دوں گی۔"

"بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن میری ناچیز رائے میں بیگم شیرازی کی دعوت رد نہ کی جائے۔"

"زیریں! تو بہت گستاخ ہوتی جا رہی ہے کیا تو مجھے بھی سبق پڑھاتے آئی ہے؟"

"میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ میں بیگم حضور کی شان میں گستاخی کروں۔" زیریں کے لہجہ میں فرمانبرداری اور اطاعت کی جھلک تھی۔ "لیکن سلطان معظم کی بیٹی کی عزت افزائی کرنا بیگم شیرازی کا حق ہے اس لئے۔"

"تجھے باتیں بنانا خوب آتی ہیں زیریں۔" بیگم کے لیوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "تو کیا میں سمجھوں میری درخواست قبول کر لی گئی ہے۔"

"جائے۔۔۔ میں شیرازی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی لیکن کان کھول کر سن لو۔ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو آداب سلطانی کے خلاف ہو۔"

بیگم کی نگاہوں میں ایک خوفناک چمک تھی جس نے زیریں کے جسم پر کچھ سی طاری کر دی۔ اُس نے نہایت احترام کے ساتھ اپنا سر جھکا کر بیگم کو تعظیم دی اور بولی۔

"کوئی بد بخت ہی ایسا تصور کر سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر زیریں ہلٹی اور تیز تیز چل دی۔ پشت پر اس کی قبائلی سے بنی رہی تھی۔ ایک نیم تاریک غلام گردش سے گزر کر جب وہ پرتھال کے کمرے کے پاس پہنچی تو یکلخت اُس کی رفتار مدھم پڑ گئی اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا پھر ایک خالی دارغرفہ سے اندر جھانکنے لگی۔

پرتھال ایک مسہری پر غرفہ کی طرف پشت کیے لیٹی تھی۔ اس کے علاوہ کمرہ میں کوئی نہ تھا۔ آثار بالا شاید اپنے خمرے میں آرام کر رہی تھی۔ پرتھال کے لیٹنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ سو گئی ہے۔ کمرے میں ایک قدیل کی مدھم سی روشنی ٹھہر رہی تھی۔

زیریں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک مرتبہ پھر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں پھر اُس نے اپنی قبائے چھوٹا سا کس نکالا اور دوسرے ہی لمحے دو بالشت کا ایک سیاہ سانپ غرفہ کے اندر رہینکا چارہا تھا۔

زیریں نے بجلی ایسی سرعت کے ساتھ کس کو قبا میں لپیٹا اور نہایت تیزی سے تاریک رابداری کو پار کر گئی۔ بس بجلی کا ایک کوہدا تھا کہ لپک کر غائب ہو گیا۔

رینگتی ہوئی موت

قصر لالہ آہستہ آہستہ غنڈ کی طلسم زا خاموشیوں میں گم ہوتا جا رہا تھا اچانک خاموشیوں کا سیدہ زخمی کرتی ہوئی ایک بھیاک چیخ کی آواز ابھری۔
دہشت آلود..... لرزہ خیز..... اور جگر خراش نسوانی چیخ

شدت خوف سے کانپتی اور کسی آئینی روح کی مانند وحشیانہ انداز میں پلائی ہوئی ایک وحشت ناک اور درد ناک آواز جو ہولے ہولے بتدریج موت کی خنیم خراہٹوں میں ڈوبتی چلی گئی اور دوسرے ہی لمحہ محل کی کپکپاتی فضا پر پھر مرگ آساناء طاری ہونے لگا۔

اس روح فرسا چیخ کی آواز اتنی تیزی کے ساتھ ابھری کہ غلام گردشوں جھروکوں اور سنگ خشت کی دیواروں کے جگر چرتی ہوئی قلعہ کی فسیل سے جا نگرائی اور عین اسی وقت قصر شیرازی کی روشن خواب گاہ میں ایک نسوانی توبہ کالج کی چھوٹی چھوٹی کرچیوں کی طرح ادھر ادھر بکھر گیا۔

”ہی ہی ہی ہی..... آری مردود! تو کامیاب رہی..... ناگن نے ڈنگ چلا دیا۔“
”آفریں ہے آپ کے دماغ پر بیگم حضور..... کیا تدبیر نکالی۔ واللہ! میرے فرشتوں کو بھی ایسی نہ سمجھتی۔“

فرط مسرت سے کپکپاتی ہوئی یہ آواز زیریں کی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جگر خراش چیخ کی آواز سن کر اس کی روح مسرت سے جھوم اٹھی ہے۔ وہ اپنی مالکن بیگم شیرازی کے حضور کھڑی تھی۔

”اس ناگن کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگا۔“
بیگم شیرازی اچانک سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”یقیناً وہ اس وقت اپنی سو رگ میں بیچ چکی ہوگی۔ پھر بھی تو ظہیر کے پے کر آنا۔“
”سم..... سم..... میں.....؟“ زیریں ہٹکائی۔

”تو کیا اس غریب کی لاش پر دو آنسو بھی نہیں بہائے گی؟“

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

”لیکن میرا جانا مناسب نہیں ہوگا۔ بجلی کو بھیج دوں گی۔ وہ رکھ آئے گی۔“

”تیرا جانا کیوں مناسب نہیں ہوگا۔ پرہاں تو ٹھیک کہتی ہے، بجلی ہی کو بھیج دینا۔“

پھر فوراً ہی جیسے شیرازی کو کوئی بات یاد آگئی۔ آہستہ سے بولی۔

”لیکن دیکھ! کبھی بجلی کو کہیں شہر نہ ہونے پائے کہ ہمیں اس کی موت سے کوئی

دبچسی ہو سکتی ہے۔“

”تو یہ کیجئے، بیگم حضور! آپ زریں کو کیا سمجھتی ہیں؟“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ جا بجلی کو ابھی بھیج دے۔ میں اس کی موت کا حال سننے کے لئے

مری جا رہی ہوں۔ میں یہیں انتظار کروں گی۔ اُسے کہنا ذرا لپک کے جائے۔ اُوہ بے

چاری نے دو روز بھی محلوں کا آرام نہ دیکھا۔ خیر حسن کا ایک حساب تو یہاں ہوا۔ باقی پھر

سکنا۔“

یہ کہہ کر شیرازی زہر آلود ہنسی کے ساتھ مسدوی کی طرف پٹلی اور زریں نے دروازے

کا رخ کر لیا پھر وہ ایک نیم تاریک سی راہداری میں لپکتی چلی گئی۔



بھیابک چیخ نے قصر لالہ پہ رُخ کر لیا سا طابری کر دیا تھا۔ صدر دروازے کا محافظ نیزہ

سنجھالے تیز قدموں کے ساتھ غلام گردش میں بھاگنے لگا۔

آواز شاید موت کی نجد خاموشی میں خلیل ہو چکی تھی کیونکہ پھر کوئی سسکی بھی سنائی نہ

دے سکی۔

بیگم جہاں کے ماتھے پر فکر کی لکیریں ابھرائی تھیں۔ مشعل کی لڑیاں روشنی میں اس

کی بوڑھی آنکھوں سے خطرے کی سیاحیاں جھانک رہی تھیں قصر کی سب کتیریں جاگ اٹھی

تھیں اور مشعل کی زرر روشنی میں اپنی مالکہ کے ہمراہ پر تعال کے کمرے کی طرف بڑھ رہی

تھیں۔ چیخ کی آواز اسی کمرے سے بلند ہوئی تھی۔

صدر دروازے کا محافظ دوڑتے دوڑتے اچانک اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ غلام

گردش کے نیم تاریک فرش پر دو بالشت کا ایک سیاہ ناگ اس بے صرف ڈیڑھ قدم کے

فاصلہ پر ریٹکتا بیٹھا چلا آ رہا تھا۔ وہ سنگ سرخ کے دو رستوں کے ساتھ بکرا گیا پھر نہایت

تیزی کے ساتھ اس کے ہاتھ میں نیزہ لہرایا اور دوسرے ہی لمحے کالا ناگ فرش پر لوٹنے لگا۔

ہیکم جہاں کینڑوں کے جلو میں چلتی پرتھال کے کمرے کے پاس بچے کے رگ مکی دروازے پر ایک بڑا سا سیاہ دھبہ نظر آیا پھر مشعل کی کانچی ہوئی زرد روشنی کا ہالہ مشتری کے چہرے پر تھر تھرا نے لگا جس پر موت کی زردیاں کھنڈ رہی تھیں۔
 ”مش..... تری.....“ کئی ہونٹوں سے ایک ساتھ سسکی کی آواز نکلی۔

”اے کیا ہو گیا ہے؟“

”میں نہیں جانتی.....“

کئی نگاہیں اچھل کر پرتھال کے چہرے پر بکھر گئیں۔ جو صندوق دلیز کے ساتھ یوں ہم صم کھڑی تھی۔ جیسے کوئی پتھر کی صورتی نصب کر دی گئی ہو پھر اس نے سہمی سی آواز میں بتایا۔

”آج میں جلدی مسہری پر لٹھی تھی کیونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن خینہ نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں سمجھی شاید اناربالا میرا حال پوچھنے آئی ہے پھر فوراً ہی ایک لرزہ خیز چیخ نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ میں گھبراہٹ میں اچھل کر فرش پر آ رہی مگر جب تب سنبھلی مشتری دھم سے دلیز پر گر چکی تھی اور اس کے گلے میں خراہٹ کی آواز بھی ڈھونڈتی جا رہی تھی پھر اچانک یہ خاموش ہو گئی۔ میں خوف سے کانپ اٹھی۔ اندر صرے میں اس کی آنکھوں میں سفید پتلیاں مجھے بڑی خوفناک نظر آنے لگیں۔ ہیکم حضورا اگر آپ نہ آ جاتیں تو نہ جانے میری کیا حالت ہوتی۔“

مشتری کا چہرہ اور جسم نہایت تیزی کے ساتھ نیلا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں پر ایک سیاہی مائل نیلگوں چھالا اُبھر آیا تھا اور یہ پاؤں بھی اچانک ہی سوچ کر پھول گیا تھا۔
 ”سانپ کا زہر.....“

اچانک جہاں دیدہ ہیکم کا چہرہ خوف سے پھل گیا اور دوسرے ہی لمحہ دروازے کا محافظ اپنے تیزے پر دو ہاشت کا سیاہ ناگ لٹکائے ان کے سامنے کھڑا تھا اس نے بتایا۔ یہ ناگ اسے غلام گردش میں رہنے کا نظر آیا تھا اور اس کا رخ صدر دروازہ کی طرف تھا۔
 ”تصبر لالہ میں کالا ناگ کہاں سے آیا؟“

بوڑھی جیگم زیر لب بڑبڑائی۔ ”اور وہ بھی پرتھال کے کمرے میں..... ہوں؟“
 ”کیا مشتری مر گئی.....؟“

اس سوال کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ لاش کی ٹھنڈی کلائی پر پڑا۔ شاید وہ نہیں ٹٹول رہا تھا۔ ایک لمحہ اضطراب انگیز سنائے میں گزر گیا۔ ابھی تک کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اس کی نہیں دیکھے شاید وہ زخمی ہو اور زہر نے اسے بے ہوش کر دیا ہو۔

اچانک محافظ اچھل پڑا۔ اس نے بیگم جہاں کی طرف دیکھا۔
”کیا بات ہے شاہ گل۔۔۔“

”بیگم حضور! میں ابھی آیا۔ یہ۔۔۔ زخمی ہے۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ نیم تاریک غلام گردشوں کی طرف تیزی سے بھاگا۔ بس ایک تیر تھا۔ جو کمان سے نکلا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

مشری کے زندہ ہونے کی خبر نے سب کے چہروں پر امید کی کرن اور روشنی پھیلا دی تھی۔ بیگم جہاں عجیب سی نظروں سے پر تھاں کو گھور رہی تھی۔ جو ابھی تک گرم دم دلیز کے ساتھ لگی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے ابھی ہونٹوں کو جنبش ہی دی تھی کہ شاہ گل ایک پوٹلی سی اٹھائے واپس آیا۔ وہ اس ٹھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا جو کئی کئی سال سے بھاگتا آیا۔

۲۰

اس نے کمر سے پتلی دھار والا ایک تاریک سا خنجر نکالا اور مشری کے پاؤں سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر پرے پھینک دیا۔ جس پر شاہ گلوں جھالا اُبھرتا جا رہا تھا۔ مشری کے جسم پر کوئی خفیف سی لڑخ بھی نہ ہوئی۔ پھر شاہ گل نے پوٹلی سے ایک سفید سفوف نکالا اور زخم پر چھڑکنے لگا۔ اس نے مشری کے نتھنوں پر بھی سفوف چھڑکا پھر پانی طلب کیا۔

گل رخ لپک کر ایک کٹوری میں پانی لے آئی تو شاہ گل نے وہ سفوف پانی میں گھولا اور مشری کا منہ کھول کر قطرہ قطرہ حلق میں پکانے لگا۔

مشعل کی روشنی میں شاہ گل کے چہرے پر مسکے کے سائے لڑاں تھے۔ کٹوری کا سارا پانی قطرہ قطرہ مشری کے حلق میں جا چکا تھا پھر اس نے کلائی بکڑی اور نبض تلاش کرنے لگا۔ اس دوران میں کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا جیسے سانس تک روک لئے گئے ہوں۔ اچانک بیگم جہاں کی آواز گونجی۔

”شاہ گل۔۔۔“

اس آواز میں ایک استفسار تھا۔ ایک خوف تھا۔ شاہ گل طاقی پھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”زہر اگر جگر تک نہیں پہنچا تو بچنے کی امید ہے۔“

شاہ گل کے لہجے میں امید کی روشنی بھی تھی اور مایوسی کا اندھا بھی پھر بیگم کے

اشارے پر کینروں نے مل کر مشنری کو اٹھایا اور مسمری پر ڈال دیا۔

”یہ اجنبی زہر ملا ناگ پہاڑوں میں رہتا ہے۔ میرا ایک بھائی اسی کے زہر کا لقمہ

بن گیا تھا اور تب سے یہ خوف۔۔۔۔۔“

لیکن میں حیران ہوں۔

بیگم جہاں نے شاہ گل کی بات کاٹ دی۔ ”یہ ناگ قصر لالہ میں کہاں سے آ گیا؟“

”آیا نہیں لایا گیا ہے بیگم حضور! یہ ناگ میدانی علاقے میں نہیں اترتا۔“

”پر تعالٰیٰ۔۔۔۔۔“ بیگم کے ہونٹ کچکا گئے وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ ”آج سے تم

میرے پاس سویا کر دی جاؤ۔۔۔۔۔“

کینروں کی نگاہیں پر تعالٰیٰ کے چہرے پر ریگنے لگیں۔

”شاہ گل! مہر دریں کے بعد محل میں کون آیا تھا؟“

”کوئی نہیں۔۔۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔“

”اور وہ بیگم شیرازی کی طرف سے پر تعالٰیٰ کی دعوت کا اجازت نامہ لینے آئی تھی۔“

کمرے پر پھر خاموشی چھا گئی۔ اسی لمحہ بجلی دروازے پر کھڑی کورٹس کی رسم ادا کر رہی

تھی۔

”علیہ خاتم! بیگم شیرازی نے پوچھا ہے۔ ابھی ابھی قصر لالہ سے ایک خوفناک جیج کی

آواز سنائی دی تھی۔ کوئی غیر معمولی حادثہ تو پیش نہیں آیا؟“

بیگم جہاں اس اچانک استفسار پر چونک اٹھی پھر غرا کر بولی۔

”بیگم شیرازی سے کہہ۔ حادثہ ہو چکا لیکن اس کا بھیجنا ہوا ناگ ہلاک کر دیا گیا ہے

اب وہ دوبارہ کسی کو نہیں ڈے گا۔“

بجلی پر جیسے جھج بجلی گر پڑی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی اور تیزی کے ساتھ چلتی ہوئی سچے

دور جا کر اندھیرے میں گھل مل گئی۔

پھر ایک ساتھ سب کی نگاہیں مسمری پر جم گئیں۔ مشنری کی لاش میں ذرا سی حرکت

پیدا ہوئی تھی۔ محلِ رخ نے آگے بڑھ کر اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”مشری..... مشری.....“

شاہ گل نے اس کے چہرے پر پانی کا چھینٹا دیا۔ مشری نے کرڈٹ بدلی۔ اس کے خشک چھٹے چھٹے سے ہونٹ ہلے۔ پھر ایک ہلکی سی کراہ کی آواز سنائی دی۔ پھر ہلکیں تھر تھرائیں اور مشری نے ہولے ہولے آنکھیں کھول دیں۔ جیسے وہ کسی گہری ناقابلِ یقین خیمہ سے جاگی ہو۔ موت کے دروازے سے پلٹ آئی ہو۔

اس نے حیرت پاش نگاہوں سے اپنے آس پاس مسکراتے چہروں کو دیکھا گویا انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو پھر اس کی نگاہ یسٹم جہاں پہ جم کے رہ گئی اور اس کے ہونٹ تھر تھرانے لگے۔

”بے..... گم..... جا..... ضرور.....“

”گھبراؤ نہیں مشری! تم بچ گئی ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو۔“

”خدا کا شکر ہے۔“ بے اختیار اس کے ہونٹ تھر تھرائے۔

اپنی مالکہ کو کھڑے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے مارے کراہ کر رہ گئی۔

”نہیں..... نہیں اٹھنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ تریاق اپنا کام

کر رہا تھا۔ شاہ گل نے بتایا وہ آٹھ بیہوش سے پہلے اٹھنے کی کوشش کر سکتی کیونکہ زہر اس کے اعصاب پر اثر انداز ہوا ہے۔

واقعی مشری کئی سال کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ اس کے بدن سے زہر کی خلائشیں نکال ہو گئی تھیں اور اب چہرہ کپاس کے پھول کی طرح زرد تھا۔ شاہ گل نے پوٹی سے تھوڑا سا سفوف نکال کر کٹوری میں ڈال دیا۔ پھر گل رخ سے مخاطب ہوا۔

”ایک بیہوش کے بعد یہ تریاق اسے بلا دینا۔ میرا خیال ہے مشری کل تک چلنے پھرنے کے قابل دوہائے گی۔“

مشری نے مذہم آواز میں کراہتے ہوئے بتایا ”وہ اتار بالا کی باتیں سننے کے لئے بانو کے کمرے میں آئی تھی مگر خلاف معمول بانو مسبری پر دروازہ نہیں اور اتار بالا آج حاضر نہ تھی۔ میں پلٹنے ہی والی تھی کہ قدموں کے قریب سرسراہٹ محسوس ہوئی پھر ایک شعلہ سا چمکا اور

چھوٹا سا سیاہ ناگ میرے پاؤں کو ڈس کر دروازے سے باہر رینگ رہا تھا۔ بے اختیار میری چیخ نکل گئی پھر یوں لگا جیسے کوئی تیز دھار خنجر میرے کلیجے کو کاٹ رہا تھا پھر میں کب گری؟ اس کا مجھے ہوش نہیں۔“

”پھر شاہ گل تمہارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر نمودار ہوا۔“

بیگم جہاں نے شاہ گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے گل گھر تلخ اور اتار بالا کو مشتری کی ستار داری کے لئے اسی کے کمرے میں چھوڑا اور پرتھال کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ زرینہ مشعل اٹھائے دن کے ساتھ ساتھ چل نہ رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر علیہ خاتم بیگم جہاں کسی گہری فکر میں ڈوب گئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر تھا وہ کسی خطرناک فیصلے پر غور کر رہی ہے۔

”تو آپ کا کیا خیال ہے ناگ میرے لئے چھوڑا گیا تھا؟“

پرتھال نے مدھم لہجے میں پوچھا۔ جس میں موت کا سا ابدی سکون تھا۔

”خیال؟“ بیگم کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”یہ خیال کی بات نہیں بانو!

حقیقت ہے، میرے علاوہ اور بھی کئی آنکھوں نے دیکھا ہے۔“

”اور آپ نے بیگم شیرازی کو اس الزام سے آگاہ بھی کر دیا؟“

”ایسا کرنا ضروری تھا۔“

اس نے زرینہ کو قریب بلایا۔ جو پرتھال کے لئے بستر بچھا رہی تھی۔ ”زری! صبح میں تجھے قصرِ لالہ سے دھکے دے کر نکلا دوں گی۔ تجھ پہ الزام یہ ہے تو بیگم شیرازی کے ساتھ مل کر جہارے خلاف سازش کر رہی ہے۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ علیہ خاتم حضور! کثیر اس شکستہ خی کا تقبوز بھی نہیں کر سکتی۔“

زرینہ یہ عجیب و غریب الزام سن کر کانپ اٹھی تھی۔ اس کے بدن پر لرزہ سا طاری تھا۔ پرتھال بھی حیرت زدہ نگاہوں سے بیگم کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک بیگم جہاں کا ہلکا سا تہقہہ بکھر گیا۔

”پھر شیرازی تیری دلجوئی کی خاطر یقیناً تجھے اپنے قصر میں ملازم رکھ لے گی۔ تو میرے خلاف۔۔۔ اپنی باتوں کا زہر پکا کر شیرازی کا اعتماد حاصل کر لے گی پھر تیرے لئے یہ راز معلوم کرنا کچھ مشکل نہ ہو گا کہ پرتھال کے کمرے میں کالا ناگ کس سیرین نے چھوڑا

تھا؟ سمجھ گئی ہے میں کیا چاہتی ہوں؟“

زربینہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”آپ نے تو میری جان ہی ہوا کر دی تھی۔ بیگم

حضور!“

”تجھے یہ کام بس دو تین دن کے اندر ہی پٹنا لیتا ہو گا پھر اس حسین ناگن کی گردن میری منگی میں ہوگی اور شیرازی کا قضیہ شاید ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ میں سلطان کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتی۔“

شیرازی کے خلاف یہ فیصلہ سناتے وقت بیگم جہاں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی جگمگا رہی تھی۔ اس نے زربینہ کو ٹکھل جانے کا اشارہ کیا اور مسہری پر گرتی ہوئی بولی۔

”بہت ہو چکی ہے اب اس کتیا کا انہام قریب نظر آتا ہے میں کئی ٹخروں کو اس کے سینے میں چوست ہوتے دیکھ رہی ہوں۔“

پر تھاں نے حیرت پاش نگاہوں سے بیگم جہاں کی طرف دیکھا اور چپ چاپ مسہری پہ چالیٹی۔ دوسرے لمحے جب انہی نے نظر اٹھایا تو اس کی بوڑھی محافظہ نیند کے زینے طے کر رہی تھی۔



9 تاریخی ورق

ہماکنٹھ

دریائے ننگ بھدرا کے جنوبی ساحل سے چند کوس پرے چینل میدان میں گوکنڈہ کے تاریخی کنڈر کی صدیوں سے لوگوں کے لئے ایک کہانی بنے ہوئے تھے کہتے ہیں اڑھائی ہزار سال پہلے شہر مگرو کی راجدھانی کی حیثیت سے مشہور تھا۔

1336ء میں جب راجہ ہری ہرنے جنوبی ہند میں اقتدار حاصل کیا تو ان ہی تاریخی کنڈروں پر اپنی سلطنت بجا پور کی راجدھانی وجے نگر کی بنیاد ڈالی جنگی اعتبار سے یہ جگہ اس لئے اہم تھی کہ اس کے تین اطراف میں اونچے اونچے پہاڑ تھے اور چوتھی سمت شمال میں دریائے ننگ بھدرا گویا ایک قدرتی خندق کا کام دے رہا تھا، وجے نگر کے ارد گرد ایک مضبوط اور چوڑی فصیل بنائی گئی تھی جو اپنی بلندی اور مضبوطی کی وجہ سے ہماکنٹھ کہلاتی تھی۔

ہری ہرنے کئی راجاؤں کو اپنا باغی دار بنایا تھا وہ اپنے خاندانی دیوتا "ویر ویکشا" کی پوجا کرتا تھا۔ اس کے جھنڈے پر جنگی سوار کی تصویر نقش تھی کیونکہ سوار کا نشان حکومت تھا۔ "رائے زایاں" کا خاندان اگرچہ دولت و شہرت میں سارے ہندوستان میں شہرت رکھتا تھا لیکن ایک صدی کے اندر ہی اندر وجہ نگر کی سیاسی اور فوجی عظمت کا آفتاب گہنا چکا تھا اور جب سے دورائے راج سنگھاسین پر بیٹھا تھا اس کی بد تدبیر، خشن پرستی اور عیاشی کی وجہ سے سلطنت کی بنیادیں آہستہ آہستہ کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ نگر کے ٹال کی طرف دکن میں سلطنت خداوار ہمیں کے نام سے ایک طاقتور اسلامی مملکت قائم تھی، جس کا حکمران سلطان فیروز شاہ ہمیں ”سکندر ثانی“ کے نام سے سارے ہندوستان میں شہرت رکھتا تھا۔ اُن دنوں دہلی کی مرکزی تعلق حکومت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا ہندوستان چھوٹی چھوٹی آزاد اور خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر راجہ دیورائے کی سیاسی دہشت نے ہر اہمارا اور اس نے دکن پر حملہ کر کے اپنے پہلو سے اس اسلامی سلطنت کا کاٹنا ہمیں کے لئے نکال دینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ نو لاکھ بہادر اُس کی پیادہ فوج میں تھے، پھر تیس ہزار منتخب سوار، بے انداز کماندار اور برق انداز بھراہ لے کر 801ھ مطابق 1449 میں وہ دکن کے سرحدی اضلاع مدگل اور رائے چور پر حملہ آور ہوا۔

سلطان فیروز شاہ حسن آباد گلبرگہ میں تھا۔ جب خبر پہنچی کہ دیورائے آگ اور خون کی ہولی کھیل رہا ہے دکن کی طرف بڑھا آتا ہے، سلطان نے فوراً لشکر سلطانی کے سہ سالار احمد خاں خانخاناں کو کاشمی منہاج کے ساتھ مقابلہ پر روانہ کیا کہ وہ بڑھتے ہوئے طوفان کو روکیں پھر ساغر برادر اور دولت آباد کے لشکر اکٹھے کر کے خود بھی دیورائے سے نپٹنے نکلا۔ خاں خانخاناں نے جاتے ہی دیورائے کے لشکر کا مقابلہ کرتا شروع کر دیا جب راجہ نے سلطان کے سیاہ پرچموں کو لہراتے دیکھا تو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اس کے بے شمار قیدی سلطانی لشکر کے ہاتھ لگے۔ جن کی رہائی کے لئے دیورائے نے پہلے دس لاکھ ہون پھر چھ لاکھ ہون سلطان کی نذر کئے۔ قیدیوں کی رہائی کی بات چیت امیر فضل اللہ کی معرفت ہوئی تھی اس لئے دیورائے نے پانچ لاکھ ہون امیر فضل اللہ کو الگ بھجوائے تھے۔ سلطان نے فواد خان بن صفدر خاں سیستانی کو سرحدی اضلاع کا گورنر مقرر کیا اور فتح کے پرچم اڑاتا گلبرگہ واپس آ گیا حالانکہ اس کی اصل منزل وہیں تھی مگر تھی لیکن اس نے معاہدہ صلح کو توڑنا پسند نہیں کیا۔

دیورائے نے ناکامی کا بدلہ لینے اور اپنی خفت مٹانے کے لئے نرسنگہ رائے والے کھنڈ کو اکٹایا کہ وہ ہزار پر تاخت کرے۔ یہ قوف نرسنگہ رائے دیورائے کی چال میں آ گیا۔ اس نے سند اور آئین کے حاکموں کی حمایت حاصل کی اور ہزار پر چڑھ دوڑا ابھر دیورائے خود بھی دکن پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ سلطان نے یہ صورتحال دیکھی۔ تو

دیورائے کو اس کی بدعہدی کا حرہ چکھاتے کے لئے گلبرگہ سے نکلا۔ اس نے امیر فضل اللہ شہرازی کو نرسنگہ رائے کی گوشالی کے لئے بھیجا اور خود بارہ ہزار سوار لے کر موسم برسات میں جب دریا طغیانی پر تھا اور یا تیرتا ہوا بچے مگر پہنچا۔

امیر فضل اللہ ن کھترلہ سے دو منزل آگے نرسنگہ رائے سے جنگ کا آغاز کیا۔ شجاعت خاں، ولادہ خاں، رستم خاں اور بہادر خاں ایسے امیر اور بہادر شہید ہوئے لیکن امیر نے فتح پائی، نرسنگہ رائے بھاگ کر کھترلہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ اس کا لڑکا کوئلہ رائے گرفتار ہوا۔ آخر نرسنگہ رائے نے چالیس ہاتھی، پانچ من سونا، پچاس من چاندی اور دیگر تحفے تحائف دے کر صلح کر لی اور سلطان کا مطلع و باجگزار رہنا قبول کیا۔

اگر دیورائے بھی قلعہ بند ہو کر لڑنے لگا آخر کافی سراج نے ایک ڈرامائی کارنامہ سر انجام دے کر دیورائے کے لڑکے کو قتل کر دیا۔ جس کے مرتے ہی راجہ کی ہمت ٹوٹ گئی اور اس نے ایک مرجہ پھر صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ سلطان نے اس شرط پر صلح قبول کی کہ دیورائے ہر سال خراج دینا منظور کرے اور جب ہم بلائیں بلائیں و حجت ہمارے پاس چلا آئے۔ مہاراج دیورائے نے یہ شرط قبول کر لی اور باجگزار بن کر اپنی جان چھڑائی۔

804ھ میں سلطان نے امیر تقی الدین محمد اور مولانا لطف اللہ سہروردی کو امیر تیمور صاحبزادوں کی بارگاہ میں بھیجا اور اپنی نیاز مندی کا اظہار کیا۔ امیر تیمور نے سلطان کی اس روش کو پسند کیا اور یہ نامہ لکھ بھیجا۔

”ہم تے دکن، گجرات اور مالوہ کی بادشاہی سعادت نشان فیروز شاہ کو عہدت کر کے تخت و چتر و جمیع لوازم سلطنت کی اجازت بخشی اور اسے اپنا فرزند خیر خواہ قرار دیا۔“

اس نامہ کے ساتھ امیر تیمور نے ایک شاہی چٹا، شمشیر اور سرسبز اور چار گھوڑے بھی سلطان کو بھیجے تھے فرمان تیموری کے بعد جنوبی ہند پر سلطان شاہ کی حکمت و فرمانروائی کا سکڑے رواں ہو گیا تھا اور کسی حکمران کو اس سے مجال انکار نہیں تھی۔

تیمور اعظم آمدگی کی طرح ہندوستان میں آیا اور بگولے کی مانند چلا گیا۔ اس کے گھوڑوں کے منانے ایسا بکے وسیع میدان پڑے تھے۔ جنوبی ہند کا میدان وہ سلطان فیروز شاہ کے لئے چھوڑ گیا تھا۔

دیورائے جانتا تھا۔ سلطان سے ہر تابی کا مطلب تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں

وجیا نگر کے علاوہ اس نے تلنگانہ اور گوڑوانہ کی ریاستیں بھی ہار کے رکھ دی تھیں اس کے سیاہ پرچم پورے جنوبی ہند پر لہرا رہے تھے اس کے باوجود راجہ چار سال سے خاموش نہیں بیٹھا تھا بلکہ چپکے ہی چپکے اپنی طاقت میں اضافہ کرتا رہا۔ اس نے ایک لشکر جہاز تیار کیا۔ دکن کی اطاعت کا جوا اتار پھینکا، چوتھے سال خراج کی رقم روک لی پھر اس کے چھوٹے چھوٹے لیرے دستے دکن کی سرحدوں پر لوٹ مار کرنے لگے۔ ہوا کا رخ بدلنے لگا، سلطان نے فیروز آباد کا صوبہ شہزادہ حسن خان کو یاگیر میں دے دیا اور مظہر بن ہو گیا وہ جانتا تھا۔ نوجوان شہزادہ دیورائے سے پنپنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن دیورائے تمام معاہدے توڑ کر مدگل پر حملہ آور ہوا۔ پرتھوی کے حسن کا شطہ خرمن دل کے ساتھ اس کی متاع فکر دشواری کو بھی پھونکا ہوا چلا گیا اور اس نے ایک مرتبہ پھر سلطنت مجبھی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر دو گولیاں ریاستوں پر قہر و بلا کی بجلیاں چمکنے۔ کڑکنے لگیں۔

ایک مرتبہ پھر سور کے نشانوں والے زرد جھنڈے اور سیاہ پرچم حرکت میں آ گئے۔ دیورائے نے کئی مرتبہ دھندہ خلافتوں کی تھیں۔ کئی بار معاہدے توڑے تھے لیکن اس مرتبہ اس نے مملکت دکن کی ایک نوجوان لڑکی کی عزت بھی آڑنا چاہی تھی۔ اس کی دھیانہ حرکت اس کے لئے سوت کا پیغام بن گئی تھی، سلطان اس مرتبہ صلح کرنے نہیں آئے تھے محض اس لئے سے اینٹ بجا دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہوا تھا۔ اس نے قسم کھالی تھی، وہ دیورائے کو گستاخی کی ایسا عبرت ناک سزا دے گا جسے مستقبل کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے۔

ویرو پکشا کی دھرتی

806ھ مطابق 1453ء کے موسمِ زرخیز کا جاڑا شروع ہو چکا تھا جب سلطان نے فیروز آباد سے پڑاؤ اٹھایا اور بیجا نگر کی طرف کوچ کیا۔

دریائے تنگ بھدر بارہ سات کے پانیوں کو اپنے کناروں میں سیٹھے دیوانہ وار بہہ رہا تھا لیکن سلطانی لشکروں کو دریا عبور کرتے نہیں کسی وقت کا سامنا نہیں ہوا اور جنوبی گھاٹ پر دلی عہد کے سوار پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے پھر پیدل فوج کے لئے کشتیوں کا بیڑہ بھی کنارے آ لگا تھا۔ تباہ خان اور کوسل رائے کشتیاں ساتھ لے کر آئے تھے، کوسل رائے دریائی بہوں میں ماہر تھا۔ اور یہ تربیت اس نے اپنے باپ نرسنگھ رائے عمار سے حاصل کی تھی جو کھنڈر کی

لڑائی کے بعد سلطان کا مطیع و فرمانبردار بن گیا تھا۔

غروب آفتاب سے پہلے خانخاناں اور ارگو خان کے لشکر بھی دریا پر آ پہنچے، لشکر پار اتار دیے گئے لیکن خانخاناں اور ارگو خان چند سواروں کے ہمراہ سلطان کے استقبال کے لئے شمالی کنارے ہی پر ٹھہر گئے تھے۔

نیا لے اندھیروں میں دوپہر۔۔۔ فیروز آباد کے راستے پر لشکر سلطانی کے خاص نشانات لہراتے نظر آ رہے تھے مگر ابھی تک شہزادہ حسن کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جسے بہر طور پر سلطان کی پیشروائی کے لئے اس کنارے پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ ارگو خان کا خیال تھا۔ ”ممکن ہے، شہزادہ فیروز آباد کے محلوں ہی میں الجھ کر رہ گیا ہو۔ میں نے اس کے چہرے پر دیوانگی کے آثار دیکھے تھے جو یقیناً اس کی نئی محبت کی غمازی کرتے ہیں۔“

”کیا کہتے ہو۔۔۔ وہ امیر شیرازی کا داماد ہے۔“ خانخاناں نے اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو وہ دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتا؟“ ارگو خان کے لہجے میں طنز تھی۔

”اچھا تم یہاں تک سوچ رہے ہو؟“

”میرے اندازے بہت کم غلط ثابت ہوتے ہیں۔“

”لیکن وہ کون ہو سکتی ہے۔“

”غیر اخیال ہے۔۔۔ پر حال بھی یہ قیامت ڈھا سکتی ہے۔ اگر روٹی بیک اس کے ہمراہ نہ ہوتا تو میں سمجھتا یہ خطرہ ٹل بھی سکتا ہے لیکن اب نہیں۔۔۔“ پھر ارگو خان کا ہتھکڑیاں بلند ہوا۔

”احمد خان! یقین رکھو سنار کی لڑکی شہزادے کے دل پر ہتھوڑی کی ضرب لگا چکی ہے ورنہ وہ دربار میں اس بیباکی سے گفتگو نہ کرتی۔ کیا تمہاری شہزادیوں نے بھی اس طرح سلطان سے باتیں کی ہیں؟“

”پھر تو مجھے امیر شیرازی کے ساتھ پوری ہمدردی ہے، حسن خان لا ابالی تو ہے، ضرور نگاہ کا تیر کا بیٹھا ہو گا۔“

ابھی خانخاناں نے اپنا غصہ بھی کھل نہیں کیا تھا کہ ان کی نگاہیں شرقی ٹیلوں کی طرف اٹھیں۔ چوسوار غبار کا دامن چیرتے ہوئے گھاٹ کی طرف بڑھے۔ ان میں شہزادہ حسن سے آگے تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے محافظ سواروں کے ہمراہ ان کے سامنے

کھڑا تھا۔ اس نے خانخاناں سے مخاطب ہو کر کہا۔

”چچا حضور! مجھے افسوس ہے میں آپ کا استقبال نہ کر سکا واصل مجھے ایک ضروری کام کے لئے فیروز آباد میں رُک جانا پڑا مگر شکر ہے سلطان معظم کی تشریف آوری سے پہلے پہنچ گیا ہوں۔“

ارگو خان اور خانخاناں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

”جان عالم! مجھے آپ کی قسمت پر رشک آتا ہے۔“

ارگو خان کے بھدے لبوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

”رشک؟ آخر کیوں؟“

”قدرت نے آپ کو ایک حسین مہمان کی خدمت کا شرف بخشا ہے۔ کیا یہ واقعہ قابل

رشک نہیں؟ دیوارائے کا انتخاب غلط نہیں تھا۔“

”بہر حال میں ایک فرض ادا کر رہا ہوں۔“

لیکن صاف ظاہر تھا۔ ”فرض کی ادا ہو گئی“ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی گردن شرم سے

جھک گئی تھی۔ اگر اس کا چچا قریب نہ ہوتا تو ممکن ہے اس نے ارگو خان کی بات کا جواب

کسی دوسرے طریق سے دیا ہوتا لیکن وہ اپنے باپ ہی کی طرح اپنے چچا کی عزت کرتا تھا۔

عائبا احمد خان بھی اپنے سامنے اسے شرمسار ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بات کا

ربط بدل کر اڑتی ہوئی دھول کی طرف اشارہ کیا۔

”سلطان معظم کی سوازی آ بیچی ہے۔ رستم! تم مشطوں کو آگ دکھا دو، پھر شہزادہ کی

طرف بجائے ہو۔“ جان عالم! سلطان معظم کی پیشوائی کا فرض آپ ہی ادا کریں گے، آپ

کا لشکر سب سے پہلے گھاٹ پر پہنچا تھا پھر یہ علاقہ آپ ہی کی جاگیر ہے۔“

”لیکن آپ کی موجودگی میں۔“

”میری موجودگی حق تلفی نہیں چاہتی۔“

رستم نے مشعلیں روشن کر دی تھیں جن کی روشنی میں دریا کا گلیات چمک اٹھا تھا ان

مشطوں کو دیکھ کر آنے والے لشکر نے اپنا رخ متعین کر لیا۔

جب لشکر ایک فرسخ کے فاصلہ پر پہنچا تو دستور کے مطابق شہزادہ حسن گھوڑے سے

اڑا پھر خانخاناں اور ارگو خان کی معیت میں سلطان کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھا جو اپنے

کوئل گھوڑے پر سوار تھا۔

سلطان کے رکتے ہی لشکر رک گیا۔ سب سے پہلے ہشیر عین الملک اور بیدار نظام الملک گھوڑوں سے کود کر نیچے اترے اور سلطان کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

شام کے ٹیالے اندھیروں میں ہاتھی سیاہ چٹانوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ مشطوں کو دیکھ کر سردار ہاتھی ”فخرا“ زور سے چٹکھاڑا اور گھاٹ کی خاموش فضا تھر تھرا اٹھی۔ سلطان گھوڑے سے اتر آیا تھا۔ خانخاناں اور ارگو خان کو دیکھ کر مسکرایا، شہزادہ حسن نے پوچھا۔

”کیا سلطان عالی! اسی وقت دریا عبور کرنا چاہتے ہیں؟“

”خیریت باشد جان عالم! کہیں دریا میں طغیانی تو نہیں آگئی؟“

”نہیں تو۔۔۔ پانی حسب معمول بہہ رہا ہے۔“

”پھر۔۔۔“

”میرا خیال تھا۔ دریا صبح بھی عبور کیا جاسکتا ہے۔“

”نہیں جان پدرا ہم آرام کرنے نہیں ٹکے۔ ابھی دریا عبور کریں گے اور سفر رات بھر جاری رہے گا۔ صبح شوالے کے پہلے گجر کے وقت ہم دبے نگر کے دروازے پر دستک دینا چاہتے ہیں۔“

سلطان کی زبان سے یہ فقرے سن کر ارگو خان اور خانخاناں بھی حیران رہ گئے وہ جانتے تھے۔ سلطان ہم پسند ہے اور جب دشمن پر چڑھائی کرتا ہے تو اسے سوچے اور سمجھنے کی مہلت بھی نہیں دیتا لیکن ساری رات کا سفر کیا سپاہیوں کو غلہ حال نہیں کر دے گا؟ حملہ سے قبل آرام ضروری تھا لیکن سلطان کی لغت میں شاید آرام کا لفظ ہی نہیں تھا۔ اس نے بتایا۔

”ایک رات کی کوفت سپاہی کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی پھر شہزادہ حسن کی سپاہ تازہ دم ہو چکی ہے۔ قباچہ خان اور کوسل رائے کے دستوں نے آرام کر لیا ہو گا۔ حملہ کا آغاز جس ہی کرے گا۔“

سلطان کا فیصلہ اٹل تھا۔ اسی وقت لشکر کو دریا پار کرنے کا حکم مل گیا۔ ہاتھی اور گھوڑے پلایاب حصہ کی طرف ہانک دیئے گئے۔ خود سلطان شہزادہ حسن، خانخاناں، ارگو خان، ہشیر اور بیدار کے ساتھ کشتی کے ذریعے جنوبی گھاٹ پر اتر گیا۔ فواد خان سیستانی، قباچہ خان، کوسل رائے اور امیر فضل اللہ کے بیٹے اور داماد غیشوائی کے لئے موجود تھے دوسرے کنارے

پر بھی لاتعداد مشعلیں جگمگ رہی تھیں۔ جن کے لرزاتے ہوئے گیس لہروں پر مہر خراہ ہے تھے یوں مظلوم ہوتا تھا جیسے تنگ بھدرا کے کنارے چراغاں کا میلہ لگ رہا ہو۔

ابھی لشکرِ سلطانی کے آخری سواروں نے اپنے گھوڑے دریا میں نہیں ڈالے تھے کہ امیر فضل اللہ شیرازی کا لشکر بھی پہنچ گیا۔ دوسرے کنارے پر اترتے ہی سلطان نے گھوڑا طلب کیا اور لشکروں کو روانگی کا حکم سنایا۔ کوچ کی ترتیب دی تھی۔ کوسل رائے اور قباچہ خان کے آگے شہزادہ حسن اور فولاد خان کے سوار گھوڑے دوڑاتے پڑے جا رہے تھے۔

رات اپنے آشیانہِ فلکی سے اتر آئی تھی اور آغازِ سرما کا جاڑا اپنے سرد پر پھیلا رہا تھا۔ مشعلیں جل کر دی گئی تھیں اور رات کے خشک اندھیروں میں ”سوت کے لشکر“ وجے مگر کی طرف رواں تھے۔ دشمن کی سرزمین اُن کے گھوڑوں کے سوں تلے جھڑک رہی تھی۔ راجہ ہری ہر کا دیس ”ویرد پکشا“ کی پوتر دھرتی جسے دیورائے کی سرستوں نے آلودہ کر دیا تھا۔ وہ ملک جس پر کبھی مہاشنو کے ہاتھ کا سایہ تھا آج اپرادھ کی بھیانک تاریکیوں میں لغوف رازان اور کنس کا دیس بن گیا تھا۔ جس کے راج رتواس میں مقدس آشرم کی دیوراسیاں اور دیس کی سدر کیناؤں کی عزت لٹی تھی۔ جہاں اونچی ذات کا خاندان ”رائے راپاں“ خود کو عام ہندوؤں سے بلند و بالا سمجھ کر ہر ظلم اور ہر پاپ کو جائز سمجھتا تھا۔ دیورائے مہاراجہ تھا۔ کرناٹک کا ان داتا اور اسے یہ ادھر کا رہا کہ وہ عام ہندوؤں سے نفرت بھی کرے اور اُن پر حکومت بھی۔۔۔ حالانکہ ہری ہرنے اپنی پر جا کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کیا تھا لیکن ہری ہر کو سوردگبائش ہوئے زمانہ بیت چکا تھا اور اب کرناٹک کے سرور دیورائے کی تلوار چمک رہی تھی۔ سلطان اس سرزمین میں داخل ہوتے ہی آرام کا نام بھولی گیا تھا وہ صبح شوالے کے پہلے گجر کے ساتھ وجے مگر کا دروازہ اپنی تلوار کے دست سے کھٹکھٹاتا چاہتا تھا جس کے کواڑوں کے پیچھے دیورائے دارو کے نشہ میں مدھوش پڑا تھا۔

رات کے تاریک اور پُر ہول سنائے میں پتھریلی زمین پر گھوڑوں کے قدموں کی آواز دُور دُور تک گونج رہی تھی لیکن دیورائے کے بہرے کان شاید ان آوازوں کو نہیں سن سکتے تھے۔

دو کردار

لکھنوی۔ اگر کوئی طاقت ہے تو وہ یقیناً دیورائے کے خلاف دوسرا پیکار ہو چکی تھی

کیونکہ جب بیجا نگر کے مہاشوالہ میں صبح کا پہلا گرج بجا اور پردہت بجاری تے مہاشو کے نام کا سکھ پھونکا۔ ٹھیک اس وقت قلعہ کی فصیل سے صرف نصف گول پرے پھنی لشکر صف آرا ہو چکے تھے جن کی قیادت بہ نفس نہیں سلطان فیروز شاہ پھنی سکندر ثانی کر رہا تھا۔

سلطان نے رات بھر سز جادی رکھا تھا اور صبح کا ذب کے نمودار ہونے سے پہلے ہی منزل مقصود پر پہنچ کر لشکروں کو فصیل کے ارد گرد پھیلا دیا تھا اگرچہ وہ سامنے ہی سے حملہ کرنا اور فصیل کا ہواڑہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہتا تھا پھر بھی اُس نے قباچہ خان اور کول رائے کے دستوں کو اونچے نیچے پھاڑوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ رہتے کا حکم دیا۔ مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اگر پھنی لشکروں کو بیجا نگر میں داخل ہونے کے بعد پسپائی اختیار کرنا پڑے تو یہ دستے تعاقب کرنے والوں کو آتشیں تیروں کی بازہ پر رکھ لیں۔

حملہ کرتے وقت سلطان جنگ کے دونوں پہلو سامنے رکھتا تھا اور فوجوں کو ہمیشہ اس طرح ترتیب دیتا تھا کہ پسپائی کی صورت میں بھی بہت کم نقصان ہو اور دبا ہی کا سارا خمیازہ دشمن کو بھگتنا پڑے۔

دیورائے جب رات مہانتری اور راجگورو کو رخصت کر کے اپنے کمرۂ خواب میں داخل ہوا تھا تو بیجا نگر کے خبر رساؤں سے یہ اطلاع سن کر حیران رہ گیا تھا کہ سلطان دکن نے خود جنگ کا جھنڈا باندھا ہے اور فیروز آباد سے اپنے لشکروں سمیت دریائے نگ بھدرا کی جانب بڑھ رہا ہے۔ جاسوسوں کے قیاس کے مطابق پھنی لشکر رات کے اندھیرے میں دریا عبید کرنے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ دریا میں ابھی تک طغیانی تھی اور لہریں مگر مچھوں کی طرح منہ کھولے بڑھ رہی تھیں۔ ایسی حالت میں دریا عبور کرنا سواڑوں اور پیادوں کی غرقابی کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن وہ بھول گئے تھے کھڑکے کے حکمران زنگے رائے کا پناہ کشیوں کا بیڑا تیار کرنے میں حیرت انگیز مہارت رکھتا اور اُسے حریف کی عتابی نگاہوں سے چھپانے کا فن جانتا ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ بیجا نگر کے جاسوس کشیشوں کے اس بیڑہ کو دیکھ ہی نہیں سکے تھے جسے کول رائے نے دریا کے کنارے کنارے جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں چھپا رکھا تھا۔ وہ تو سلطانی لشکروں کے ہر اول دستوں ہی کو دیکھ کر اطلاع دینے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

دیورائے نے اتنی عجلت کی ضرورت تھی کہ اسے پاس پڑے ہوئے دستوں کو بیجا نگر کے

تکدہ میں اکٹھا کر لیا تھا جس کا حصار ناقابل شکست تسلیم کیا جاتا تھا۔ دیوارائے لکی آدمی قوت بھی حصار تھا جس کے ارد گرد پہاڑی ٹیلوں کی قدرتی دیوار نے اُسے اور بھی مضبوط و مستحکم کر دیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا جب تک یہ قدرتی فصیل قائم ہے۔ تیر اندازوں کی موجودگی میں خندق کی طرف بڑھنے والا ہر لشکر اپنی موت کو آواز دے گا اور وجہ نگر کے تیر انداز نشانہ باندھنے میں دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔

دیوارائے کو یہ بھی یقین تھا سلطان شہر میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اول تو کوہستانی حصار کو کافی بڑا مشکل مرحلہ ہے کیونکہ اس کے آس پاس دس ہزار بہترین تیر انداز چھپے بیٹھے تھے۔ دوسرے اگر وہ پہاڑی ٹیلوں سے بچ کر نکل بھی آئے تو فصیل کے ارد گرد گہری اور چوڑی خندق پھنی سپاہیوں کے لئے موت کی کھائی بن جائے گی۔ تیسرے تکدہ کی فصیل سے نکلنا سنگ و آہن سے سر پھوڑنے والی بات تھی۔ پھر ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری فصیل دشمن کو روکنے کے لئے کافی تھی۔ وجہ نگر فصیلوں کا شہر تھا۔ اس لئے وہ کافی مطمئن تھا اور یہ اطمینان کچھ بے وجہ بھی نہیں تھا۔

سلطان نے چہار شنبہ کو کوچ کیا تھا اور ایک عام اندازے کے مطابق وہ پنجشنبہ کی شام سے پہلے بھاگرمیں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

دیوارائے کے چہرے کا زخم جو ابے شمشیر خان کے خونی ہاتھ کی یاد دلاتا رہتا تھا اب مندمل ہو چکا تھا اور نئی جنگ کی تیاریوں میں وہ گھاٹ کی لڑائی کا صدمہ بھی بھول جا رہا تھا۔ اُس کے کمرۂ خاص میں دو حسین و جمیل نرنگیاں اور شراب سے بھری ہوئی صراحیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ مستقبل کے خوف و خطر سے بے نیاز اور بے پروا ہو چکا ہے اور جنگ کو بہادرروں کا ایک کھیل سمجھتا ہے۔

دیوارائے میں اگر تکبر، حد سے بڑھی ہوئی نخوت اور اپنے ہی دلیں کے باشندوں سے نفرت کرنے کے عیب نہ ہوتے اور حسن و شراب نے اس کی ذہنی قوتوں کو سخ نہ کر دیا ہوتا تو بلاشبہ وہ ایک بہادر اور جنگجو سپاہی تھا لیکن مصیبت تو یہ تھی وہ اپنے آپ کو اُن ہندوؤں سے فائق و برتر سمجھتا تھا جن کی وقار داریاں تخت کے پایوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں جو معاشی اعتبار سے حقیر و کمتر ہونے کے باوجود راجپوتی جوہر رکھتے تھے اور میدان جنگ میں کٹ مرنا باعث عزت سمجھتے تھے لیکن اُن کی تمام ہمدردیاں صرف وجہ نگر کے لئے تھیں۔

دیورائے کی ذات کا معاملہ ہوتا تو ان کی تلواریں کبھی نیام سے باہر نہ آتیں۔ وہ دیورائے سے صرف اسی حد تک تعلق رکھتے تھے کہ وہ اُن کا مہاراج ہے۔ بس۔۔۔ مگر اس وقت مہاراجہ نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ایک ذاتی مقدمے کو قومی اور ملکی رنگ دینے کر کرنا لگی۔ سوریوں کو سلطان فیروز شاہ کے خلاف آمادۂ جنگ کر لیا تھا جسے وہ مخالفت کے باوجود پسند کرتے تھے۔ سلطان کا کردار دیورائے کے مقابلہ میں کسی دیوتا کا روپ ہی معلوم ہوتا تھا جو کاشی کی یاترا کو جانے والے بیجا نگر کے ہندوؤں کے لئے بھی آسمانیاں فراہم کرتا اور ان کے قیام و طعام پر نظر رکھتا تھا۔ دیورائے کے نفرت انگیز و پاکھیان کے باوجود جو اُس نے راج دربار میں دیا تھا کئی لوگ ایسے تھے جو اپنے دلوں سے فیروز شاہ کی خوبی کروار کو محو نہ کر سکے۔ وہ بے وسبہ الفاظ میں کہا کرتے تھے۔ ”کاش دیورائے بھی فیروز شاہ کی طرح بلند اخلاق ہوتا۔“

یقیناً وہ حکمران احق ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اُن کے اخلاق و کردار کے سائے رعایا پر نہیں پڑتے۔

جب سے لوگوں نے یہ سنا تھا۔ سلطان نے اپنی مملکت کی ایک ہندو لڑکی پر تعالٰی کی بے عزتی کا بدلہ چکانے کے لئے بیجا نگر کا رخ کیا ہے۔ وہ عجیب سے جذبات میں بہہ نکلے تھے۔ اسی ایک واقعہ سے دونوں حکمرانوں کے کروار آئینے کی مانند روشن ہو جاتے تھے۔

ایک حُسن کا ڈاکو تھا جو اپنے ہی ویس اور اپنے ہی دھرم کی کنیا کی عزت لوٹتا تھا۔ دوسرا عزت کا محافظ جو ایک غیر مسلم لڑکی کی خاطر تلواریں کھینچ کر میدان میں آیا تھا۔ اے بھگوان۔۔۔ اب بیجا نگر کی دھرتی پر کیا ہونے والا ہے؟ کیا فیروز شاہ کی تلواریں دیورائے کا خون چاٹنے بغیر نیام میں جانے والی ہے؟ اس کا جواب نفی میں تھا۔

آدھی رات تک دیورائے دارو پیتا اور رنگیوں کے سندر مکھڑوں سے کھیلا رہا۔ ان میں سے ایک رنگی وہی تھی جو دیورائے کے ساتھ مدگل میں جنگ کا نظارہ دیکھ چکی تھی اور پانسہ لٹتے دیکھ کر تھاک نکلتے میں کامیاب رہی تھی اس نے شراب کا آخری پیالہ بھرا اور دیوہائے کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

”مہاراج! میں نے سنا ہے دکن کا سلطان جنگ کے لئے آ رہا ہے کیا یہ خبر۔۔۔“

”سلطان..... سلطان.....“ وہ نفرت و تحارت کی چنگاریاں اڑاتے ہوئے ذرا سا اچھل گیا۔ ”تم سب لوگ اس سے ڈرتے ہو۔“
 رنگی سہم کر پرے ہٹ گئی۔ وہ جانتی تھی جوش غضب میں وہ شراب کا پیالہ اسی کے منہ پر دے مارے گا۔

”فیروز شاہ..... ہم جیسا ایک راجہ ہے..... جس کی..... موت..... اُسے بچانگر کی طرف ہانک لائی ہے۔“

دیورائے نے یہ فقرہ رک رک کر ادا کیا۔ شراب اُس کے حواس پر غالب آتی جا رہی تھی اور وہ بیہوش ہونے سے پہلے کسی بڑولی کا اٹھار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غصہ کی وجہ سے وہ ایک طرف لڑھک گیا اور دوسرے ہی لمحے رنگی نے محسوس کیا وہ بیہوش ہو چکا ہے۔ رنگی اپنا کان اُس کے منہ کے قریب لے گئی وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”یہ..... تھال..... تو..... کہاں ہے؟“

دونوں رنگیوں نے ہمہایت آہستگی کے ساتھ اُسے مسہری پر ڈال دیا پھر دبے پاؤں باہر نکل گئیں راجہ رنواس پر گہری براہ راست خاموشیاں بٹاری تھیں۔

بیجانگر پر حملہ

دیورائے بے سدھ پڑا تھا۔

بیجانگر کے شوالوں اور مندروں میں زور زور سے سنگ پھونکنے جا رہے تھے جن کی آواز صبح کے اُجاہلوں میں خطروں کا اعلان کر رہی تھی۔ شرق کے اندھیرے عاروں کے خاشبوں پر سرخ روشنی تھر تھرا رہی تھی اور کئی لوگ بستروں ہی میں وکے پڑے تھے کہ سکنوں کی ہیبت ناک آواز اُن کے کانوں سے ٹکرانی اور وہ ہز بڑا کر اُٹھ بیٹھے۔

راجہ رنواس میں ایک قیامت سی مچی ہوئی تھی۔ دیوایاں، برتکیاں اور رانیان راج محل کی کھڑکیوں اور جھروکوں سے وحشت زدہ نظروں کے ساتھ فیصل کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جہاں ہزاروں تیر انداز اندھا دھند تیر رہے تھے۔

سلطانی لشکروں نے قلعہ پر دھوا بول دیا تھا لیکن بیجانگر کا محافظ دارو کے نشے میں مہوش پڑا تھا۔

راجہ کا دل چنر دکھا دکھا کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی
پرچھائیاں کانپ رہی تھیں۔ وہ خود مہاراج کو خطرے سے آگاہ کرنے آئی تھی، کوئی دہی اتنی
صبح مالک کو جگانے کی گستاخی نہیں کر سکتی تھی ورنہ اس کا سرتن سے جدا کر دیا جاتا۔
چندر کھانے آتے ہی مدھوش باپ کو کندھوں سے جھنجھوڑ دیا۔

”مہاراج! اٹھئے دشمن نے حملہ کر دیا ہے لڑائی شروع ہو چکی ہے۔ اٹھئے مہاراج ہوش
میں آئیے۔“

دیورائے نے ایک لمبی ”اوں۔۔۔“ کے ساتھ کروٹ بدل لی۔
”ہاجی! اٹھئے بھگوان کے لئے ہوش کیجئے۔ سلطان نے حملہ کر دیا۔ سلطان نے حملہ
کر دیا۔“

”سلطان نے حملہ کر دیا۔“

راج محل کے ہر گوشہ میں یہی متوحش آواز گونج رہی تھی، چندر کھانے ایک مرتبہ پھر
باپ کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”ہاجی! سلطان نے حملہ کر دیا۔ لڑائی شروع ہو گئی۔“

رات دیورائے نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پی لی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے
آنکھیں کھول دیں اور قہر آلود نگاہوں سے جگانے والے کو دیکھا ساتھ ہی اس کا ہاتھ کھوار
کے قبضے کی طرف بڑھا جو دیوار پر آویزاں تھی۔

رات بھر پینے کے بعد جب ابھی خار بھی نہیں ٹوٹا تھا اتنی صبح بیدار کرنے والی
بد نصیب دہی کو ضرور اس کی موت ہی یہاں گھیر لائی ہے۔

”مہاراج! میں چندر کھا ہوں۔ اٹھئے! سلطان نے حملہ کر دیا۔“

”چندر کھا۔۔۔ سلطان۔۔۔ حملہ۔۔۔“

دیورائے کے ہونٹوں کو جو لے ہو لے جھنسن ہوئی۔

مندروں اور شوالوں میں ابھی تک سنگھ چلائے جا رہے تھے، جن کی روح فرسا
بیٹا تک آوازیں راج محل کے ہر کمرے خاص میں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ دیورائے نے
یہ آوازیں سنیں۔ آنکھیں پھاڑ کر چندر کھا کی طرف دیکھا جو مسمری کے پاس کبڑی خوف
سے کانپ رہی تھی۔

"چند رکھاتم....."

"ہاں چاچی! آپ دارو پی کر سو رہے ہیں اور دشمن فسیل کا دروازہ توڑ کر شہر میں گھس آیا ہے۔"

"کیا کہا تم نے....."

دیورائے دشمنی شیر کی طرح دھاڑا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"مہاراج! جنگ اس وقت شیر کی فسیل کے اندر ہو رہی ہے سلطان کی فوجیں ہماری توقع کے خلاف جلدی پہنچ گئیں اور آتے ہی حملہ کر دیا۔ راجپوتوں نے ہڈت گورکھ ناتھ اور سیناپتی درجن آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

دیورائے نے یہ باتیں اس طرح سنیں جیسے وہ سپنے کی حالت میں کھڑا ہو۔ سلطان نے بیجا نگر پہنچے ہی لشکروں کو ترتیب سے پھیلا دیا تھا۔ جنگ کے خلوط کیا ہوں گے اور لشکر کس ترتیب سے حملہ کریں گے؟

یہ سب کچھ اُس کے رستے ہی میں سوچ لیا تھا۔ وہ پہلے بھی بیجا نگر آ چکا تھا اور اس قدر قوی حصار سے غافل نہیں تھا۔ جس نے جنوبی ہند کے اس قلعہ کو ناقابلِ تغیر، ناقابلِ شکست بنا دیا تھا۔ مخبروں نے یہ اطلاع بھی دے دی تھی کہ دکن ہزار تیر انداز قلعہ کے باہر پہاڑی گھاٹیوں میں موت کے دامن بچھائے بیٹھے ہیں۔ سلطان اس خاموشی کے ساتھ ان کے سروں پر پہنچ گیا کہ انہیں منجھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ سب سے پہلے حسن خان کے لشکر نے حملہ کیا۔ فلولاد خان اور شمشیر خان موت کے فرشتوں کی طرح پہاڑی گھاٹیوں میں موڑ چہ ہند سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں نیزوں پر رکھ لیا۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ کرناگی سوار بھی لشکروں کو بڑھتے دیکھ کر قلعہ کا دروازہ کھول کر گھوڑے دوڑاتے اور حریف کی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر میدان میں نکل آئے۔ سیناپتی درجن کا خیال تھا۔ سلطانی لشکروں نے تو ابھی دریا بھی پار نہیں کیا ہو گا۔ حملہ آور شہزادہ حسن کی وہی فوج ہوگی۔ جس کے ساتھ گھات پر معرکہ ہو چکا تھا۔ سلطان نے بھی دشمن کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لئے جان بوجھ کر شہزادہ حسن ہی کی فوج کو آگے بڑھایا تھا۔ دراصل سورج نکلتے ہی جب سلطان کے خاص پرچم اور لشکر پہچان لئے جاتے وہ فسیل کا دروازہ توڑ کر شہر میں داخل ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کی یہ بال کا سیلاب وہی سچ کے تلخے اندھروں میں اپنے تیر اندازوں کو پسپا ہوتے دیکھ کر

سینا پتی یہ سمجھا کہ تیر انداز بمبئی فوج کو اس میدان میں گھیر کر مارنا چاہتے ہیں۔ جو پہاڑی ٹیلوں اور قلعہ کی فصیل کے درمیان واقع تھا۔ اس لئے اس نے قلعہ کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا اور کرناٹکی سوار بھالے لہراتے باہر نکلے۔

لیکن سینا پتی کو تھوڑی دیر میں اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ بمبئی سپاہیوں کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ لڑنے کا نتیجہ ہمیشہ جانی کی صورت میں نمودار ہوتا تھا۔ شہزادہ حسن کی فوج کرناٹکی تیر اندازوں کو کافی اور دھکیلاتی ہوئی کھلے میدان میں لے آئی۔ ادھر سے ارگو خان اور خانخاناں کے لشکر آ کے بڑھے میدان میں خون ریز معرکہ چھڑ گیا اور دونوں طرف کے بہادر داد شجاعت دینے لگے۔

جونہی صبح کی روشنی میں کرناٹکی سپاہیوں نے سلطان کے سپاہ پر چوں کو لہراتے اور بمبئی لشکروں کو تین اطراف سے فصیل کی طرف بڑھتے دیکھا ان کے حوصلے پست ہو گئے کھلے میدان میں لڑنے کی بجائے وردھن نے قلعہ بند ہو جانے کو ترجیح دی اور ادھر بمبئی سواروں نے ”یا نصیر“ اور ”یا علی“ کے نعرے لگا کر اس شدت کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ قلعہ کی طرف بھاگا۔

اب بمبئی سواروں کو روکنے والا کون تھا؟ وجیا نگر کے سپاہی کچھ ایسے بدحواس ہو کر بھاگے کہ فصیل کا دروازہ بند کرنا بھول گئے دیے بھی پٹ بھینڑنے کا وقت گزر چکا تھا بمبئی سوار کرناٹکی بہادروں کو مارتے کانٹے دروازہ تک پہنچ چکے تھے۔

شہزادہ حسن، فواد خان، شمشیر خان اور ارگو خان اپنے سواروں کے ہمراہ اندر گھس گئے تھے، سلطان نے دلی عہد کو شہر میں داخل ہوتے دیکھا۔ تو اس نے خانخاناں کو فصیل سے تیر برسائے والے دشمنوں سے بچنے کا حکم دے کر میر فضل اللہ شیرازی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑا دوڑانا ہوا دروازے پر پہنچ گیا۔

دروازہ پر گھمسان کا رن پڑا تھا۔ کرناٹکیوں نے دشمن کو روکنے کے لئے سر کٹا دیے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شہزادہ حسن ایک بھرے ہوئے شیر کی طرح حملے کر رہا تھا۔ بمبئی سواروں کے ساتھ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جب سلطان اور امیر فضل اللہ اپنے جانباڑوں کے ہمراہ قلعہ کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت شہزادہ حسن بچا نگر کے بازار میں لڑ رہا تھا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی بھی سوار بیچانگر میں داخل ہو گئے تھے اور کرناٹک کا ناقابلِ تسخیر، ناقابلِ شکست شہر دکنی گھوڑوں کے پاؤں تلے کانپ رہا تھا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ وجیانگر کی سپاہ ہار گئی تھی یا کرناٹکی بہادروں کے حوصلے پست ہو گئے تھے بیچانگر کے قلعہ میں اس وقت بھی پچاس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادہ سپاہی لڑنے یا کٹ مرنے کے لئے تیار تھے۔ بازاروں اور قلعہ کی فصیل کے آس پاس جنگ جاری تھی۔ کرناٹکی سوار ماڈن نے سلطان فیروز شاہ کو جنگی لباس پہنے فصیل کے اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور موت کی ایک ٹھنڈی لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتے ہوئے محسوس کی تھی۔

وہ حیران تھے۔ دیورائے کہاں ہے؟ اس وقت جب اسے میدانِ جنگ میں اپنی فوج کے درمیان ہونا چاہیے تھا وہ جے نگر کا وہ زرنگار چتر کہیں بھی نظر نہ آتا تھا جس کے نیچے دیورائے جلوہ آ رہا ہوا کرناٹک تھا۔

”کہیں مہاراج راج محل کے کسی جھروکے سے لڑائی کا نظارہ نہ دیکھ رہے ہوں؟“
سپاہیوں کی نظریں راج محل کے جھروکے پہ بکھر گئیں لیکن چند عورتوں کے خوفزدہ چہروں کے علاوہ انہیں کچھ نظر نہ آیا۔

”مہاراج کہاں چلے گئے؟“

ایک سپاہی نے دوسرے سے پوچھا، دوسرے نے تیسرے سے، تیسرے نے چوتھے سے اور اس طرح یہ تشویش انگیز سوال ساری فوج میں گشت کرنے لگا۔

”سیناپتی اور راجگود نہایت تیزی کے ساتھ راج محل کی طرف بھاگے، کچھ ابھی تک پھونگے جا رہے تھے۔“

سپاہیوں کے شور و غل، زخمیوں کی چیخوں، گھوڑوں کی ہنہانہٹوں، نعروں اور بے کاروں سے بیچانگر کے در و دیوار لرز رہے تھے لیکن مہاراج دیورائے دارو پے نیند کے اتھاہ ساگر میں ڈوبا ہوا تھا۔



اب جب چندر کلا نے اسے بھینچ کر خوابِ غفلت سے بیدار کیا تو بیچانگر کو بھی

بڑی بے مبالغہ بے قراری کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔
 ”مہاراج کی ہے ہو۔“

وردھن دیورائے کو دیکھتے ہی جھک گیا۔ ”مہابی! میدان کو پدھاریے ہمارے سپاہی
 لڑنے مرنے کی سوگند کھا چکے ہیں آپ کو نہ دیکھ کر ان کی پتا پڑھ رہی ہے اس سے مہاراج
 کو سینا کے درمیان ہونا چاہیے۔“

”مگر وردھن! یہ سلطان صبح ہی صبح کہاں سے آپکا؟ ہم نے تو سنا تھا اس نے ابھی
 دریا بھی پار نہیں کیا۔“

”وہ خبر غلط تھی مہابی! سلطان نے رات ہی دریا عبور کیا۔ ایک پل رکے بنا آج صبح
 دم یہاں آ پہنچا اور آتے ہی ہمارے پر چوٹ لگائی لیکن مہاراج! یہ باتیں کرنے کا سہ نہیں
 آپ کو۔۔۔۔۔“

”تم چلو وردھن! ہم ابھی آتے ہیں لیکن سینا میں ہمارے پہنچنے کا اعلان کرو جب
 ہم فیصل تک آئیں تو سواگت کے سگھ پھونکے جائیں۔ جیکارے بلند ہوں اور ہمارا زور
 جھنڈا فضا میں لہرایا جائے۔ اس کا دروائی سے سینا کے اندر نیا جوش پیدا ہوگا۔ تم سمجھ گئے
 نا۔۔۔۔۔“

”سمجھ گیا مہاراج۔“

وردھن نے گردن جھکائی اور اٹھتے قدموں باہر نکل آیا۔ دیورائے نے ابھی تک
 راجگورو کو دیکھا ہی نہ تھا۔ جب وہ پلا تو سامنے پنڈت گوروکھ ناتھ کھڑا تھا۔

”راجگورو!“

راجگورو کی آنکھوں میں دہخائیاں رقص کر رہی تھیں۔

”مڈگل پر چڑھائی سے پہلے ہی میں نے مہاراج کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔“
 ”تو اس کے لئے ہم نے تمہیں کب دوش دیا ہے۔“ دیورائے بوڑھے کی آنکھوں
 میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”ابھی سلطان ہمارے سپاہیوں سے لڑا ہے ہم نے نہیں لڑا۔ آج
 ہم اسے ایک سبق دیں گے۔“

آجوں کے درخت کے پاس کھڑی چند رکھ کے لیوں پر ایک ہلکی سی سکرابٹ تیر گئی،
 جیسے وہ اپنے باپ کے الفاظ سن کر مطمئن ہو گئی تھی۔

”نہ جانے کیوں میرے من کی چٹا بڑھتی جا رہی ہے۔“ پڑت گورکھ ناتھ نے
تولیش انگیز لہجے میں کہا اور نگاہیں فرش پر گاڑھ لیں۔
”راجو رو!“

دیورائے غصہ سے چیخ اٹھا۔ ”ہم سے تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں تم جانتے ہو
ہم تمہاری چٹا پر دھیان دے سکے گے۔ سنو! اگر ہم جیت نہ سکے تو ہاریں گے بھی نہیں۔“
”مہاراج میرا مطلب نہیں سمجھ، میں جنگ سے پریشان نہیں ہوں لیکن یہ ضرور کہنا
چاہتا.....“

”بس ہم کچھ نہیں سننا چاہتے، اس سے تمہیں صرف ہماری بے پکاری ہوگی۔“
”مہاراج کی ہے ہو، حملہ ہو گیا۔“

دیورائے کی پشت سے باریک سی آواز سنائی دی، یہ راج محل کا وہی طوطا تھا جس نے
”مہاراج کی ہے ہو“ کا سبق رٹ رکھا تھا۔ پھر وہ ”ٹس ٹس.....“ کی آواز میں بولنے
لگا۔ ”حملہ ہو گیا“ یہ لفظ اس نے چھوڑ کلا سے اڑائے تھے۔
دیورائے نے گردن موڑی اور سسکا کر طوطے کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کا بیجرہ
برآمدے کی محراب میں لٹک رہا تھا۔

”کٹھ مہاراج ایاد رکھو اگر ہماری ہے نہ ہوئی تو ہم تمہاری گردن سروڑ دیں گے۔“
اسنے میں چھوڑ کلا کے اشارہ پر دو دیوداسیاں کمرے میں داخل ہوئیں اور مہاراج
دیورائے کو جنگی لباس پہنانے لگیں، سسکوں کی آواز بند ہو چکی تھی البتہ فصیل کے اندر
زخموں کی چیخ و پکار میں ملی جلی اپنی ہتھیاروں کے کھٹکھٹانے کی آوازیں ضرور سنائی دے
رہی تھیں۔



راجکماری چندرکلا

درتپے کی حسینہ

دیورائے کی سواگت نے واقعی بھڑکتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا۔
 جوئی سکھوں کی مترنم آواز میں زرد پھریرا بلند ہوا۔ بھانگر کی فضا میں ”جے بجرنگ
 ملی“ کے جیکاردوں سے گونج اٹھیں پھر ”مہاراج دیورائے کی جے“ کا شور بلند ہوا۔ یوں
 معلوم ہوتا تھا دیورائے نہیں آیا۔ اس نے کوئی تکرار کر لیا ہے یا کرنا لگی فوج کو کہیں سے
 الگ آ چکی ہے۔

بھئی سپاہیوں نے حیرت و تعجب کے ساتھ یہ نعرے سنے وہ دیکھنے سے قاصر تھے یہ
 نعرے کس ناگہانی خوشی میں بلند کئے گئے ہیں۔ ادھر فولاد خان نے بھی جو سب سے آگے
 دست کی کمان کر رہا تھا۔ سنبھل کر ”اللہ اکبر“ اور ”یا نصیر“ کے نعرے بلند کئے۔

سورج تین چار نیزے بلند ہو چکا تھا اور موسم سرما کے آفتاب کی شعاعوں میں
 نمازت پیدا ہو گئی تھی۔ لڑائی کا زور اب شہر کی دوسری فصیل پر تھا۔ جس کا دروازہ شیشم کے
 موٹے موٹے تختوں پر فولاد کی پتھریں جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ چوبی تختوں میں موٹے بھاری کھل
 پوسٹ تھے جن کی ٹوپیاں باہر کو ابھری ہوئی تھیں، شہر کی دوسری فصیل پر بھی تیر انداز فصیل
 کے کنگوروں کے عقب میں بیٹھے تیر بردار تھے جن سے بھٹی سواروں کے گھوڑے ڈھکی
 ہو رہے تھے۔ فصیل کے نیچے دست بدست لڑائی ہو رہی تھی اور کرنا لگی سوار بھئی بہادرزوں کا
 راستہ روکے گویا موت سے جنگ لڑ رہے تھے۔

کئی فوج کے دو مہابت اپنے ہاتھی لے کر فیصل کے اندر کھس آئے تھے اور اب ان ہاتھیوں کو دوسری فیصل کا دروازہ توڑنے پر لگا دیا گیا تھا۔

راج محل کے جھروکوں سے کئی نسوانی آنکھیں دوسری فیصل کے دروازہ پر کشت و خون کا نظارہ کر رہی تھیں۔ یہاں سے راج محل کے دو منزلہ جھروکے اور غرنے صاف دکھائی دے رہے تھے، ہمکنی لشکروں کا حملہ کچھ ایسا اچانک اور حیرت انگیز تھا کہ بیجا نگر کے راج رنواس کی رانیاں، راجکاریاں اور دیوداسیاں بے اختیار کھڑکیوں، درپچوں اور جھروکوں میں آ کھڑی ہوئی تھیں، ان کی نگاہیں بڑتے مڑتے گرتے اور زخمی ہوتے ہوئے سپاہیوں پر تھیں اور دل خوف و اضطراب سے ہرک رہے تھے، سلطان فیروز شاہ کی شخصیت بیجا نگر کے مردوں ہی میں نہیں عورتوں میں بھی شہرت رکھتی تھی۔ ممکن ہے راج محل کی کھڑکیوں سے وہ صرف سلطان دکن ہی کو دیکھنے آئی ہوں۔

سلطان لڑے کا لباس پہنے سفید کوئل گھوڑے پر سوار تھا۔ میدان جنگ میں وہ دیورائے کی طرح چڑے کی طرح چلتا تھا لیکن ہمکنی سواروں میں وہ دوری سے پہچانا جاسکتا تھا۔

دیورائے کے آتے ہی گھسان کی جھٹک ہونے لگی۔

دونوں فیصلوں کے درمیان ایک فرلانگ کا فاصلہ ہو گا جو حریف سپاہیوں سے ۲۱ یو۔ تھا۔ ہمکنی لشکر کو پیچھے سے خطرہ نہیں رہا تھا۔ سلطان نے آتے ہی سپاہیوں کو بیڑھیاں لگا کر فیصل پر چڑھنے کا حکم دیا اور اب پہلی فیصل کے دروازے پر ہمکنی پرچم لہرانے لگا ہے جسے مگر دوسری فیصل پر لڑائی ابھی تک جاری تھی۔ اسی دوران چند سپاہیوں نے کمانوں کے نیچے چڑھائے اور راج محل کی کھڑکیوں کا نشانہ بنائے۔ اچانک سلطان کی نگاہ پڑ گئی اس نے غضب آلود نگاہوں سے تیر اندازوں کی طرف دیکھا اور غصہ میں پکارا۔

”خبردار! اگر تم نے عورتوں پر تیر چلائے تو اچھا نہ ہو گا۔ ہم تمہیں سزا بھی دے سکتے

ہیں۔“

تیر انداز فوراً سنبھل گئے اور انہوں نے شرمسار ہو کر گردیں جھکا لیں۔

”یاد رکھو! صرف مردوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔“

اس کے فوراً بعد سلطان نے اعلان کرا دیا۔ ”بیجا نگر کے راج محل کی کھڑکیاں، درپچے

اور جھروکے کھلے ہیں۔ کوئی شخص نہ ادھر دیکھے نہ تیر چلائے۔ ہم دیورائے کی عورتوں کی عزت کریں گے۔“

اچانک ”نیا نصیر“ کا غلطہ بلند ہوا۔ دونوں ہاتھوں نے مل کر دوسری فسیل کا دروازہ توڑ گرایا تھا۔ وجہ ان کے سپاہی بھوکے بھیڑیوں کی طرح لپکے اور ایک آن کے اندر بیسیوں لکواریں خون میں ڈوب گئیں۔ سلطان نے سواروں کو آگے بڑھایا وہ اپنے گھوڑے کوداتے کرناٹکی سپاہیوں کو روندتے ہوئے نکل گئے۔

دوسرے دروازہ کی شکست کا مطلب بیجا نگر کی شکست تھی دیورائے نے دور بلند فسیل سے بھی سواروں کو دروازہ سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ تو بڑے غصے سے ہاتھ لہرایا اس کے ساتھ ہی کرناٹکی سواروں کا ایک دستہ آگے بڑھا اور اس نے دیوار کی طرح جم کر راست روک لیا۔

شہزادہ حسن، فولاد خان، شمشیر خان اور امیر فضل اللہ شہر میں گھس گئے تھے جب سلطان شہر کے اندر نمودار ہوا۔ امیر فضل اللہ کے بیٹے نے ”سلطان معظم زعمہ باد“ کا نعرہ بلند کیا۔ کرناٹکی سپاہیوں نے گھبرا کر سلطان کو دیکھا جو نعرہ ہاتھ میں لئے بڑھا آ رہا تھا مگر بھامنے کی بجائے انہوں نے موت کو ترجیح دی۔ پھر یہاں سے بھاگ کر وہ جا بھی کہاں سکتے تھے؟

راج محل کے سامنے دیورائے اپنے دستِ خاص کے بہادروں کے ساتھ موجود تھا سلطانی لشکر نے آگے بڑھ کر اس لشکر پر حملہ کیا پھر سلطان نے اپنا بازو لہرایا اور سپاہ کو خاص اشارہ کرنے ہی والا تھا جس کے بعد دیورائے اور اس کی فوج کا موت کے دائرے سے بچ نہ سکا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا کہ ناگاہ راج محل کی دوسری منزل کے درپچے سے ایک تیر سشتا ہوا آیا اور سلطان کے بائیں شانے میں پڑت ہو کے رہ گیا۔ اس کا بازو اوپر ہی اٹھا رہا۔

راج محل کی دوسری منزل کے درپچے میں ایک حسین و جمیل لڑکی کمان سنبھالے کھڑی تھی۔ جس کے کندھوں پر ترکش لٹک رہا تھا۔ سلطان پر تیر اُسی نے چلایا تھا وہ راجکمار کی چدر کلا کے سوا دوسری کوئی نہ تھی۔ سلطان نے راج محل کے درپچے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

پھر اس نے دائیں ہاتھ سے تیر کھینچ کر نکالا اور اپنی مٹی میں اڑس لیا۔ بائیں شانے سے خون کی ایک دھار بہہ نکلی۔ سلطان کا زرہ بکتر رنگین ہونے لگا۔

امیر فضل اللہ سلطان کے زخمی ہونے پر تڑپ اٹھا۔ اس نے تیر چلانے والی کو بھی دیکھ لیا اور پھر جلدی جلدی کمان کا چلہ چڑھانے لگا۔ اس کا رخ راج محل کے اسی در پہرے کی طرف تھا جہاں سے تیر آیا تھا۔

سلطان دور ہی سے چلایا۔

”امیر! تمہیں خدا کی قسم ہے اگر تم تے تیر چلایا۔“

بجوراً امیر فضل اللہ نے اپنا بازو جھٹک دیا اور در پہرے پر قدم آلود نکالیں پھینکا ہوا سلطان کی طرف بڑھا لیکن جب تک وہ پہنچا ہشیار عین الملک اس کے شانے پر پٹی باندھ چکا تھا۔

چند کلا کے راج محل کے در پہرے سے مارا منظر دیکھ لیا تھا نجانبے اس کے جی میں کیا آئی۔ اس نے وہ سرا تیر نہیں چلایا بس ایک لہو ساکت خاموش کھڑی سلطان کو دیکھتی رہی پھر تیزی کے ساتھ چلتی اور بیٹا بکتر کے راج محل کی دوسری منزل پر در پہرے کے پٹ بند ہو گئے۔

یہ راج محل کی چھوڑ کلا کا کمرہ تھا۔

سلطان کی زرہ بکتر اور قبا پر لہو کے سرخ دھبے گہرے ہو گئے۔ اچانک اس نے گھوڑے کا رخ موڑ لیا۔ کرناٹکی سواروں کا ایک تازہ دم دستہ ہے بکتر مٹی کے خیرکارے لگا کرناٹکی سواروں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور ایک ساتھ کئی خارا اشکاف نکواڑیں سلطان کے ارد گرد بکلی کی طرح کوند گئیں۔

اچانک راج محل کے در پہرے کے پٹ پھر کھلے اور چھوڑ کلا کا حسین، سندر اور درخشاں چہرہ بکتر نظر آیا۔ جس پر ایک لطیف اور دلنواز مسکراہٹ قفس کر رہی تھی لیکن فوراً ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ در پہرے کے پٹ بھیلے۔

شاید اس کی نگاہیں اس بھیاٹک جگر خراش اور لرزہ خیز نظارے کی تاب نہ لائیں جس کی ہلکی سی جھٹک اس نے در پہرے سے دیکھی تھی۔

سلطان کا نیزہ بیک وقت دو کرناٹکی سپاہیوں کے پھینک پھاڑتا ہوا نکل گیا تھا اور وہ

اس میں یوں پروئے جا چکے تھے۔ جیسے تاج پر دو پردے پروئے جاتے ہیں۔

امانت لوٹا دی

ایک نکتہ شہر میں گھسے ہوئے بھیجی سپاہیوں کو بڑی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا۔ شہزادہ حسن کے لشکر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیلنے لگی تھی کہ سلطان معظم تیر لگتے سے زخمی ہو گئے اور ابھی اچھی طرح سمجھنے نہ پائے تھے کہ مہاراجہ دیورائے کے اشارے پر وردھن خونخوار ترین سواروں کا دستہ لے کر سلطان پر چھٹا۔ اس قیامت خیز حملہ میں سلطان اپنے لشکر سے کٹ گئے۔ جس کے بعد ان کی کوئی خبر معلوم نہ ہو سکی، کوئی بھی نہیں جانتا سلطان زندہ ہیں یا شہید ہو گئے؟

یہ خبر فوج میں سراپسنگی پھیلا دینے کے لئے کافی تھی۔ شہزادہ حسن سنتے ہی تڑپ اٹھا۔ فوراً ہی وہ سوار شہزادہ کے سامنے پیش کر دیا گیا جو یہ روح فرسا اطلاع لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔

”میں نے اپنی آنکھوں سے سلطان کو زخمی ہوئے دیکھا۔ تیر راج کے ایک درپچے سے آیا تھا۔ جو شانے میں کھب گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے امیر فضل اللہ اپنا گھوڑا لئے سلطان کی طرف بڑھے پھر اسی لمحے کرناٹکی سوار بھوکے بھینروں کی طرح ٹوٹ پڑے اور انہوں نے بھیجی سپاہ کو کاٹ کر عالی جاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ہاں تھوڑی ہی دیر کے بعد کرناٹکی سواروں کا ایک اور دستہ وحشیانہ آوازوں کے ساتھ شور مچاتا اسی طرف لپکا تھا۔“

”اور بھیجی سواروں نے سلطان کے پاس پہنچنے کی کوشش نہیں کی؟“

”جان عالم! سوار اپنی جانوں پر کھیلنے لگے تھے لیکن دشمن نے ان کا راستہ روک لیا تھا۔“

حسن کے ماتھے پر ٹکری ٹکری اور گہری ہو گئیں۔ اس وقت وہ سب میدان جنگ میں تھے اور جنگ میں ایسی کوئی بات غیر ممکن نہیں تھی۔ اب آگے بڑھنا فضول تھا کیونکہ عقب پر ایک لرزہ خیز واقعہ ہو گزرا تھا۔ اس نے فواد خان کو حکم دیا وہ فیصل کی طرف پیچھے ہٹنا چلا آئے کیونکہ سب سے پہلے سلطان کی خیریت معلوم کرنا ضروری ہے اس حکم کے

ساتھ ہی اس نے کچھ اس طرح گھوڑے کی باگ موڑی جیسے سپاہیوں کو ہدایت دے رہا ہو۔ سلطان کے زخمی ہونے کی خبر غلام جیس تھی۔ یہ بھی درست تھا اس کے زخمی ہونے کے فوراً بعد دروہن کی قیادت میں کرناٹک کے سورے چڑھ آئے تھے ان کا حملہ ایسا سخت اور منظم اور اس قدر موثر ہوا تھا کہ چند جاٹاروں کے علاوہ دستہ خاص کے بہادر بھی سلطان سے کٹ کے رہ گئے تھے اور اب پہنی سپاہ کو اپنے سلطان کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔

دراصل دیورائے نے آتے ہی بھانپ لیا تھا کہ حریف شہر میں داخل ہو کر نصف حاصل کر چکا ہے اور اس وقت پوری طاقت کو مقابلہ پر جموٹک دینے کی ضرورت ہے، قلعہ کی برجی سے اُس نے بھی سلطان کو زخمی ہوتے دیکھ لیا تھا بس اُسی وقت اس نے دروہن کے آٹھ ہزار سواروں کے ہمراہ صرف سلطان کے دستہ پر حملہ کرنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد مہاراجہ نے ایک اور دستہ کو حملہ کا حکم دیا۔ اس کی ساری توجہ سلطان کو گھائل کر کے مارنے اور گرفتار کر لینے پر مبذول تھی۔ پھر قلعہ کے سب دروازے کھول دیئے گئے اور کرناٹکی کے سوزوچ کی طرح مقابلہ پر لگے۔

پچاس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادہ سپاہی موت کی بازی لڑنے کے لئے میدان میں اترے، ان کے درمیان "دائے زبایاں" کے زور پھرتے زخمی نعل کنٹھوں کی طرح پھڑپھڑ رہے تھے جن پر جنگی سور کے نشان نقش تھے۔ دیورائے کے سامنے بس ردی پہلو تھے۔

تخت یا تختہ زندگی یا موت

سلطان اور امیر فضل اللہ نے یہ سمجھنے میں غلطی نہیں کھائی کہ دیورائے نے بازی کے لئے اپنی پوری طاقت جنگ میں جموٹک دی ہے سلطان جانتا تھا۔ اب کرناٹک دیوانے سواروں کو دستہ سے ہٹا دینا آسمان کام نہیں۔ دروہن کے سواروں نے جس شہر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا۔ وہ موت یا جیت کے سوا کسی امر کے نہیں۔

سلطان کے گرد موت کا حصار بولے بولے تنگ ہونے لگا۔ امیر فضل اللہ نے گورڈا کر اس کو اپنی پشت پر نالے لیا مگر دوسرے ہی لمحے سلطان خور اس کی آڑ سے نکل آیا اس کے ہاتھ میں ایک لمبا نیزہ تھا جو حملہ آوروں کے سینے پھید رہا تھا، آنکھوں میں چپے

سی چمک تھی اور ذہن پوری بیداری کے ساتھ جنگی نقشے کے خطوط پر گھوم رہا تھا۔ اس نے ایک ٹائیپ کے لئے پلٹ کر دیکھا پھر کسی بھی ایک خطرے کے احساس سے لرز اٹھا۔

وجیا نگر کے ہزاروں سپاہی فصیل سے کود کر دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے اور انہوں نے ہمکنی سپاہ کو پتھر کی بلند دیوار سے پرے ہی روک دیا تھا۔ آف دیورائے کتنی خطرناک چال کھیل رہا تھا۔ فصیل کا دروازہ بند کر کے وہ ہمکنی سپاہیوں کو قلعہ میں گھیر کر ہلاک کر دینا چاہتا تھا۔ کئی لشکر تین حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے ایک حصہ فصیل سے باہر تھا۔ دوسرا شہر کی دوسری فصیل کے اندر لڑ رہا تھا۔ جس کا دروازہ بند ہونے والا تھا، اور تیسرا شہزادہ حسن کی کمان میں شہر کے اندر مصروف جنگ تھا۔ دوسرے لشکروں میں وکن کے صرف پندرہ ہزار سوار بیجا نگر کے ساڑھے پانچ لاکھ سپاہیوں سے نبرد آزما تھے اور اس وقت دیورائے انہیں نہایت ہوشیاری سے شہر کے اندر ہی گھیر لیتا چاہتا تھا۔

سلطان نے صورتحال بھانپ لی تھی پھر اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی شہر پر قبضہ کرنے کا خیال ترک کر کے اس نے فصیلوں سے باہر نکل جانے ہی میں بہتری سمجھی۔ اس نے امیر فضل اللہ کو اشارے سے اپنا فیصلہ بتایا لیکن موت کے اس گھیرے کو توڑ کر نکل جانا آسان کام نہیں تھا جو ہر لمحہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

شہر کے بازاروں سے ہاتھیوں کی چنگھاڑ سن کر امیر فضل اللہ بھی حیران و ششدر رہ گیا۔ دیورائے نے ایک سو جنگی ہاتھی وکنی سپاہ کو کچلنے کے لئے قلعہ سے باہر ہانک دیئے۔ لڑائی کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔

جنگی ہاتھیوں کی چنگھاڑ سن کر دروہن کے چہرے پر مسرت کی روشنی قریب کرنے لگی۔ اب ایک بھی ہمکنی سپاہی زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔ دوسری فصیل کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور وجیا نگر کے سپاہی گیدڑوں کی طرح ہواکتے فصیل کے اندر گھرے ہوئے ہمکنی سواروں پر عقب سے تیر رہا ہے تھے۔

دروہن نے راج محل کی دوسری منزل کی طرف دیکھا۔ راجکاری چندر کلا کے قصر کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن صرف اسی درجے کے پٹ پھر کھل گئے تھے جہاں سے کچھ دیر قبل سلطان پر خیر چلایا گیا تھا۔ چندر کلا درجے کی آنکھوں کی چوکت پر ہاتھ رکھے کھڑی سلطان کی بے بسی کا نظارہ کر رہی تھی جو اپنے چند جانوروں کے ہمراہ کرناٹکی سواروں کے نرغے میں

کمر میا تھا۔

راجپوتوں کو دیکھتے ہی دروہن کی آنکھوں میں بھڑپنے کی سی سفاکی پیدا ہوئی اس نے تلوار لہرائی اور اپنے سواروں کو لگارتا ہوا جھپٹ پڑا۔ وہ جانتا تھا دکن کے تاجدار کی موت کے ساتھ ہی جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا پھر اس کی بے مثال بہادری کرنا تک کی تاریخ کا ایک ایسا ورق بن جائے گی۔ جس پر بڑے بڑے سورا مہابہر ہمیشہ رشک کریں گے دروہن کے نیزے پر دکن کے بہادر سلطان فیروز شاہ بھٹی کا کٹا ہوا سرا سے بیجا نگر کے راج دربار ہی میں نہیں سارے ہندوستان میں لازوال شہرت بخش دے گا اور راجپوت چندر کلا اپنے سندر ہاتھوں سے اس کے گلے میں موتیوں کی مالا پہنائے گی سر پر سونے کا مکت رکھے گی اور راجپوتوں کا ختن اس کے دل کے نہیں خانوں کو روشن کر دے گا۔

دروہن نے مستقبل کے تاجدار اور سندر تصور میں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی پھرے ہوئے سوار اس کے جلو میں تھے۔ قلعہ کی برجی سے خود دیوائے بھی دروہن کے سفاکانہ حملہ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ شاید تصور کی آنکھ سے وہ بھٹی سلطان کا سرا اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں لڑھکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

امیر فضل اللہ دروہن کے وحشیانہ ارادے کو بھانپ کر تڑپ اٹھا۔ سیناپتی کو اس جوش و خروش کے ساتھ بڑھتے دیکھ کر کرناٹکی سورا اور زیادہ دلیر ہو گئے تھے، ان کی آنکھوں میں بھی بلا کی سفاکی پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے غراتے ہوئے بیجڑیوں کی طرح جیرکارہ بلند کیا۔ جیسے موت کے ہزاروں دیو کھلکھلا کر فحش دیئے ہوں یا بیجا نگر کے شوالوں میں کانٹنی کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

بھٹی سوار نیزے تان کر کھڑے ہو گئے۔ امیر فضل اللہ ایک مرتبہ پھر سلطان کی دھال بن جانے کے لئے اپنا گھوڑا کداتا ہوا آگے بڑھا پھر اس نے سلطان کی غراہٹ سنی۔

”امیر! میرا راستہ چھوڑ دو۔“

پھر دوسرے ہی لمحے فضا میں ایک بھیانک جھج گونجی چلی گئی۔ سلطان کا نیزہ بڑھتے ہوئے دروہن کا پیٹ پھاڑ کر دوسری طرف نکل گیا تھا اور کرناٹک کا سیناپتی لوہے کے پھل میں پرویا جا چکا تھا۔

کسی چھٹی سوار سنہ ایک تیر دروہن کے گھوڑے کی گردن میں بھی پوسٹ کر دیا تھا اور اب بدکا ہوا زخمی گھوڑا کرناٹکی منوں میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ دروہن کی لاش الٹ گئی تھی۔ مگر اس کا ایک پاؤں رکاب میں اس بُری طرح اڑ گیا تھا کہ لاش گھوڑے کے ساتھ ساتھ کھینچی چلی جا رہی تھی۔ دروہن کے جسم میں پرویا ہوا نیزہ بار بار گھوڑے کی ٹانگوں سے کرا جاتا تھا جس سے وہ اور زیادہ بھڑک اٹھا اور بے تحاشا بھاگنے لگتا تھا۔

سیناچی کی لاش دیکھ کر کرناٹکی سواروں کی ہمتیں ٹوٹنے لگیں۔ موت آنکھوں میں ناچ اٹھی اور پیچھے ہٹنے لگے۔ اس وقت وجیا مگر کی فوج میں عجیب سی اترافری پھیل رہی تھی۔ چند سوار سیناچی کی لاش سنبھالنے کے لئے سرکش زخمی گھوڑے کو گھیرنے لگے۔ جس سے سب مضطرب و ہراساں ہو کر رہ گئے۔

اس خطرے میں کرناٹک کے کئی چیدہ چیدہ سوار مہلاک ہوئے تھے اور صدمہ و حیرت نے دشمن کو بُری طرح ہلکا کر دیا تھا۔ ان لمحوں سے فائدہ اٹھا کر سلطان کا اپنے لشکر سے جاملہ کچھ مشکل نہ تھا۔ بیدار نظام الملک نے دکن کے سیاہ پرچم کو جھنکا دیا اور سلطان اپنے جانشینوں کی معیت میں فیصل کی طرف بڑھا جہاں خاندان خان اور ارغون خان دشمن کے سروں پر موت بن کر نازل ہو رہے تھے۔ سلطان پرچم کو دیکھ کر ارغون خان نے ”اللہ اکبر“ کا نعرہ بلند کیا اور پھنی سپاہی جہاں کہیں بھی تھے نعرے کا جواب دینے لگے۔ شہزادہ حسن اور فواد خان کے دستے بھی شہر سے لوٹ کر فیصل کی طرف بڑھ رہے تھے جن کے پیچھے ”سیاہ موت“ چنگھاڑتی ہوئی بھاگی آرہی تھی۔

سلطان کے خاص پرچم کو لہراتے دیکھ کر ولی عہد نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ارغون خان سے اتنا پیچھے ہٹ آیا تھا کہ دوبارہ آگے بڑھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ ہاتھیوں کی فوج اس کے لشکر کے تعاقب میں تھی۔ فواد خان کو ہدایت دے کر وہ گھوڑا دوڑا۔ سلطان کے حضور آ پہنچا اور اس کا حکم سننے کے لئے جھک گیا۔

”ہم آج شہر پر قبضہ نہیں کریں گے۔“ سلطان سنہ اسے اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیا۔ فوج کو لے کر نکل جاؤ۔“

پھر سلطان نے اپنا گھوڑا فیصل کی طرف موڑ لیا اور شہزادہ اپنے لشکر کی طرف بڑھ رہے تھے اب بہت قریب آ گئے تھے اور فواد خان کے سپاہی ان پر تیر بھاریہ تھے۔

تیروں سے ہاتھیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ ”سیاہ موت“ سے پیچھا چھڑانے کے لئے شہزادہ حسن کی تجویز بڑی عجیب و غریب تھی۔ چند گھوڑوں پر سیاہ کپڑے کی ”جھولیں“ ڈال کر اور گلوں میں گھٹکھرو اور گھنٹیاں باندھ کر انہیں ہاتھیوں کی طرف ہانک دیا گیا پھر فولاو خان چالیس پیاس سواروں کو لے کر ”سیاہ موت“ پر حملہ آور ہوا اور سپاہیوں کو ہدایت کی گئی تھی وہ تلوار کا بھرپور ہاتھ مار کر ہاتھیوں کی سونٹیں کاٹنے کی کوشش کریں۔

تجویز کار آمد ثابت ہوئی۔ پہلے ہی حملہ میں آٹھ دس ہاتھیوں کی سونٹیں کٹ کر زمین پر گر گئیں اور وہ بھیا تک آواز میں چٹکھڑاتے ہوئے منہ پھیر کر واپس بھاگے۔ سیاہ جھولوں والے گھوڑے بھاگتے ہوئے ہاتھیوں کے پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ آن کی آن میں نقشہ پلٹ گیا۔ زخمی ساتھیوں کو دیکھ کر ہاتھیوں کی پوری فوج پلٹ پڑی اور مہاتوں کی ہزار کوششوں کے باوجود وہ اپنی ہی سپاہ کو روکتے ہوئے قلعہ کی طرف بھاگ نکلے۔

ہاتھیوں کے پیچھے جو لشکر جبار بڑھا آ رہا تھا۔ اس میں اچانک جھگڈڑ بج گئی۔ دیوارے کے ہاتھی بھی اس وقت پورس کے ہاتھی ثابت ہو رہے تھے۔ جن کے قدموں سے ہزاروں سپاہی کچلے گئے۔ ان گت انسانوں کی ہڈیاں کڑکڑا کر چور ہو گئیں۔

اس غیر متوقع صورتحال سے کرناکیوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔ بیٹناچی دروہن اور فوج کے بہادر سواروں کی بھیا تک موت ہاتھیوں کی شکست اور پیادہ لشکریوں کی تباہی نے بیٹاگر میں قیامت پھا کر دی تھی اور دیوارے مارے ہوئے جھاری کی طرح قلعہ کی برہتی پر کھڑا شاید اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ وہ اپنی ہی جتنی چال کا شکار ہو گیا تھا۔

سلطان اگر چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر اور قلعہ پر بیک وقت حملہ کر کے اپنی آمد کا مقصد پورا کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ آدھے لشکر فیصلی سے باہر ہی رہ گئے تھے۔ صرف پندرہ ہزار سواروں بے سارے پانچ لاکھ کی سپاہ پر فتح پانا شاید ناممکن نظر آ رہا تھا پھر سپاہی بھی تھک گئے تھے کل فیروز آباد کی روانگی سے اس وقت تک ان میں سے کسی نے بھی آرام نہیں کیا تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات سفر کرتے رہے تھے اور آرام کئے بغیر ہی سلطان نے حملہ کا حکم دے دیا تھا پھر وہ کئی پہرے بھوکے پیاسے لڑ رہے تھے۔ اس حالت میں انہیں کبھی مزید راستخان میں ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ سلطان اپنی سپاہ کا ہمیشہ خیال رکھتا اور یقینی ضرورت کے بغیر اسے کسی مشکل میں نہیں ڈالتا تھا۔ اس وقت

وایسی ہی غنیمت تھی۔ اس نے اندرونی فعلیوں کو بھی اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے اور سپاہ کے تازہ دم ہونے کے بعد وہ کسی وقت بھی شہر پر دوبارہ حملہ کر سکتا تھا۔

دوسری فسیل کا دروازہ پھر کھل گیا تھا اور پہنی سوار کرنا لگی سپاہیوں کو مارنے کا سب سے لوٹ رہے تھے۔

بیجا نگر کے بازار اور میدان لاشوں اور زخموں سے اٹے پڑے تھے۔ زمین لالہ زار ہو رہی تھی۔ مدھل کی سرزمین پر پہننے والے لہو کے قطرے رنگ لائے تھے اور بیجا نگر کی مٹی اپنے سوراخوں کے خون سے بھیجک چکی تھی۔ دیوارے کو اپنے شہر اپنے ہی گھر میں اپنی حماقت کا ایک اور جواب مل گیا تھا۔

مہاراجہ کے حکم پر کرنا لگی سپاہ نے دکن کے لوٹے ہوئے سواروں کا تعاقب کیا لیکن شاید وہ بھول گیا تھا۔ اگر وہ خان اپنے بہادریوں کے ہمراہ فسیل کے ساتھ موت کو سنبھل گئے بیٹھا ہے۔ جوئی کرنا لگی سپاہی آگے بڑھتے دکن کے پیران کے سینوں میں پیوست ہونے لگے۔ پہنی لشکر بیجا نگر کی دیواروں کے حصار سے ٹک کر آئے جب شہزادہ حسن اور نولہ خان اپنے دستوں کو لے کر باہر آ گئے تو اب کو خان بھی اپنی کمین کا چھوڑ کر باہر کی طرف لپکا

دیوارے کا خیال تھا۔ فسیل سے باہر نکلنے ہی تعاقب کیا جائے اسی طرح وہ اپنے نقصان کی تلافی کر سکے گا پھر جیسے بجلی کے کوندے پک جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کرنا لنگ کے بیس ہزار سوار گھوڑے دوڑاتے باہر نکل آئے اور لوٹے ہوئے پہنی سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے لیکن مہاراجہ کو تعاقب کی یہ غلطی شاید زندگی بھر یاد رہی ہوگی۔ جوئی کرنا لگی سوار دروازہ سے باہر نکلے۔ آس پاس پہاڑی گھاٹیوں میں چھپے ہوئے کوسل رائے اور قباچہ خان کے سپاہی اُن کے لئے موت کا پیغام بن گئے اور تین ہزار سپاہیوں کی بھینٹ دے کر کرنا لگی سوار پھر فسیل کے اندر جا گئے۔ قلعہ کا دروازہ بند کر لیا گیا۔

پہاڑی گھاٹیوں کو عبور کر کے سلطان بیجا نگر کے سامنے میدان میں آ گیا جہاں اس نے مہریم پڑاؤ ڈالا تھا۔ اگرچہ وہ پسا ہو کر آیا تھا لیکن یہ پسا ہی نہیں ہی کے لئے جان بوجھت ہوئی تھی۔ اگر اس نے تھوڑا سا جرا کھینچا ہوتا تو شہر پر قبضہ بھی کر لیا ہوتا لیکن جنگی اعتبار سے اس پسا ہی میں بھی کسی کا ہاتھ غالب رہا تھا۔ گھوڑے سے اترتے ہی اس نے

سپاہیوں کو ہتھیار کھولنے اور آرام کرنے کا حکم دیا اور خورد نہایت تیزی کے ساتھ خیمہ میں گھس گیا۔ مہاراجہ کی فوج کے لئے وہ شہر کے اندر بہت سا کام چھوڑ آیا تھا۔
 سلطانی لشکروں نے کچھ اس انداز میں خیمے نصب کئے تھے کہ بیجا نگر تین اطراف سے محصور ہو گیا تھا اور طلائیہ گردستے اس سے ایک میل کے فاصلہ پر آٹھوں پہر گردش کرتے رہتے تھے۔

دوبئی کے وقت بھی حریف پر ایسی کاری ضرب پڑی تھی کہ اس کی طرف سے فوری حملے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ دیورائے کے لئے یہی غنیمت تھا کہ سلطان شہر پر قبضہ کا خیال ترک کر کے لوٹ گیا تھا۔ بیجا نگر کے بازاروں اور میدانوں سے لاشیں اٹھائی جانے لگیں۔
 شام تک کوئی گھرا سا نہ ہو گا جہاں سے رونے کی آواز نہ اٹھی ہو۔ کٹاک کے چند ہزار سورے بھمنی تلواروں کا لقمہ بن گئے تھے اور اس سے دو چند زخمی ہوئے تھے۔ گھر گھر میں موت کا سیاہاں ہو رہا تھا۔ دیورائے کی ہوس و جیا نگر کی ہزاروں سہائوں کے لئے بیوگی کا نوخیز بن گئی تھی۔

بھمنی سپاہیوں میں شہید ہونے والوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ لوٹنے وقت اکثر لاشیں گھوڑوں پر لاد لی گئی تھیں۔ جنہیں بیجا نگر کے باہر دفن کر دیا گیا تھا لیکن جو لاشیں شہر کے اندر رہ گئیں۔ دیورائے نے ان کے ساتھ وردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ راجکو رو چندت گورکھ ناتھ کے مشورہ پر انہیں کرتا نکی مردوں کے ساتھ چلایا نہیں گیا۔ بلکہ گڑھے کھود کر دفن دیا گیا دوسرے روز دیورائے نے سلطان کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی جس میں یہ پیغام تھا۔

”سلطان کو معلوم ہونا چاہیے ہم نے ان کے سپاہیوں کو کفن تو نہیں دیا لیکن دفن ضرور کر دیا ہے۔“

اس پیغام میں دراصل یہ طر تھی کہ جیا نگر کی زمین بھمنی سپاہیوں کے لئے قبرستان بن سکتی ہے۔

”ہم بھی دیورائے کے سپاہیوں سے اچھا سلوک کریں گے اور ان کی اڑھیاں جلابے کے لئے بیجا نگر کی لکڑیاں استعمال میں لائیں گے۔“
 اس جواب کے ساتھ سلطان نے بغیر کو دا پس کر دیا اور شہر کے گرد محاصرہ کچھ اور تنگ

کر دیا۔ باہر کی دنیا کے ساتھ بیجا نگر کا تعلق صرف جنوبی سمت سے قائم تھا۔ کرناٹکی فوجیں
 فصیل کے اندر اور بھیٹی لشکر فصیل سے باہر ایک دوسرے کی تاک میں پڑے تھے۔
 سلطانی سوار ہر روز آراستہ ہو کر نکلتے تھے لیکن بیجا نگر کا دروازہ نہیں کھلتا تھا اور مہاراجہ
 کی فوجیں مقابلہ کے لئے باہر نہیں آتی تھیں۔ سلطانی لشکروں کو محاصرہ کئے پورے پانچ روز
 گزر گئے لیکن ابھی تک کرناٹکی سپاہ باہر نہیں نکلی تھی۔
 شاید بیجا نگر کے باشندے پندرہ ہزار سپاہیوں کا سوگ منا رہے تھے۔



حمیدی

پاک سوسائٹی
 ڈاٹ کام

محلاتی سازشیں

گہرے راز

بیگم جہاں کی خاص کنیز زریہ قصر شیرازی کے ایک حجرے میں اُدھسی لیٹی تھی تین روز گزر جانے کے بعد بھی اُس کے سر کا زخم ابھی مندمل نہیں ہو سکا تھا جو قصر لالہ کی میزبانیوں میں دھکا کھا کر گرنے سے ابھر آیا تھا۔ وہ تو زریہ کی قسمت بھلی تھی کہ گردن کا منکا نہیں ٹوٹ گیا ورنہ اس کے ہلاک ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

تجب اس بات پر تھا۔ بیگم نے اپنی پرانی اور معتد کنیز کے ساتھ جو گزشتہ بارہ سال سے اس کی خدمت پر مامور تھی۔ ایسا ہیجانہ سلوک کیوں کیا تھا؟ قیروز آباد ہی نہیں گلبرگہ کے محلات میں بھی زریہ کی وفاداری اور خدمت گزاری ضرب المثل تھی پھر اچانک بیگم اُس کی جان لینے پر کیوں نکل گئی؟

یہ معمر محل سراؤں کی کسی خاتون کے ذہن میں نہ آ سکا۔

زریہ کے زخمی ہونے کی خبر سننے ہی بیگم عالیہ بھاگی بھاگی قصر لالہ میں آئی تھی بیگم جہاں اس وقت پر تھا کہ پاس بیٹھی خرگوشوں سے کھیل رہی تھی جب اس نے آتے ہی پوچھا تھا۔

”عالیہ خانم! یہ میں نے کیا خبر سنی ہے۔ کیا آپ نے واقعی زریہ کو.....“

بیگم جہاں اپنے بڑھاپے اور بزرگی کے باعث بھنی خاندان میں ”عالیہ خانم“ کے معزز نام سے یاد کی جاتی تھی۔ ابھی عالیہ نے اپنا فخر بھلی پورا نہیں کیا تھا کہ وہ غصہ میں

تھر تھراتے ہوئے بولی۔

”تم بھی وہی تفسیہ لے کر آئی ہو عالیہ! خدا کے لئے اس ناگن کا نام نہ لو، جسے میں بارہ سال تک آستین میں پالتی رہی۔ کیا تم جانتی ہو اس نے میری مہربانیوں کا کیا صلہ دیا۔“
عالیہ نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

”وہ کتنا شیرازی کے ساتھ مل گئی تھی۔ کل رات اسی سپیرن نے بانو کے کمرے میں سانپ چھوڑا تھا۔“

”اوئی میرے پرور و گار! تو یہ زرینہ ہی کا کام تھا؟“

پر حال کے کمرے میں سانپ چھوڑنے اور اس کی بجائے مشتری کے مسموم ہونے کی خبر سارے محلات میں گردش کر رہی تھی اور اس وقت تک شیرازی کے سوا کئی جگہات اور خواتین علیہ خانم کے قصر میں خیریت پوچھنے آ چکی تھیں۔

”مگر بانو! یہ کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔“

”تم سمجھ بھی کیسے سکتی ہو۔“

”یہی تو سمجھنا چاہتی ہوں۔“

خانم کی بورسی آنکھوں میں جہاں اس کی گزری ہوئی زندگی پلکوں کی اوٹ میں آرام کر رہی تھی ایک عجیب سی چمک تیرنے لگی اور اس کی تجربہ کار نگاہوں کے تیر عالیہ کے دل میں چپنے لگے۔

”بانو کو ہلاک کرنے میں دو مقصد تھے۔ اول تو مجھے سلطان کی نگاہوں سے گراناکہ

میں ان کی امانت کی حفاظت نہ کر سکی۔ دوسرے تم سے کسی عداوت کا بدلہ لینا۔“

”مجھ سے.....“

عالیہ یوں چونک اٹھی۔ جیسے کسی گہرے خواب سے اجاگت ہی بیدار ہوئی ہو۔ اس نے قریباً چلا تے ہوئے پوچھا۔

”کیسا بدلہ عالیہ خانم! بھلا میری خاطر کسی کا بانو کو نقصان پہنچانا کیا معنی رکھتا ہے خواہ

وہ شیرازی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ راز تو میری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔“

”ہے تو یہ ایک راز ہی۔“

”راز۔۔۔۔۔“

”سنوگی؟“

”کیوں نہیں۔ میں بانو کے ساتھ کوئی علم نہ ہونے دوں گی۔“

بیگم جہاں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”تو سنو ابانو تمہارے اور ولی عہد کے درمیان ایک کڑی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

حیرت سے عالیہ کی آنکھیں جنبش کرتا بھول گئیں اور اس کا چہرہ ایک موالیہ کی شکل اختیار کر گیا۔ پرتھالی کے رخسار پر حیا کی سرخی لہرائی۔ اس نے ایک خرگوش اٹھایا اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔ بیگم جہاں کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز تبسم رقص کر رہا تھا۔

”کیا مطلب بتانا باقی رہ گیا ہے؟ حسن پرتھالی سے پیار کرتا ہے اور میرا خیال ہے کہ شیرازی یہ راز جان گئی ہے۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ عالیہ نے ”اچھا“ کو کھینچتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ابھی ابھی اس پر ایک ایسی حیرت کا انکشاف ہوا تھا جس نے اس کی قوت گویائی تک سلب کر لی بھر وہ آہستگی سے انہی اور اپنے قصر کی طرف چل دی اس کے قدم یوں اٹھ رہے تھے جیسے وہ نیند کی حالت میں چل رہی ہو۔ بے سدا، بے خبر۔ راہداری عبور کر چکنے کے بعد اس نے محسوس کیا وہ کسی ذی روح مجسمہ کے قریب سے گزر رہی ہے جو اس سے ہمکام ہونے کا متمنی تھا۔

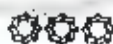
اس نے پلٹ کر دیکھا پرتھالی ایک محراب میں کھڑی اسے جاتے دیکھ رہی تھی عالیہ کسی خیال کے تحت ہولے ہولے چلتی ہوئی محراب کے پاس پہنچ گئی۔ پرتھالی کے چہرے پر اضطراب و مسرت کے دو مختلف جذبے دن اور رات کی طرح بکھل چلے ہوئے تھے۔

”بانو! عالیہ کے ہونٹ کھپکپاتے۔“ کیا واقعی تم..... اچھا کچھ نہیں..... کچھ نہیں.....

کچھ نہیں.....

کوئی بات پوچھتے پوچھتے اچانک وہ رُک گئی پھر تیزی کے ساتھ مڑی اور پرتھالی کو ایک نئی حیرت کے کنویں میں جھپکنے لگی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پرتھالی کو یوں لگا جیسے کسی نے اُس کے ذہن کو اپنے کھر دے ہاتھوں سے مسل دیا ہو۔



بیگم جہاں کا اعزاز غلط نہیں تھا۔

قصر لالہ سے نکال دیئے جانے کے بعد شیرازی اور مہر زریں نے زرینہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

اس کی چیخ کی آواز سن کر زریں فوراً ہی پہنچ گئی تھی۔ وہ شیطان تو آسمانوں پہر قصر لالہ کی طرف کان لگائے رکھتی تھی۔ میز میوں سے گرتے ہی زرینہ کے سر پہ گہرا زخم آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے تھے اور خود بیگم جہاں بھی یہ منظر دیکھ کر کانپ اٹھی۔ جو ایک کھڑکی کی اوٹ سے تماشا کر رہی تھی۔

زریں نے چند خواجہ سراؤں کو بلایا اور نیم بیہوش زرینہ کو اٹھا کر اپنے حجرے میں لے آئی۔ جس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر ایک ناگہن کی سی پھٹکارتھی یوں معلوم ہوتا تھا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں بیگم جہاں کے خلاف کسی خوفناک سازش کا انکشاف کر دینا چاہتی ہو۔

بجلی تو اس کی خبر چھپی۔ تھیں مگر کے زرین بیگم شیرازی کے کمرہ خاص میں داخل ہوئی۔ چند لمبے ان کے درمیان سرگوشیاں ہوتی رہیں پھر شیرازی کی آواز سنائی دی۔ لیکن سب سے پہلے اس بیگم کا علاج ہونا چاہیے تو ذرا حکیم گیلانی کو بلا لانا۔
"حکیم گیلانی۔۔۔" زریں نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم! کیا وہ کنیز کو دیکھنے آئیں گے۔"

"کیوں نہیں۔ میرا سلام کرنا۔ وہ انکار نہیں کریں گے۔ مگر تو کچھ کچھ بھی ہے۔ گیلانی کو بلانے کا کیا مقصد ہے۔"

"مثانید زرینہ کو متاثر کرنا کہ اس کا علاج کوئی معقولی حکیم نہیں کر رہا بلکہ وہ شاہی طبیب کے زیر علاج ہے اس نوازش خاص کے بعد وہ ہمیشہ بیگم حضور کی احسان مند رہے گی۔"

"کبھی! کبھی تو بھی نشانے پر تیر مارتی ہے۔"

"کبھی کبھی نہیں بیگم حضور! میرے چھوڑے ہوئے تیر اکثر نشانے پر بیٹھتے ہیں۔"

زریں کے ہونٹوں پر زہریلی بکراہٹ تھی۔
"لیکن سلطان کے طبیب خاص کو بلانے کا ایک مقصد اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

”میں ان سے ایک تحریر لوں گی کہ مریضہ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔ اگر بروقت علاج نہ ہوتا تو اس کی موت یقینی تھی۔ تجھے معلوم ہے سلطان زرینہ کو چاہتے ہیں۔ شاہی طبیب کی تحریر دیکھتے ہی وہ یقیناً برا فروخت ہو جائیں گے پھر بڑھیا کے اٹلی اختیارات کا خاتمہ اور ہاں۔“

شیرازی کو جیسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ ”زرینہ کو نیا لباس پہنا دے اور اس کے خون آلود کپڑے کہیں سنبھال کے رکھ۔“

”قربانت شوم بیگم!“

جوش مسرت میں زریں کی چیخ سی نکل گئی۔ ”آپ نے بہت دور کی سوچی ہے واللہ! یہ کھوسٹ بڑھیا ہم پر حکومت نہیں کر سکے گی۔“

پھر شیرازی کے کمرے سے نکل کر زریں طویل غلام گردشوں اور راہداریوں میں لپکتی چلی گئی جیسے سیما کی ایک لہر تھی جس پر نگاہ بھی ٹھہر نہیں پاتی۔

تھوڑی دیر کے بعد شاہی طبیب حکیم حسن گیلانی زریں کی رہنمائی میں قصر شیرازی کے ایک حجرے میں داخل ہو رہا تھا۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ قصر لالہ کی سیز جیوں سے گرتے وقت زرینہ کو خلاف توقع کچھ زیادہ ہی چوٹ آگئی۔ اس وقت اگرچہ نیم بیہوشی کی کیفیت دور ہو چکی تھی پھر بھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا سر دو ٹکڑے ہو کے رہ گیا ہے اور اس وقت شدت درد سے اس مریض کی بلیزج کراہ رہی تھی جو موت کے دروازے پر ازمدگی کی گھڑیاں گن رہا ہو۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے گرد بیگم شیرازی اور حکیم حسن گیلانی کو دیکھ کر گھبرائی گئی۔

”دروغین زرینہ! اب تم بالکل محفوظ ہو۔“

زرینہ نے بیگم شیرازی کی آواز میں شفقت اور محبت کی نرمی محسوس کی بیگم شیرازی کی شکایت ایک لخت محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

مرہم لگانے اور پٹی باندھنے کے بعد حکیم گیلانی نے وہ تحریر بھی لکھ دی جس کا مضمون شیرازی نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ زرینہ چپ چاپ لپٹی سب کچھ دیکھتی رہی حکیم جا چکا تو مہر زریں نے اپنی ہمدردی کا پتارہ کھول دیا۔

”خدا کی قسم! علیہ خاتم کے علاوہ اگر کوئی دوسری بیگم تم پر یوں وار کرتی تو میرا کوزا

اس کی کھال اکھیڑ چکا ہوتا لیکن سلطان معظم کی چچی ہیں۔ بھئی دودمان کی معزز و محترم ہستی اور تو جانتی ہے سلطان کے سوا کسی کو بھی ان سے باز پرس کا اختیار نہیں ہے۔“
 زورینہ کے چہرے پر تشکر کی جھلک نمودار ہوئی پھر وہ مدہم آواز میں بولی۔
 ”زریں! میں جان دے کر بھی شیرازی کا احسان نہیں چکا سکتی۔“



تیسرے روز جب زریں شیرازی کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے ہونٹوں پر مکارانہ ہلکی تھی۔

”میں نہ کہتی تھی، بیگم جہاں خود اپنے لئے پسند اختیار کر رہی ہے میں جانتی ہوں جب کسی کثیر کی وفاداریوں کا صلہ ذم کی صورت میں ملتا ہے تو اس کے اندر سوئی ہوئی ناگن اپنی زہریلی پھنکار کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے۔“

”تو کیا زورینہ نے تجھے کچھ بتا دیا؟“ شیرازی کے لہجے کی بے قراری سے ظاہر تھا وہ کسی خوشخبری کی منتظر ہے۔

”اے اپنی کھلی اتارنے میں در نہیں لگی بیگم حضور! لیکن ڈرتی ہے کہیں راز کی بات زبان پر آ جانے سے وہ اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے شاید اس کے سینہ میں کوئی گہرا راز دفن ہے۔“

زریں کی بات سن کر شیرازی اچانک کسی فکر میں ڈوب گئی۔ اس کے ذہن کے گھمبیر ابدیروں میں جیسے کوئی طلسمی چراغ آپ سے آپ روشن ہو رہا تھا۔ وہ سمیری کا پایہ تمام کر کھڑی ہو گئی۔

”کوئی گہرا راز!“ اس نے زریں کے الفاظ دہرائے پھر اپنی نگاہیں ایک گوشے پر مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ”زریں! اگر اس راز کا تعلق احمد خان خاتناں اور شہزادہ حسن سے ہے تو یاد رکھو، یہ کینز سونے کے تول بھی سستی ہے فوج سے رواجی سے قتل شہزادہ حسن قصر لالہ میں آیا تھا مگر وہ اپنی ماں عالیہ بیگم سے ملنے نہیں گیا اس کا چوری چھپے عرف بیگم جہاں سے ملنے آتا کسی علت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ میں جانتی ہوں۔ بڑھنیا احمد خان کو پسند نہیں کرتی اور اس کے خلاف سلطان کے کان بھرتی رہتی ہے۔“

پھر کمرے میں ٹپٹے ٹپٹے وہ اچانک ایک درتپے کے پاس رک گئی اور سرگوشی کرتے

ہوئے بولی۔

”زیریں! کیا تو نہیں چاہتی شہزادہ حسن کی بجائے کوئی دوسرا سلطان کا جانشین ہو؟“
 ”کیوں نہیں بیگم! کیا شہزادہ حسن سے میری نفرت ڈھکی چھپی ہے؟ مجھے تو عالیہ بیگم کے دودھ سے عداوت ہے خواہ شہزادہ کی نبضوں میں سلطان ہی کا خون کیوں نہ دوڑ رہا ہو۔“

زیریں نے بڑے غصے میں اپنی نفرت کا اظہار کیا اور شیرازی نے فوراً ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔

”آہستہ زیریں! خدا کے لئے آہستہ بول۔ تُو تو ایک دم چلانے لگی۔ کیا نہیں جانتی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اگر اس خبر کی بھک بھی کسی کے کانوں میں جا پڑی تو تیرے بدن سے کھال اتر جائے گی۔“

اپنی غلطی کا احساس کر کے زیریں خوف سے قہر قہرانے لگی جیسے واقعی اس کی کھال کھینچنے کا حکم صادر کر دیا ہو۔ ایک لمحہ چپ رہ کر بیگم نے پوچھا۔

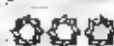
”زیرین کہاں ہے اس وقت؟“

”جبرے میں اونٹنی پڑی ہے، شاید وہ دو روز تک چلتے پھرنے کے قابل ہو سکے۔“
 شیرازی نے درپے کے پٹ کھول کر باہر جھانکا تو غلام گردش کی شرقی جانب اُسے حجرے کا روشنی پردہ ہٹا دکھائی دیا۔ جیسے ابھی ابھی کوئی سایہ نہایت تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ بیگم درپے سے سر نکالے حجرے کے پردہ کو دیکھتی رہی پھر پہلی نظر کو اپنے واپس پر محمول کر کے زیریں کی طرف پلٹتے ہوئے بولی۔

”زیریں! اگر تو زیرین کو راز اگلنے پر مجبور کر دے تو میں تیرا منہ موتیوں سے بھر دوں گی۔“
 ”موتیوں سے آپ کی خوشنودی زیادہ قیمتی ہے۔“

یہ کہہ کر زیریں مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی جب وہ سرخ پردہ ہٹا کر حجرے میں داخل ہوئی تو زیرین بدستور اونٹ سے منہ لپٹی تھی مگر اس کے تیز تنفس سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کوئی سفر طے کر کے منزل پہ آئی ہو۔

مہر زیریں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا اور وہ کروٹ بدلتے لگی۔



سازش کی کڑیاں

مہر زریں نے دیکھا زریںہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھر تھرا رہی تھیں وہ اُسے بھی ایسی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ جیسے کسی انجانی دہشت سے کانپ اُٹھی ہو۔ نامعلوم اس کی ان ڈری ڈری اور بھی سبھی نگاہوں میں یہ خوف کا عکس کیسا تھا۔ اس کا ذہن کن پراسرار گتھیوں میں الجھ کے رہ گیا تھا۔ وہ کیوں خوفزدہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پر سبھی ہوئی خاموشیوں کا تالا کس نے ڈال دیا تھا؟

زریں کا اپنا ذہن دھوئیں اور اندیشوں کی تاریک فضا میں پرواز کرنے لگا پھر اچانک کسی خیال سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”تو کیا بیگم جہاں کا بے رحم سایہ یہاں بھی اس کا تعاقب کر رہا ہے؟“
اس نے سوچا ممکن ہے اُس کی عدم موجودگی میں علیہ خانم کی کسی کنیر نے زریںہ کو ڈانٹنے دھمکانے کی کوشش کی اور یہ دھمکی دی ہو کہ اُس نے اگر قصر لالہ کا کوئی راز فاش کرنے کی جسارت کی تو موت کے بے رحم ہاتھ اس کی گردن دبوچ لیں گے اور اس دھمکی نے زریںہ کو متحوش کر دیا ہو۔

چھ لمحے وہ تجسس نگاہوں سے اُس کے چہرے پر خوف کے سایوں کو لرزاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر بولی۔

”کیا بات ہے زریںہ؟ تم خوفزدہ کیوں ہو؟“

مگر زریںہ نے اب بھی زبان نہیں کھولی۔ اُس کے ہونٹوں کے کنارے لرز رہے تھے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شاید کسی نامعلوم خوف نے اُس سے بولنے کی قوت چھین لی تھی، اس کے ہونٹ صرف پکڑ پکڑا کے رہ گئے پھر زریں نے اچانک پوچھا۔

”میرے بعد یہاں کون آیا تھا؟“

”ک۔۔۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔“ زریںہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

”ذرا نہیں زریںہ! قصر شیرازی میں کوئی شخص تمہاری طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا شاید تمہیں کسی نے ڈرایا ہے لیکن یاد رکھو علیہ خانم کے ہاتھ یہاں نہیں پہنچ سکتے۔ اگر اس بڑھپو نے کوئی ایسی حرکت کی تو کالا ہانگ اس کو موت کی خاموش وادیوں میں لے اترے گا۔“

زریں کی آواز سے نفرت کا زہر چک رہا تھا کالے ناگ کا نام سنتے ہی زریں کے چہرے پر پھر خوف کے آثار ہویدا ہوئے، تو پرتھالی کے کمرے میں سانپ واقعی زریں نے چھوڑا تھا؟ وہ اپنے آپ کو کسی اذیت ناک تصور سے دور رکھنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔
 ”کالا ناگ“ وہ مدھم اور وہشت زدہ آواز میں کہنے لگی۔

”زریں! مجھ پر مصیبت کالے ناگ ہی کے سبب آئی ہے علیہ خام کا خیال ہے پرتھالی پر میں نے سانپ چھوڑا تھا۔ لیکن۔۔۔“
 ایک زیر آلود قہقہہ سے مجرے کی فضا کانپ اٹھی۔
 ”وہ سانپ تو میں نے چھوڑا تھا۔“

زریں نے سوچا اسے اعتماد میں لے کر ہی وہ راز معلوم کر سکتی ہے جس کے لئے بیگم شیرازی اس کا منہ موٹیوں سے بھرنے پر تیار ہو گئی ہے نفسیات کا بالکل ادنیٰ سا اصول ہے۔ کسی کا راز جاننے کے لئے پہلے اسے اپنے راز سے آگاہ کر دو۔ زریں نے بھی یہی سوچ کر اندھیرے میں تیر چھوڑ دیا۔

بیگم جہاں کی کینز حیرت پاش نگاہوں سے اُسے گھور رہی تھی جیسے اُسے زریں کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

تم نے سانپ چھوڑا تھا؟ کیوں۔۔۔“

”بہی بات ہے زریں۔۔۔“

”لیکن میں سننا چاہتی ہوں۔ یہ بے کار وقت کسی طرح تو کٹے۔“

”میں شہزادہ حسن، اس کی ماں عالیہ اور بیگم جہاں سے نفرت کرتی ہوں۔“

”بیگم شیرازی بھی۔۔۔“

”ہاں وہ بھی۔“

”لیکن نفرت کا شکار پرتھالی کیوں ہوئی؟“

”اوہ۔۔۔ وہ ذلیل لڑکی۔۔۔“ وہ غصے میں دانت پیستے ہوئے بولی۔ ”زریں! سچ کہو کیا

تم پسند کرو گی۔ ایک معمولی سٹار کی لڑکی وکن کی ملکہ بن کر تم پر حکومت کرے؟ کیا یہ تمہیں کی تو ہن نہیں؟ سب جانتے ہیں ہم ایرانی الاصل ہیں۔ کئی سطوں سے ہمارا خون حکومت کر رہا ہے لیکن شہزادہ حسن اب ایک سٹار کی لڑکی کو ہمارے سروں پر مسلط کر رہا ہے اور یہ

بدماغ بڑھیا علیہ بیگم بھی بے وقوف شہزادہ کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

”مگر پر قتال کو تو سلطان عالم نے اپنی بیٹی بنایا ہے۔“ زرینہ کے لہجے میں خوف کی بجائے اب حسرت کا اظہار تھا۔

”بے شک! بادشاہ رعایا کا باپ ہوتا ہے وہ مسلمان ہو یا ہندو مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں۔ شہزادہ ایک ہندو لڑکی کو شہزادیوں پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اس کا انجام خطرناک ہوگا۔۔۔ بے حد خطرناک۔۔۔“

”زریں! تمہارے الفاظ سے بغاوت کی بو آ رہی ہے۔“

اور زریں کا قہقہہ مٹکھروؤں کے چمٹنے کی طرح نکھرنا چلا گیا۔ ہنستے وقت اس کی گول گول آنکھیں بڑی خونخاک ہو گئی تھیں۔ جن میں نفرت و عداوت کی بجلیاں سی کوہ رہی تھیں اس کا کنبی چہرہ جو عام خوبصورت لڑکی کی بہ نسبت خوبصورت، دلکش اور بارعب بھی تھا۔ اس وقت اس عمار مسخرے کی مانند منہ مکھ خیز نظر آ رہا تھا جو دوسروں پر قہقہے لگا کر اپنے دل کا بوجھ بٹکا کر لیتا ہے مگر یہ عجیب ہنسی تھی۔ زرینہ کو محسوس ہوا جیسے اس بھیانک ہنسی کی لہریں اس کے سراپا میں انگڑے بھرتی چلی جا رہی ہیں اچانک زریں اس کے بدن پر جھکتے ہوئے بولی۔

”بغاوت کی بو۔۔۔ ہی ٹی ہی ٹی۔۔۔ تم ٹھیک کہتی ہو زرینہ! صرف الفاظ سے نہیں ذرا سوچ کر دیکھو میرے جسم کے ہر ذرہ سے تمہیں بغاوت کی بو آئے گی۔ آہا بغاوت کتنا خوبصورت لفظ ہے جب یہ ان بے وقوف شہزادوں کے خلاف استعمال کیا جائے جو حکومت کی خاطر تلوار کی بجائے عورت کے حسن پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔“

زرینہ کو اپنی بغضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ بیٹھے بیٹھے وہ کس خیال میں آ پھنسی تھی۔ بیگم جہاں نے اسے صرف ایک سانپ کا راز معلوم کر شہنشاہ کے لئے بھیجا تھا لیکن قصر شیرازی میں تو ہر طرف سانپ ہی سانپ ریگ رہے تھے۔ سازشی ناگ اور زریں اسے بھی بڑی ہوشیاری کے ساتھ بیگم شیرازی کے پھیلانے ہوئے دام میں پھانس رہی تھی۔ اس نے سوچا یہاں تو نیولے کی جی چالاکی سے کام لینا پڑے گا۔

”لیکن تمہیں حکومت کے بکھیڑوں سے کیا مطلب؟“ اس نے ٹٹولنے والی نگاہوں سے زریں کو دیکھا جس کے چہرے پر شیطانی ہنسی اب زہریلی سکرابٹ میں تبدیل ہو گئی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



تھی۔ تمہارا کام تو صرف محلات کی نگہداشت ہے کیا یہ اعزاز کچھ کم ہے تم بیگمات پر حکومت کرتی ہو بغاوت سے تمہیں اور کیا مل جائے گا۔“

”کینروں کے وماغ بغاوت کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتے زریں! وہ صرف تسلیم و اطاعت کی عادی ہوتی ہیں۔ محرم راز جتنا جانتی ہیں مگر سر پر زخم کھانے کے بعد بھی افتائے راز سے ڈرتی ہیں مبادا ان پر کوئی بجلی ٹوٹ پڑے۔“

”زریں۔۔۔“

”زری! کیا میں نہیں جانتی۔ تم ابھی تک مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔“ زریں نے بڑے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”کپنہ سینہ کو کسی راز کی قبر نہ بناؤ۔ دل کا بوجھ ہلکا کر دو جو کچھ جانتی ہو مجھ سے کہہ دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ تمہاری جان کی حفاظت کی جائے گی۔“

زریں نے حیرت پاش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا لیکن فوراً کسی خیال سے سنبھل گئی شاید سانپ اور نعلے کی لڑائی یاد آگئی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولی ”لیکن پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ خانخاناں کے متعلق بیگم شیرازی کی کیا رائے ہے؟“

یہ کہہ کر زریں بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی اس نے اندھیرے میں ایک تیر پھینکا تھا۔ زریں خوشی سے ایک دم اچھل پڑی جیسے اس نے کسی خزانہ کا سراغ لگا لیا ہو۔

”ہم خانخاناں کو شہزادہ حسن سے بہتر سمجھتے ہیں اور ہر کوئی جانتا ہے وہ دو عویداروں میں سے صرف ایک ہی زندہ رہ سکتا ہے۔“

”میں ڈرتی ہوں زریں! یہ کہیں مٹی سے اور گواہ چست دلی مثال نہ ہو۔“ زریں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ پانسہ بچینکا۔ ”اگر خانخاناں کو شیرازی کی کارگزاریوں کا علم ہی نہ ہو تو ان باتوں سے کیا حاصل۔۔۔ زندگی ہر کسی کو پیاری ہے۔“

”واو۔۔۔ علم کیسے نہیں۔ بیجاگر کی طرف کوچ کرنے سے پہلے ہی سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ بیگم شیرازی اندھیرے میں تیر چلانے کی عادی نہیں۔“ پھر زریں نے اس آہستگی سے کہ زریں بھی اس کی آواز بمشکل ہی سن سکی کہیا۔

”بیجاگر سے شہزادہ حسن زندہ رہ کر نہیں آئے گا۔ موت اس کے ساتھ روانہ ہو چکی ہے۔“

زرینہ نے اپنی حیرت پر بڑی مشکل سے قابو پایا پھر بولی۔
 ”میں سمجھ نہیں سکی۔“

”کالا ناگ۔۔۔“ زریں کے چہرے پہ نفرت ریگنے لگی۔ اس نے تیز نظروں سے
 زرینہ کی طرف دیکھا۔ ”لیکن یاد رکھو تمہاری زبان بند رہے گی۔“
 ”مجھ پر اعتماد رکھو، بیگم شیرازی کا احسان اس راز سے زیادہ قیمتی ہے۔“

زرینہ کے لہجے میں اعتماد کی جھلک تھی لیکن کالے ناگ کا یہ نیا مصروف جان لینے کے
 بعد اس کا دل سینے کے اندر کسی دھڑکی پر بندے کی طرز پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی یہاں
 سے اڑ کر نکل جائے اور بیگم جہاں کو ان بھیایک خطروں سے آگاہ کر دے جو جان عالم
 کے اس پاس ریگ رہے تھے۔

”اور ہاں۔۔۔۔۔ اب میں تمہارے سینہ کا راز مظلوم کرنا چاہتی ہوں۔ جس کی خاطر بیگم
 جہاں نے تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

زرینہ حیران تھی وہ کتنا جواب دے زریں اور بیگم شیرازی شروع ہی سے اس غلط فہمی
 میں مبتلا تھیں کہ وہ کسی ایسے راز سے واقف ہے جو شہزادہ حسن اور سلطان کے بیٹائی
 خانہاناں کی زندگیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ان تین دنوں کے اندر کسی پر جھوٹ بول کر
 انہیں مطمئن کر سکتی تھی۔ یک لخت زرینہ کا ذہن ایک نئے خطرے کی بوسہ بگھنے لگا اس نے
 سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”زریں! مجھے جو کچھ کہتا ہے بیگم شیرازی کے سامنے ہی کہوں گی۔ تم مجھے بہاراؤ بے
 تکرار کے پاس لے چلو۔“

پھر زحیرے کی فضا پر ایک گہری خاموشی چھا گئی۔



ناگن کی بیٹی

زہر کا شکاری

سرگ قریب نصف کوں لمبی تھی جس کے آخری سرے پر دو غار نما حجرے تھے۔
 زرینہ نے پلٹ کر دیکھا۔ مشعل کی مردہ سی روشنی میں سرگ کسی طویل اڑو سے کی
 طرح منہ کھولے کھڑی تھی۔ کچھ دور تک روشنی کا غبار سا اڑتا نظر آ رہا تھا پھر پتھروں سے
 گھرا ہوا یہ تنگ سا راستہ بتدریج اندھیرے میں گھل مل گیا دور دور دور اس کا وہانہ تاریکی کا
 ایک دھبہ سا بن کے رہ گیا تھا۔

یہاں کسی ان دیکھے رستہ سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی جس سے مشعل کی لوہر تھرانے
 لگی تھی۔

زرینہ نے اعوازہ لگایا۔ یقیناً یہاں سے کوئی بڑا سرار راستہ باہر کھلی فضا میں نکلتا ہو گا
 لیکن سرگ ختم ہونے کے باوجود باہر نکلنے کا کوئی دروازہ، کوئی وہانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔
 غار نما حجروں کی دیواریں بھی پتھروں سے اٹھائی گئی تھیں جن کے چوٹی دروازے
 مردہ ایام کا پتہ دے رہے تھے۔ خواجہ سرا مہر زبیر نے مشعل سرگ کی ایک دیوار کے
 ساتھ ٹانگ دی اور تنگ شیرازی کے اشارہ پر آگے بڑھ کر ایک حجرے کی کھڑکی کھولی دی۔
 روشنی کے ہالہ سے حجرے کی تاریک فضا روشن ہو گئی اور زرینہ کو کچھ عجیب و غریب سی
 آوازیں..... نہیں پھنکار رہی اپنی سماعت سے نکل آتی محسوس ہوئیں۔ پھر ایک ثانیہ کے بعد وہ
 یوں الجھل کر پیچھے ہٹ گئی جیسے اس نے اپنی موت کو دیکھ لیا ہو۔

غار نما حجرے میں سانپ ہی سانپ رہے تھے۔ ایک دو نہیں بیسیوں، ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو بالشت سے لے کر تین تین چار چار تک طویل، مختلف رنگوں میں مختلف قسموں اور مختلف نسلوں کے ساتھ پھینٹر چسکبرے، کوہرے، کنگوڑیے، کروڑیے، انبی اور دومنہ والے سیاہ ناگ خاکی، فیالے، سرخی مائل، لہریے دار اور چکیلے جو حجرے کی دیواروں اور فرش پر جھومتے مل کھاتے ہوئے موت کے سایوں کی مانند لہرا رہے تھے لیکن زیادہ اعداد ان دو بالشتیہ سیاہ ناگوں کی تھی جیسا ناگ پر قتال کے کمرے میں چھوڑا گیا تھا۔

روشنی کو دیکھ کر کئی سانپ کھڑی کی طرف لپکے ایک کالا ناگ اپنا سر باہر نکال کر سپاہی کے نیزے کی طرح جھولنے لگا اور اپنی باریک، سرخ، شعلہ سی زبان بار بار منہ سے نکالنے لگا۔ اسے دیکھتے ہی ڈر کے مارے زریںہ کی ایک چیخ نکل گئی اور وہ سرنگ کی دیوار کے ساتھ لگ گئی دوسرے لمحے بیگم شیرازی کے ہونٹوں سے ایک قہقہہ اعلیٰ پڑا۔

آواز کے اس اثر دھم نے زریںہ کی ڈری ڈری، سبھی سبھی چیخ کو نکل لیا اور وہ انتہائی خوف زدہ لگا ہون سے شیرازی کو دیکھنے لگی۔ وہ بولی۔

”سانپ اور عورت کی دوستی بہت قدیم ہے لیکن تم ڈرو نہیں۔ میرے دشمنوں کے سوا یہ اور کسی کو نہیں ڈرتے۔“

زریںہ کی نگاہیں ابھی تک اس ہر طرف شعلے پر مرکوز تھیں جو سیاہ ناگ کے منہ میں تیر رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بہرے کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

اچانک مہر زریں نے اپنا ہاتھ زریںہ کے کندھے پہ رکھ دیا اور عیا ز خواجہ ہرآنے فوراً یہ محسوس کر لیا کہ وہ بہشت کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ رہی ہے۔

زریںہ کے چہرے پر خوف کے سائے دیکر وہ بے رحم تھے اس نے بیگم شیرازی کی طرف دیکھا پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے شیرازی خود بھی ایک ناگن ہو جس نے اپنی کینٹلی اتار کر عورت کا زہد دھا لیا تھا۔ شیش ناگ کی بیٹی۔

”ابھی تم ایک اور تماشا دیکھو گی۔“

یہ کہہ کر شیرازی نے تالی بجاتی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے حجرے کا دروازہ۔۔۔۔۔

”چوں۔۔۔۔۔ روں۔۔۔۔۔ خرو۔۔۔۔۔“ کی موسیقی بکھیرنا ہوا کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی گھنی داڑھی منچھوں اور الجھے الجھے ہاڈوں والا ایک کبر پہ دست بڑھا اے حیرے سے نکل کر روشنی میں آ

گیا۔ سرنگ میں نکلے ہی اس نے سر جھکا کر شیرازی کو سلام کیا۔

اُس کے چہرے پر کسی گھرے اسرار کے سائے یوں جم سے گئے تھے جیسے وقت کی گردش ختم ہو۔

گھرے بکھرے بے ترتیب پریشان بالوں کے درمیان اس کے خوفناک چہرے پر چیل کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جس طرح ان کے اندر مشعلیں جل رہی ہوں۔ ان آنکھوں کے درمیان لمبی سی ناک جس کی ہڈی ابھری ہوئی تھی آگے سے طوطے کی چونچ کی مانند نیچے مڑ گئی تھی ہونٹ موندے اور بھدے تھے۔ کانوں میں چیل کے بڑسنے بڑسے چلے آویزاں تھے اور گردن میں رنگین پتھروں کا پارہ دائیں شانے پہ ڈھلک کے رہ گیا تھا۔

شکل و شبابت سے بڑھا مشرق کا ایک روایتی جادوگر معلوم ہو رہا تھا لیکن بھیاک اور مضحکہ خیز صورت کی بہ نسبت اُس کی شخصیت زیادہ بڑا اسرار اور حیران کن تھی۔ وہ کون تھا اور اس تاریک سرنگ میں کیا اس کا کام صرف سانپوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا تھا؟

زیرینہ کا ذہن بجانے کہاں کہاں الجھنے لگا۔

عجیب بات تھی۔ بڑا اسرار بڑھے کی شکل دیکھتے ہی وہ سیاہ رنگ جو کھڑکی سے گردن نکالے جھول رہا تھا۔ فوراً اندر دب گیا شاید بڑھے نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سرزنش کی تھی۔

”سونا بابا۔۔۔“ بیگم شیرازی نے زیرینہ کی طرف اٹکی اٹھائی۔ ”یہ لڑکی ہمیں دیکھنے آئی ہے اسے بھی سانپوں سے ڈر ہے۔ کیا تم اپنا ناشتہ کر چکے؟“

سونا بابا نے تیز اور شعلہ بار آنکھوں سے زیرینہ کی طرف دیکھا شاید وہ بیگم شیرازی کا خفیہ اشارہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے اپنے حلق سے ”ہم۔۔۔“ کی آواز نکالی پھر کھڑکی کی طرف مڑ گیا۔

بڑھے جادوگر کے اگلے قدم نے زیرینہ کو حیران و مشدد رسا کر دیا۔

کھڑکی کی چوکھٹ پہ ہاتھ رکھے وہ ایک لمحہ حجرے کے اندر سانپوں کو گھورتا رہا پھر اچھل کر اندر جا رہا۔ اس نے اپنے حلق سے ایک عجیب و غریب چیز اور بانسوں کے جھنڈ میں گزرنے والی ہوا کی سی سرسراہٹ کی آواز نکالی جیسے کوئی اثر دھا پتھکار رہا ہو۔

زیرینہ کے ہونٹوں سے نکلنے والی چیخ ایک سسکی میں تبدیل ہو کے رہ گئی لیکن اس کے

بعد اس کی آنکھوں نے جو دیکھا وہ ناقابل یقین، ناقابل بیان اور ناقابل فراموش تھا۔ اس نے بار بار اپنی پلکیں جھپکائیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا پھر اس کے ہوش و حواس تحلیل سے ہونے لگے۔

اس نے دیکھا..... جونہی بڑھے سوانا نے اپنے حلق سے اڑوہ کی سی پھنکار نکالی۔ جھوٹے لہراتے ہوئے سانپ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اکثر دوڑ کر ان گڑھوں میں لڑھک گئے جو گھوٹوں میں سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے بعض کھڑی دیواریں پہریچتے ہوئے چھت کی طرف لپکے اور برگدی کی جٹاؤں کی طرح جھول گئے۔

وہ سب کے سب یوں ڈر کے بھاگے تھے جیسے وہ سانپ کے بچے نہیں مرغی کے بچے تھے اور اگر بھاگ کر جلد ہی کہیں روپوش نہ ہو گئے تو سوانا جو ”آسانی با“ کی طرح پھنکارتا ہوا جھپٹا تھا ان میں سے کسی نہ کسی کو اپنے منہ میں بچوں میں اچک لے جائے گا۔

سانپ انسان کا اتنی دشمن..... ایک انسان کے وجود سے اس قدر ہراساں اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے گا کہ کم از کم زور سے نہ یہ نسبت ناک نظارہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور اس کے جسم کے اندر بولنے کی قوت شاید ختم ہو چکی تھی کیونکہ اس نظارہ کی وحشت سے اس کے لبوں سے نکلنے والی چیخ فقط ایک سسکاری میں داخل ہو گئی تھی۔

اس نے سانپوں کو موت کے ڈر سے ریچتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن موت بہر حال ان میں سے کسی ایک کا مقدور بن چکی تھی۔

سوانا ایک شیطان کی طرح حجرے کے اندر روشنی کے ہالہ میں کھڑا تھا پھر زور سے اس کی منہ کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”او میرے بیٹا! تم مجھ سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ میں تمہیں زمین کے پیٹ سے بھی نکال لاؤں گا۔ تم میرے منہ کا لقمہ اور میرے پیٹ کا ایدھن ہو۔“

پھر اس نے حجرے کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اس کی آنکھیں مشعلوں کی طرح جھمک رہی تھیں۔ اچانک وہ چھت کی طرف دیکھ کر اچھل پڑا۔

”او چھینے امیرے دوست! آج تم سہی۔“

اس نے چھت کے ساتھ جھپٹتے ہوئے ایک سیاہ ناگ کی طرف انگلی اٹھائی اور فوراً ہی ایک شعلہ سا اس کی طرف لپک گیا۔ سیاہ ناگ کے منہ میں تیرتی ہوئی آگ ہی بڑھے کے

خوناک چہرے پر متعکس ہو رہی تھی۔ اچانک خاموش فضا ایک ہولناک قہقہہ سے سرشار ہو گئی۔
 ”نہیں چھیٹے! تم انکار نہیں کر سکتے۔ ہو ہو ہو۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔ جدھر تمہاری بھونگی گئی
 تمہیں بھی اُدھر ہی جانا ہو گا۔ میں تمہاری آگ سے نہیں ڈرتا یہ تو میری زندگی ہے بس اب
 آ جاؤ۔ ہو ہو ہو۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔“

اور ابھی یہ قہقہہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ بڑھے نے ہاتھ بڑھا کر جھولتے ہوئے سیاہ
 ناگ کو تیزی کے ساتھ کھینچ لیا۔ یہ وہی ناگ تھا جو چند لمحے پیشتر کھڑکی سے سر نکالے جھول
 رہا تھا۔ ایک ساعت کے بعد وہ فضا میں یوں لہرایا جیسے تکا ہوا نیزہ لہراتا ہے مگر دوسرے ہی
 لمحے اس کا سر سوانا کی منہی میں تھا۔

”ہو ہو ہو۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔“

سوانا کا خوناک قہقہہ بھر بلند ہوا جو بکلی کی لہر کی مانند ساری سرنگ میں تیرتا چلا گیا۔
 کالا ناگ بڑھے جادوگر کی کمر کے گرد بل ڈال رہا تھا لیکن وہ بدستور خنس رہا تھا۔
 قہقہہ ہی دیر بعد اس نے اپنی زبان باہر لٹکا کر ناگ کے پھن سے قریب کر دی۔ کالے
 سانپ کے منہ میں آگ کا شعلہ تیزی سے حرکت کرنے لگا پھر اس نے بڑھے کی زبان پہ
 ڈنک مارا اور بے دم سے ہو گیا۔ سوانا نے اپنی کمر سے اس کے بل نکالے اور بڑی بے رحمی
 کے ساتھ زمین پہ پٹخ دیا۔

قصر لالہ کی کینز نے یہ وحشت انگیز، بھیاں بکھیل اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس
 کے ہونٹ بس تھر تھرا کر رہ گئے اس کی قوت گویائی بالکل سلب ہو چکی تھی۔

آن کی آن میں بڑھے سوانا کا چہرہ انگارے کی مانند دکھ اٹھا۔ سیاہ ناگ کا زہر اس
 کے خون میں دوڑنے لگا تھا اور وہ ایک عجیب سی لذت، ایک مانوس سا کیف محسوس کر رہا
 تھا۔ سانپ کا زہر بڑھے جادوگر کی غذا بن چکا تھا۔ جب تک وہ اپنی زبان پر انتہائی زہر بولا،
 سانپ ڈسوائیہ لینا اُسے ممکن نہ آتا تھا۔

غالباً کالے ناگ کے زہر نے اُس کے جسم میں نشے کی تریک پیدا کر دی تھی اُس
 نے غدار آلود آنکھوں سے سیاہ ناگ کی طرف دیکھا جو فرش پر بے سدھ سا پڑا تھا۔ گویا
 بڑھے نے اُس سے زندگی کی جرات چھین لی تھی۔

سوانا نے جبکہ کراسے زمین سے اٹھالیا اور اس کے تیز دانت سانپ کے جسم میں

پوست ہو گئے۔ کالا ناگ تڑپا، کسمسایا مگر فوراً ہی اُس کی جدوجہد ختم ہو گئی۔

بڑھا بڑے مزے سے اس کا جسم ادھیڑ ادھیڑ کر کھائے جا رہا تھا۔

اب زرینہ کو اس سے خوف آنے لگا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی روشنی پہلے سے دوچند ہو

گئی تھی۔ چہرے کا رنگ دیکھتے شطلوں کی طرح چمک رہا تھا اور آنکھوں کے پوٹے بھاری ہو گئے تھے۔ یہ غالباً زہر کے نشہ کا اثر تھا۔

اپنی غذا کھا کر بڑھا سونا حجرے سے باہر آ گیا۔ کھڑکی بند کر دی گئی۔ اب سانپ

اپنی کمین گاہوں سے نکل کر دیواروں اور فرش پہ رینگ سکتے تھے۔ ان کا آقا روزمرہ کا خراج وصول کر کے جا چکا تھا۔

”سب ٹھیک ہے ناسوا بابا!“

”ٹھیک ہے بیگم حضور! میں زہر کا شکاری ہوں۔ میرے پالے ہوئے ناگ اپنا فرض

پیش کرتے ہیں۔“

”ایک ماہ اور انتظار کرنا ہو گا۔“ بیگم شیرازی نے کہا۔

”غلام حکم کا منتظر ہے۔“ بڑھا کمر تک جھک گیا۔

”بس انتظار کرو۔“

یہ کہہ کر بیگم شیرازی مہر زریں کی طرف مڑی۔

”مشعل اٹھاؤ۔۔۔۔۔“

مہر زریں نے اٹھ کر مشعل اٹھائی اور اپنی مالکہ کے آگے آگے بولی۔

شیرازی کی گردن ایک ناگن کی مانند تھی ہوئی تھی اور اس کی رفتار میں قدیم مصر کی ان

شہزادیوں کا ساحر انگیز وقار تھا۔ جن کے ایک اشارے پر سینکڑوں سرِ قلم ہو جاتے تھے۔

ریشمی قبائل کھائے ہوئے سانپ کی طرح اُس کی پشت پر لہرا رہی تھی۔

زرینہ طلسم زدہ انسان کی مانند چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلتی گئی۔ سرگ میں ان

کے قدموں کی چاپ یوں ابھر رہی تھی۔ جیسے نسا میں کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہوں۔

شیرازی کی کہانی

”ایک ماہ بعد۔۔۔۔۔ ٹھیک ایک ماہ کے بعد جب پہاڑوں کے تنگ و تاریک غاروں

میں ریگنے اور زمین کی چھاتی چاٹنے والے سانپ اپنی کھینچی اتار دیں گے۔ فیروز آباد اور گلبرگہ کے محلوں میں حکومت کا پانسہ الٹ دیا جائے۔
کئی بیگمات کالے زیر کا لقمہ بن جائیں گی۔۔۔

بوڑھی چوہیا بیگم جہاں علیہ خانم زمین چاٹتی ہوئی ٹرپ کر مرے گی۔۔۔ اور چرم دوز اس کے جسم کی سخت کھال کھینچ کر میرے پاؤں کی جوتی تیار کریں گے۔ سرخ گھبرائی بیگم جس نے ایک سانپ کو جنم دیا ہے میرے پاؤں پہ سر رکھ کے رحم کی بھیک مانگے گی لیکن زمین پر ان کی قبروں کا نشان بھی نہیں ملے گا۔

اور یہ سنار زاوی مدگل کی مغزیہ پر تھال جسے کسی آشرم میں دیو داسی بن کر ناپتا اور پردہت پہاریوں کے تاریک کمروں میں فانوس روشن کرنا تھے۔ بھئی کو شکس سراؤں میں کیا لینے چلی آئی ہے؟ اس نے اپنی گردن میں ریشم کی ڈوری کیوں پہن لی؟

کیا وہ اس غلط فہمی میں جلا ہے کہ اُس کا سحر جمال بے وقوف شہزادے کی طرح دوسرے لوگوں کو بھی مسحور کر دے گا اور وہ سرداروں کی گردنیں ناپتی ہوئی دکن کے اُس تخت پر جا بیٹھے گی جو شیرازی کی میراث ہے لیکن یہ اس لڑکی اتنا نہیں جانتی۔ شہزادہ حسن کے سر بیجاگر کی فتح کا سہرا باندھنے والے اس کی لاش پر ماتم کرتے ہوئے لوٹیں گے اور یہ نوجوان ساحرہ اپنے پریم کے آخری درشن بھی نہ کر پائے گی۔ اس کی تمنائیں جوان ہونے سے پہلے ہی خسروں کا سفید کنن پہن لیں گی اور وہ خود کسی کالی رات میں سیاہ ناگ کی خوراک بن جائے گی۔

”سنو لای! دکن کی سرزمین ایک انوکھے انقلاب سے دو چار ہونے والی ہے۔ محلوں اور کوٹک سراؤں پر زیر۔ بے سانپ لٹکیں گے۔ فیصلہ سے باہر خوں آشام نکواریں جگمگائیں گی اور میسوں سڑکات کر نیروں پر لٹکا دیئے جائیں گے پھر دکن کا تخت نئے وارث کے قدم چومے گا اور شیرازی۔۔۔ جو آج سلطان فیروز شاہ کی ایک کنیز خاص کے سوا اور کچھ نہیں۔۔۔ جس پر بھلائی کی بوڑھی کیسا بیگم جہاں اپنے حکم نافذ کرتی ہے۔ نگلی نکواریوں کی چھاؤں میں چلتی ہوئی دربار خاص کو رونق بخشنے گی اور وہ لوگ انجام و اکرام پائیں گے جو اس کے حق وراثت کی خاطر خطروں سے کھیلے رہے۔

بوڑھا سلطان جس نے میرے عزیزوں کو نکواری کا لقمہ بنایا اور حکومت چھین لی تھی بہت

دن جی لیا لیکن اب اُس کی کتاب زندگی کا آخری ورق باقی ہے جو بچانگر سے لوٹنے ہی اپنے انجام کو پہنچ جائے گی اور اس کا شیر دل بھائی احمد خاں خاناناں صرف اس لئے زمرہ رہے گا کہ میری طرح وہ بھی شہزادہ حسن سے نفرت کرتا ہے اس نے میرے سوچے ہوئے انقلاب کو بدے عمل لانے کے لئے میری امداد کی ہے۔ وہ صرف یہ سمجھتا ہے میں اس کو دکن کے تخت پر بٹھانے کی خاطر سازش کے خاکے بنا رہی ہوں۔ فیروز شاہ نے اس کے حقوق فراہم کر کے شہزادہ حسن کے سر پر دلی عہد کا تاج رکھا ہے اور سلطان کی غلطی احمد خاں کو مشغول کرنے کے لئے کافی ہے۔ میں نے اُس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور انقلاب کے بعد اس کے لئے صدر جہاں کا عہدہ محفوظ رکھا ہے۔ اگر اُس نے وقاداری دکھائی تو ممکن ہے میں اس کے ساتھ شادی بھی کر لوں۔ وہ بہادر ہے اور اس کی تلواریں اپنے دشمنوں کا خون بہاتے ہیں۔ وہ بیچ نہیں کرتی لیکن اُس نے بھی اگر سرکشی دکھائی تو سونا بابا کی سیاہ اولاد اُس کی خواب گاہ میں رینگ جائے گی۔

حیرت سے تہاڑے چہرے کا رنگ یوں اُڑ گیا ہے جیسے موت کے فرشتے نے تمہارا ہاتھ پکڑ لیا ہو شاید تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔ لیکن یاد رکھو میرے سوچے ہوئے کھیل کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب اس نئے سفر تبدیل نہیں کئے جاسکتے۔ اس ایک ماہ کے اندر احمد کی تمام زندہ انسانوں کی فہرست سے خارج کر دیے جائیں گے۔ میں اپنے دشمنوں کے لئے موت کے علاوہ کوئی حکم نافذ نہیں کروں گی۔ لوگ قید خانوں سے واپس آ سکتے ہیں لیکن قبروں سے نہیں۔ میرے سینے کے اندر ایسا دل دھڑک رہا ہے جو میرے بزرگوں کے جہدم سے دوئم ہے اور اُسے اس وقت تک قرار نہیں آئے گا۔ جب تک میں دشمنوں کے خون سے اپنی پیاس نہیں بجھا لیتی۔ میرا پیانہ میرے دشمن کی ٹھونڈی کی طرح خالی ہو چکا ہے۔ اب میں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی۔ میں نے کئی سال تک خون کے گھونٹ پئے اور اپنے بزرگوں کی روجوں کو انتقام کا یقین دلایا ہے۔ یہ جذبہ انتقام ہی تھا جو مجھے برادری وادی سے گلبرگہ کی محل سرائیں میں لایا اور میں نے سلطان کے دل پر اپنی محبت کا چرکہ لگایا۔ اب میں اپنے دشمنوں کی موت کے حکم نامے صادر کر دوں گی۔

تم حیران ہو۔ میں جو ایک کمزور گورت ہوں۔ ایک ایسی حکومت کا تختہ کس طرح الٹ سکوں گی جس کی ہیبت سے پورا ہندوستان لرزتا ہے۔ جس کا سلطان بچانگر ایسی طاقتور

سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا دعویٰ کرنا ہے لیکن تم عورت کو کزور حقیر نہ سمجھو۔ عورت وہ طاقت ہے جو شیر مردوں کو جنم دیتی اور انہیں اپنی چھاتیوں کا دودھ پلاتی ہے۔ وہ اگر طاقت سے نہیں تو فریب سے مردوں کی ہر قوت کو اپنے پاؤں پر جھکا لیتی ہے۔ ہاں وہ عورت ہی تھی جس نے ازل میں مرد پر فتح پائی اور سانپ کو اپنا ہراز بنا لیا تھا۔ آج وہ سانپ شیرازی کے محرم و دمساز ہیں اور ان کا زہر مرد کی ہر قوت کو ڈس لینے کے لئے کافی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں میرے پاس سوانا بابا کی اولاد کے سوا اور کوئی طاقت نہیں۔ تم تلکمانہ کے ان بہادروں کو نہیں جانتی جو سلطان کے سیاہ پرچم کے نیچے لڑتے ہیں جن کی باگ دراصل میرے ہاتھ میں ہے۔ ان کا سردار داؤد خاں ہمارا شک خوار ہے اور سلطان کی مراجعت کے بعد جو نئی شاہی محل سرا کا نقشہ بدل گیا داؤد باہر کے مہرے تبدیل کر دے گا اور خانخاناں پر یہ راز اس وقت افشا ہو گا جب میں بہ نفس نفیس تخت پر جلوہ افروز ہو کر اُس کے نئے عہدے اور اعزاز کا اعلان کروں گی۔ وہ جانتا ہے بادشاہوں کی معمولی سی غلطی قیامت آفریں انقلاب کا پیش خیمہ بن جلیا کرتی ہے لیکن فوج کی کمان داؤد خاں کے ہاتھ میں آ جانے کے بعد خانخاناں کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہے گا کہ وہ میرے بچنے ہوئے اعزاز کو قبول کرے یا پھر اُس کا سر بھی نیزے پر چڑھ جائے گا لیکن یقین جانو! مجھے اس کے مرنے کا افسوس ہو گا تم عورت ہو اس لئے اس صدمہ کی وجہ بخوبی سمجھ سکتی ہو۔ ہاں میں اُسے پسند کرتی ہوں لیکن تمہارا چہرہ بتا رہا ہے تمہیں یہ بات تسلیم کرنے میں شاید تذبذب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کو اپنے دل کے راز بتا دینے پر مجبور ہے۔ نجانے اس کے دل کی دھڑکنوں کو زبان کہاں سے خطا ہو جاتی ہے۔ اب تم کچھ مطمئن نظر آنے لگی ہو۔ ہاں مجھے محبت کے اقبال جرم میں ایک لذت محسوس ہو رہی ہے لیکن اگر خانخاناں نے میری محبت ٹھکرا دی۔ مجھے ٹھکرا دیا تو یقین رکھو محبت کی تاریخ میں ایک خوریز باب کا اضافہ ہو گا لیکن یہ باتیں اس وقت کرنے کی نہیں۔

اور تمہاری آنکھوں میں یہ غما سوال کیوں ابھر آیا ہے؟ آخر تمہاری حیرت کس دروازے پہ جا کر ختم ہو گی تاکہ میں اس کے پتہ پھینکوں اچھا لو میں تمہیں یہ قصہ بھی سنائے دیتی ہوں۔

آج سے کئی سال پیش جب میں گلبرگہ میں اپنی ماں کی چھاتیوں کا دودھ پینا اور قصر شامی کے قالینوں پر ابھی گھٹنوں کے بل چلنا بھی نہیں سیکھی تھی۔ وہ نوجوان صدر جہاں کی سفارش اور اس عیار بڑھیا بیگم جہاں کی وساطت سے قصر میں داخل ہوئے۔ یہ دونوں سلطان داؤد شاہ چیمپی کے بیٹے تھے جنہیں باپ کی وفات کے بعد گلبرگہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا اور میرے ماموں تخت پر جلوہ آرا ہو کر سلطان داؤد شاہ کی ان کوتاہیوں اور لغزشوں کا ازالہ کر رہے تھے جن سے دکن کی سلطنت کمزور ہو چکی تھی۔ میرے ماموں سلطان کی حکومت کیسی تھی؟ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی کیونکہ اس وقت میری عمر دو اڑھائی سال سے زیادہ نہ تھی مگر سلطنت کے بعض بدخواہ میرے ماموں کے خلاف اندر ہی اندر سازش کر رہے تھے اس لئے سلطان معظم نے حکم دے رکھا تھا۔ داؤد شاہ کے دونوں بیٹے گلبرگہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ چاہتے تو ان لڑکوں کے سر بھی قلم کرا سکتے تھے لیکن میں نے سنا ہے میرے ماموں خلد آشتیانی کشت و خون کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی یہی کمزوری ایک روز انقلاب کا پیشانیہ بن گئی۔

لڑکی.....! غور سے سنی جاوے۔ میں اپنے عظیم بزرگوں کی روح کی قسم کھا کر یقین دلاتی ہوں۔ میں نے اپنے خاندان کی بیانی و بادی کا جو افسانہ اسے لفظ بلفظ بیان کر رہی ہوں یہی تو وہ آگ ہے جو سالہا سال سے میرے سینے میں بھڑک رہی ہے اور اب شاید خون کے چھینٹے اسے سرد کر سکیں۔

دیکھو! میں اُن شہزادوں کا ذکر کر رہی تھیں جو صدر جہاں کی سفارش اور بیگم جہاں کی خاص کوششوں سے قصر سلطان میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ عذر پیش کیا تھا وہ اپنے چچا سلطان حضور کو دیکھنے اور اُن کے نیاز حاصل کرنے آئے ہیں غالباً سلطان کو یہ اطلاع بھی دینی گئی تھی کہ غریب الدیار شہزادے اپنے ذہن سے کلزانی کے خیالات محو کر چکے ہیں اور صرف سلطان کی نگاہ کرم کے امیدوار ہیں یہی وجہ تھی میرے ماموں نے انہیں گلبرگہ میں ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔

اُن کی تمناؤں کے گلشن ویران ہو چکے تھے۔ لیکن میرے ماموں حضور اُن سے غافل بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ بس شرط یہ قرار پائی تھی۔ سلطان سے ملاقات اور اپنے عزیزوں کے ملنے کے بعد جو بدستور گلبرگہ میں کہیں غربت و افلاس کی زندگی بسر کرنے لگے

تھے وہ اپنے مسکن کو لوٹ جائیں گے۔

میں تے سنا ہے جب دونوں بھائی گلبرگہ میں داخل ہوئے۔ اُن کے بدن پر معمولی سے کپڑے تھے۔ اُن کے چہروں پر حسرت و یاس کے لرزتے ہوئے سائے اُن کے تختہ داڑیوں کا افسانہ دہرا رہے تھے۔ سنا ہے انہوں نے زندگی کے لئے درد کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ جن لوگوں نے گلبرگہ کے شاہی محلات میں انہیں پر تکلف پالنے جھوسلتے ہوئے دیکھا تھا وہ ان کی اس بے بسی پر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور سوچے گئے اُن کی گلبرگہ میں آمد و صورتوں سے خالی نہیں یا تو سلطان ان بد بخت شہزادوں کے حال پر رحم کھا کر ان پر بخشش و عنایت کرے گا یا اُس نے انہیں قتل کر دینے کے لئے دھوکا سے بلایا ہے۔

نجاتے لوگ خیالات کی کن وادیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور بد نصیب شہزادوں کے متعلق کیسی کیسی باتیں سوچنے لگے تھے لیکن تقدیر الگ تھلگ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ قسمت اُن کا ہاتھ پکڑ کر ایک نامعلوم منزل کی طرف لئے جا رہی تھی۔ وہ تباہ اور بے ہتھیار تھے۔ جب قصر لالہ میں داخل ہوئے اس وقت سلطان عالی چند ایک مشیروں کے ہمراہ قصر کا زینہ اتر رہے تھے۔ بڑھا وکیل سلطنت تعارف کی خاطر بد قسمت شہزادوں کے ہمراہ تھا۔ گردش ایام نے ان میں شہزادگی کی کوئی علامت باقی نہ رہنے دی تھی جب انہوں نے سلطان کو اس وسیع و عریض کمرے میں آتے دیکھا جہاں زینہ ختم ہوتا تھا تو دونوں ایک بلند ستون کے پاس رک گئے مگر انہوں نے تعظیم کے لئے سر نہیں جھکائے نہ کورنش کی رسم ادا کی اس پر سب لوگ متحیر رہ گئے۔

سلطان نے قریب آ کر پوچھا۔

”یہ کون گستاخ ہیں جنہیں مابدولت کی حاضری کے آداب کی بھی پروا نہیں۔“
بڑے بھائی نے قہر آلود نگاہوں سے سلطان کی طرف دیکھا اور پک کر وکیل سلطنت کی میان سے تلوار کھینچ لی پھر وہ ایک بھیڑیے کی طرح غراتا ہوا سلطان کی طرف بڑھا اور ایک ہی وار میں اس کا سر قلم کر دیا۔ جن کے پاس تلواres تھیں وہ بھی دل کھول کر مقابلہ نہ کر سکے اور چند ہی لمحوں میں ڈھیر ہو گئے۔

چھوٹے بھائی نے زینہ کی طرف کسی کو بلا جانے ہی نہیں دیا جو پہرے دار سلطان کی حفاظت کے لئے بھاگتے ہوئے آئے انہیں بھی زندگی کی بازی ہار دینا پڑی۔

بڑا بھائی خون میں ڈوبی ہوئی تلوار سونت کر سلطان کی لاش کے سر ہانے چا کھڑا ہوا۔
جو خون میں لت پت پڑی تھی اور خون کا آواز میں دھاڑا۔

”ہم تے اپنے باپ کے قاتل کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے اُس سانپ کا سر کھل دیا جو ہمارے جنت مکانی باپ کے تخت پر پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ حکومت اپنے اصل وارث کے پاس لوٹ آئی ہے۔ اب صدر جہاں کو بلاؤ وہ ہماری بادشاہت کا اعلان کرے۔“

”لڑکی! تم یہ سن کر حیران رہ جاؤ گی۔ یہ نوجوان جس نے سلطان کو اُس کے لیے تخت و قعر میں ذبح کر ڈالا تھا فیروز شاہ تھا جو ”سکندر ثانی“ اور ”مردوز افروز“ کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا اور اس وقت ہم سب کا آقا ہے اور اس کا چھوٹا بھائی احمد خاں تھا جو آج امیر الامراء اور خاندانوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

صرف دو بھائیوں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور میرے ماموں کو ایک بھیڑ کی طرز پر ذبح کر ڈالا تھا۔

نائب تم یہ بھی سننا چاہو گی۔ اس کے بعد کیا؟ میں تمہیں اپنی بدعتی اور کم نصیبی کی پوری داستان بتاؤں گی۔ یہ الق لیلا کا انسانہ نہیں وہ کہانی ہے جو میرے اپنے ساتھ پیش آئی۔ غلام بھاگے بھاگے گئے اور صدر جہاں نے فیروز شاہ کے ساتھ جھک کر شاہی آداب کے مطابق کورٹس کی رسم ادا کی۔ گویا اُس نے داؤد شاہ بھٹی کے بیٹے کو سلطان دکن تسلیم لیا۔ جب محل کے خدام، غلاموں، کینروں اور خواجہ سراؤں نے صدر جہاں کو ایک اچھٹا نوجوان کے سامنے جھکے دیکھا جس کے کپڑوں سے انجی سڑکی مگر بھی دور نہیں ہوئی تھی اور جو خون آشام تلوار لے سلطان کی لاش کے سر ہانے کھڑا تھا تو نئے سلطان کی تعظیم میں اس کے سر بھی خود بخود جھک گئے۔

صدر جہاں وکیل سلطنت اور چکر پراتنے مصاحبین کی موجودگی میں فیروز شاہ حکومت کا اعلان کر دیا گیا۔

بعد کے بعد فیروز شاہ وہی خون آلود تلوار تھامے جس پر بے گناہ سلطان کا لہو جم تھا۔ کی طرح غراتا اور وراتا ہوا قعر کے اندر داخل ہوا لیکن اس کے اوپر آئے۔ پہلے ہی سلطان کے قتل کی خبر کینروں اور خواجہ سراؤں نے آسنائی تھی اور محل سراہ کبرام پچا ہو چکا تھا۔ چیخوں، تسکیوں اور آہ و بکا سے گلبرگہ کا قعر سلطانی ماتم کدہ

تبدیل ہو گیا تھا۔ ہر طرف خوف و ہراس اور وحشت کے سائے لرزے لگے تھے۔ فیروز شاہ کی کھنچی ہوئی تلوار کا خوف موت کی خشک لہر بن کر جسموں میں دوڑ رہا تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا کون مرے گا کون بچے گا۔

میری ماں کا قصر بڑی بیگم کے قصر سے ملحق تھا۔ صاف ظاہر تھا۔ فیروز شاہ سلطان کی بہنوں، بیگمات اور فرزندوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ سب کے چرے پر موت کی زردیاں کھنڈ گئی تھیں۔ بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن قصر سلطانی کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے اور میری ماں جس کی تقدیر نے ایک پلک جھپکنے کے عرصہ میں آنکھیں پھیر لی تھیں۔ موت کے خوف سے لرزہ بر اندام کھڑی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کریں، کہاں جائیں، کدھر جائیں؟

ماں نے مجھے اٹھا کر اپنے سینے سے چٹا لیا۔ وہ ڈرتی تھی کہیں فیروز شاہ کی تلوار اس کی نینھی اور معصوم بچی کا لبو نہ چاٹ لے۔ میری ماں کو چونکہ سلطان مرحوم کے حراج میں بڑا دخل رہا تھا اس لئے ظاہر ہے نیا حکمران اپنے دشمن کی اُس بہن کو زندہ کیسے چھوڑ دے گا جس نے داؤد شاہ کی اولاد کے متعلق سب سے پہلے جلا وطنی کا مشورہ دیا تھا لیکن ماں کو شاید اپنی بہ نسبت میری زیادہ فکر تھی۔ اُس نے ایک خواجہ سرا سے کہا۔ تم اس بچی کو لے کر نکل جاؤ۔ میرے ساتھ جو کچھ بیٹے کی برداشت کر لوں گی۔“

لیکن اسی لمحے محل کے تمام خادموں بالخصوص خواجہ سراؤں کو فیروز شاہ کے حضور میں طلب کر لیا گیا اور میری ماں میری بے کسی اور اپنی بے کسی پر آنسوؤں کے ہار پر دتی رہ گئی۔ نجانے زندگی اُس روز کہاں روپوش ہو گئی تھی لیکن عین اسی لمحے مملکت کا دیوان اور ماموں مرحوم کا ایک خاص معتمد بھاگ بھاگ قصر میں داخل ہوا اور میری ماں کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”میرے ساتھ آؤ..... میں نے بھاگ نکلنے کا بندوبست کر لیا ہے۔“

میری ماں مجھے چھاتی سے لپٹائے دیوانہ وار دیوان کے ساتھ چلی اور وہ دونوں بھاگتے ہوئے فیصل پر آ گئے مابراہیک غلام دو گھوڑے لئے کھڑا تھا۔ سوال صرف یہ تھا اتنی بلندی سے اگر چھانک لگائی جائے تو ہڈیاں ٹک چور ہو جائیں گے۔ اندیشہ تھا پھر سب سے بڑی پریشانی تھیں۔ کبھی کسی جان نسی لیکن دیوان نے واقعی فراخ کا پورا اور مکمل بندوبست کیا

تھا۔ اُس نے فیصل کے کنگورے کے ساتھ ایک رسر بائدھا اُس میں ایک ٹوکرا اس طرح بائدھا کہ کسی طرح جھولنے کا اندیشہ نہ رہے پھر مجھے اس ٹوکرے میں رکھ کر نیچے لٹکا دیا۔ غلام نے مجھے تمام لیا اور دیوان نے پھر رسر اوپر کھینچ لیا۔ پھر میری ماں اسی ٹوکرے میں بیٹھ کر نیچے آئی۔ اس کے بعد دیوان رسر کی مدد سے فیصل پر پاؤں ٹکاتا ہوا نیچے اترا وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر گلبرگہ سے باہر آئے اور ہوا ہو گئے اس طرف جدھر قسمت انہیں ہانک کر لے گئی۔

شاید میں نے ابھی یہ نہیں بتایا۔۔۔ میں ماں کے پیٹ ہی میں تھی کہ باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ دیوان میرے مرحوم باپ کا دوست اور ماموں سلطان کا خاص معتمد تھا۔ وہ دکن کے اُس ہندو خاندان سے تھا جس نے ہمیشہ سلطان کی خدمت مگروری کی تھی اس لئے اُسے دیوان کے عہدے پر مقرر کیا گیا تھا۔

دیوان نے جہاں فرار کا مکمل انتظام کیا تھا وہاں وہ اشرافیوں کے چند توڑے بھی ہمراہ لانا نہیں بھولا تھا۔ یہ مختصر سا قافلہ دن رات چلتا رہا اور آخر پرار کی ایک سرائے میں آکرا۔ تئیر و مقبوت کے متعلق وہ تمام انڈیشے درست ثابت ہوئے جن کے ذرے وہ گلبرگہ سے بھاگ آئے تھے۔ فیروز شاہ نے محل ہزا میں قتل عام نہیں کیا۔ صرف چند خاص خاص افراد کو مار کے گھاٹ اترے البتہ دیوان اور میری والدہ کی تلاش شروع ہو گئی۔ نئے سلطان نے حکم دیا انہیں زندہ یا مردہ میرے حضور میں پیش کیا جائے۔

اب کسی سرائے میں رہتا اپنی زندگی سے جو کھیلنے والی بات تھی۔ دیوان نے مجھے گود میں اٹھایا اور میری ماں کو ساتھ لے کر شہر سے دور اُن پہاڑی غاروں میں آچھپا جہاں چھاڑیوں اور درختوں کا ایک جنگل آباد تھا۔ انہی پہاڑوں پر قریب ہی ایک چشمہ مل گیا۔ کھانے پینے کا سامان شہر ہی سے گھوڑوں پر لا دیا گیا تھا اور یوں موت کے ذرے وہ پہاڑی غار ہزارا سکھ بن گئے جدھر انسانوں کا گزر نہیں ہوتا۔

میری ماں کی تلاش ابھی تک جاری تھی جسے فیروز شاہ کے دربار سے "سیاہ ناگن" کا خطاب دیا گیا تھا۔ سلطان کے سپاہی اگرچہ یو سو کھینے والے کتوں کی طرح گھومتے اور ڈھونڈتے رہے لیکن انہیں ماں کا سراغ نہ مل سکا۔

وہ پہاڑی زندگی کسی تھی اور اس میں تین جانوں کو کیسی کیسی تکلیفوں اور مصیبتوں کا

سامنا کرنا پڑا؟ شاید میں اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ بیان نہیں کر سکتی لیکن جب میں نے ہوش سنبھالا تو میری عمر سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور میں بوڑھے دیوان کے ہمراہ برار کے ایک گاؤں میں زندگی گزار رہی تھی۔ ماں کو ایک پہاڑی ناگ نے ڈس لیا تھا اور زہر کی تاب نہ لا کر وہ انہی پہاڑی غاروں میں فوت ہو گئی تھی جہاں دیوان بابا کے بقول ہم نے پورے چار سال دنیا کی آنکھوں سے چھپ کر گزار دیئے تھے۔ انہی غاروں میں میری ماں کی قبر آج بھی خاموشی کی زبان سے اُس بیباک اور پر مصائب زندگی کی کہانی بیان کر رہی ہے۔ میرے ذہن پر اُس زندگی کی کچھ ہلکی ہلکی پرچھائیاں سی ضرور تیرتی پھرتی ہیں مگر گاؤں کا زمانہ تو اچھی طرح یاد ہے۔ میرا ایک ایک لہو اپنی ماں کی یاد میں بسر ہوتا تھا۔۔۔ آخر سسکیاں بھرتی اور ہچکیاں لیتی میں جوان ہو گئی۔ مجھے سلطان فیروز شاہ کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو اس نے ماں کے متعلق کہے تھے۔

”سیاہ ناگن۔۔۔“

اور میں نے عہد کر لیا اب ناگن ہی بن کر اپنے بزرگوں کا انتقام لوں گی اور اپنی روح کی پیاس بجھاؤں گی یا اس کوشش میں اپنی جان دے دوں گی۔

میں نے دیوان بابا سے اپنے اس عزم کا اظہار کیا۔ اس کے سینہ کے اندر بھی وقت کی راکھ میں انتقام کی دلی ہولی چنگاریاں سلگ اٹھیں۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔

”شیرازی بیٹی! اگرچہ وقت نے مجھے بڑھا کر دیا ہے۔ میرے سب ہتھیار چھین لئے ہیں اور میں بالکل بے دست و پا ہو چکا ہوں پھر بھی میں ترے ترکش کا تیر ہوں۔ تو مجھے چلائے گی تو سیدہ حائشانہ پریشوں گا۔“

”تیر دنگوار کی بات نہیں بابا! کیا تم بھول گئے۔ میں ایک ناگن کی بیٹی ہوں۔ سیاہ ناگن بس میں سانپ کے زہر سے انتقام لوں گی۔ تیر خطا ہو سکتا ہے۔ تلوکار کا وار چوک سکتا ہے لیکن سانپ کا زہر انسان کو کڑوٹ بھی نہیں لینے دیتا۔“

پھر دیوان بابا سیرابن گیا۔ وہ سانپ پکڑنے میں اس قدر طاق ہو گیا کہ زہریلے ناگ اُس سے ڈرنے لگے حتیٰ کہ خود کو بھی زہرناک بنانے کے لئے اُس نے سانپ کھانے شروع کر دیئے۔ کیا تم نے سرگ میں سوانا بابا کو اپنی زبان پر ناگ ڈالتے اور پھر اُسے اوجیر اوجیر کر کھاتے نہیں دیکھا۔۔۔ وہ دیوان ہی تھا جو مجھے گلبرگہ کے شاہی محل سے لے کر

بھاگا پھر فیروز شاہ کی کوشک سراؤں تک رسائی حاصل کرنے کا سوال تھا لیکن یہ اس طرح ہوا کہ دو سال پہلے جب سلطان اپنے دست خیاض کے ساتھ برادر کی طرف جا رہا تھا۔ اسے ایک مدمی کنارے ایک حسین و جوان لادارٹ لڑکی ملی۔ جس کے حسن و شباب نے سلطان کو دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ اس ساحرہ جمال کو اپنی کینز خاص بنا کر گلبرگہ لے آیا تھا۔ وہ میں ہی تھی۔ شیرازی.....“

اور اب تم انھی طرح سمجھ گئی ہوگی۔ سرنگ میں وہ سانپوں کے جگرے کیسے ہیں۔ سوانا بابا کون ہے۔ میں کون ہوں؟

میں جانتی ہوں فیروز شاہ میرے ماموں کو قتل کرنے میں حق بجانب تھا کیونکہ اُس نے تخت حکومت وراثت میں نہیں، چھین کر حاصل کیا تھا اور جب اس کے اصل وارث کا داؤ چل گیا اُس نے بھی اُسی طرح چھین لیا لیکن میری مظلوم ماں نے کیا گناہ کیا تھا۔ وہ پہاڑوں اور چاروں میں زندگی کے پیچھے بھاگتی رہی اور آخر سیاہ ناگ کا لقمہ بن گئی؟ اب ننگین کی بیٹی اپنی ماں کا اپنے ماموں کا، اپنے اس خاندان کا جو تباہ و برباد ہو چکا..... انتقام کیوں نہ لے؟ فیروز شاہ جوان تھا اُس نے کلوار سے ایک سلطان کا کٹا اور حق وصول کر لیا میں ایک عورت ہوں۔ کلوار کا کام سناب کے زہر سے لڑائی کی اور بلا سے دکن کے تخت پر میرا حق نہ سہی لیکن میں ملکہ ہوں گی اور ہر اُس شے کو فنا کر دوں گی جو میرے راستہ میں آئے گی۔ میں سانپوں کی شہزادی ہوں۔ زہر کی پکاراں اور خوب جانتی ہوں سوانا بابا کی اولاد مجھ سے بے وقافتی نہیں کرے گی۔

اب جب تم میری داستان سن چکی ہو۔ میں نے اب تک جو کچھ کیا اور جو کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ سب تم پر واضح ظاہر ہو چکا سوا اب تم اپنے متعلق بھی میرا فیصلہ سن لو۔ سلطان جب بیجا نگر کی مہم سے لوٹے گا۔ اس وقت تمہیں اس کے سامنے اپنی زندگی کا بہترین رقص کرنا ہو گا۔ میں جانتی ہوں وہ تمہیں عزیز رکھتا اور قصر لالہ میں تمہارا رقص دیکھ کر محفوظ ہوا کرتا ہے لیکن پچھلے رقص اور اس رقص میں ایک فرق ہو گا۔ پہلے تمہارے پاؤں کی ہر جنبش اُسے زندگی کا ایک کیف بخشی رہی ہے لیکن یہ رقص اس کے جسم سے زندگی کی آخری رقص بھی چھین لے گا۔ کیسے؟

یہ تمہیں سوانا بابا بتائے گا..... بہر حال میں اتنا جانتی ہوں۔ وہ موت کا رقص ہو گا۔

بابا نہیں کھادے گا۔ اگر تم یہ رقص کرنے میں کامیاب رہیں تو میں تمہیں عوں دیتی ہوں مگر میرے ساتھ تخت پر نہ بیٹھ سکیں تو داؤد خان کے پہلو میں ضرور بیٹھو گی۔ جو اس وقت احمد خاں کی طرح خانخاناں کا رتبہ پا چکا ہوگا۔

نہیں یہ قوف لڑکی! اس میں ڈرنے یا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ ہو گا۔ کھیل کا کوئی سطر تبدیل نہیں ہو سکتا اور تم پر بھی کوئی حرف نہیں آئے گا۔ بس کل سے تم سونا بابا کے پاس رقص سیکھنے جاؤ گی۔ موت کا رقص کیا خبر سلطان کب لوٹ آئے بس تمہیں صرف رقص کرنا ہے۔ جس میں وہ کھو جائے کم ہو جائے۔ ناگ تو میں ہی چھوڑ دوں گی۔"

ایک اور سازش

ذریعہ کے دل میں ایک طوفان پھا تھا۔

کبھی کبھی وہ سوچتی۔ شاید وہ الف لیلہ کے ابو الحسن کی طرح سوتے جاگتے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ گزشتہ چند روز میں اُس کے ساتھ جو واقعات پیش آ رہے تھے۔ وہ الف لیلہ ہی کی طرح پراسرار اور حیرت افزا تھے۔

کہیں وہ بھی کوئی بھیاک خواب ہی تو نہیں دیکھ رہی؟ یہ سوچ کر جب وہ اُن واقعات کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی جو خوابوں کے سے کہہ رے کی طرح اُس کے دماغ کے حاشیوں پر تھر تھراتے پھرتے تھے تو وہ زیادہ خوفناک اور لرزہ خیز لگتی اختیار کر کے ہوتوں کی طرح اس کی نگاہوں کے عشق میں رقص کرنے لگتے اور ایک چیخ اس کے ہونٹوں پہ دم توڑ کے رہ جاتی۔۔۔۔۔ وہ جس قدر غور کرتی، واقعات کی پراسرارونچیں اتنی ہی سفاکی کے ساتھ اس کے پاؤں میں جھنجھٹا اٹھتیں۔ اس کے جسم کی ہڈیاں کڑکڑانے لگتیں اور ذہن کے نغصے نغصے درپچوں اور سوراخوں میں جادو کی بیسیوں پیلچیریاں سلگ جاتیں جن کی تڑ تڑاتی ہوئی سفید و دھیالی روشنی کی لہریں اُس کے شعور کو کم مہم سی کر دیتیں۔ بچانے یہ سب کیا تھا۔ فیروز آباد میں آکر وہ کن طلسمی خیالوں میں الجھ گئی ہے۔ مگر جیسے یہ خواب نہ تھا۔ فیروز آباد کے حالات اس کے دیکھے بھالے تھے یہاں کی کوشک سراؤں کا ایک ایک قصر اور ایک ایک کمرہ اُس کا جانا بوجھا تھا۔ وہ اپنی آقا بیگم علیہ خانم کے ساتھ پہلے بھی کئی مرتبہ یہاں آ چکی تھی اور نگہبر کی طرح فیروز آباد کے اہوانوں کا ہر تہہ اُس کے پاؤں سے

ماؤں تھا لیکن قصر شیرازی کے ایک تاریک حجرے سے نکلنے والی وہ پراسرار سرنگ اس کے ذہن پر ایک طلسمی لکیر کی مانند جم کے رہ گئی تھی۔ جس کے حجروں میں اس نے سونا بابا کے سانپ دیکھے تھے۔ تو کیا شیرازی اور مہر زریں کے علاوہ کوئی بھی اس سرنگ کے مجید سے آشنا نہیں؟ اور یہ شیرازی جو دو سال پہلے صرف ایک کینیز بن کر بھنی کو شکس سراؤں میں آئی تھی آج بیگموں کی طرح نہ صرف شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہے بلکہ ایک بھیا تک انتساب کے خواب بھی دیکھنے لگی ہے۔ کیا سچ سچ وہ اس شاہی خاندان کی یادگار ہے جس نے ایک خوفناک سازش کر کے سلطان واؤ و شاہ بھنی کو قتل کیا اور حکومت چھین لی تھی؟

ہوگی۔۔۔۔۔ اس کی بلا سے لیکن اُسے دکن کے تخت و تاراج سے کیا واسطہ وہ بھنی میراث پہ کیا حق رکھتی ہے؟ فیروز شاہ نے ہزور شمشیر اپنے جنت مکانی باپ کی وراثت حاصل کی تھی لیکن یہ ناگن بھنی حشمت کو پھر دس لینا چاہتی ہے۔ دکن کے امن کو زہر کا لقمہ بنانے کی خواہش رکھتی ہے۔

وہ اپنے ننھے آفرین حسن و شباب کی بدولت ایک کینیز سے نیلم کا درجہ حاصل کر چکی ہے اُسے سلطان عالی کے حراج میں بھی بڑا دخل ہے اور اس کے جمال جہاں آرا نے سلطان کے دل وہ دماغ پر جادو سا کر رکھا ہے لیکن کیا عورت اتنی حسن کش بھی ہو سکتی ہے کہ جس شخص نے اُسے ہمار کی ایک گزرگاہ سے اٹھا کر بھنی مملات میں لا بٹھایا اسے کینیزوں، غلاموں اور خولہ سراؤں پر حکومت بخشی اور نیلم کے معزز لقب سے سرفراز کیا وہ اسی کو ڈسنے پر آمادہ ہو گئی؟ کیا عورت کا دوسرا نام واقعی فریب ہے؟

وہ عورت۔۔۔۔۔ جو جنت کے فرشتوں کی ایک معصوم اور پاکیزہ مسکراہٹ کے ظہیر سے تیار کی گئی تھی۔ کیا شیطان کی تمناؤں کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے؟ کیا عورت اور سانپ کا برشتہ ازل سے ہے؟

زرینہ کا ذہن جھنجھٹا اٹھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ کی نیس شدید کھینچاؤ سے ترک جائیں گی اور اس کی شریانوں میں دوڑانے والا خون یلکھت منجمد ہو کر رو جائے گا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکا عورت پیکر وفا ہے۔ وہ فرشتوں کا مجسم اور حوروں کا تقدس ہے۔ وہ انسان کے ذہن کا ایک کیف آفریں خواب ہے اس کی تعبیر اتنی

بھیا تک اور جہنم خیز نہیں ہو سکتی۔ میں شیرازی کو دکن کا امن تباہ نہ کرنے دوں گی۔ اس کا حسن کبھی محلات میں موت کا کھیل نہیں کھیل سکتا۔ اس کے جہنمی خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکیں گے۔ وہ عورت کے چہرے پر بیوفائی کی کالک نہیں مل سکتی۔“ زربینہ کے دل و دماغ میں ایک ساتھ وقاداری اور آقا پرستی کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا شاید اُسے دکن کی سرزمین سے محبت تھی اور وہ اپنے دیس کی مٹی کو انسانوں کے خون سے آلودہ نہ ہونے دینا چاہتی تھی یا پھر شیرازی کی بے وفائی نے اس کے جذبات مشتعل کر دیئے تھے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا لیکن اس کی نگاہوں کے سامنے ابھی تک سینکڑوں سیاہ خیالے اور نیلے پیلے سانپ لہرا رہے تھے اُس کے ذہن کے گوشہ گوشہ سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں اور بنیوں کا خون نہایت تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگا تھا جیسے اُس کے جسم کے اندر آگ دہکانے والی دھوئیں لگی ہو۔

وہ چاہتی تھی جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے نکل کر قصر الالہ میں جائے اور بیگم جہاں کو اُس بھیا تک سازش سے آگاہ کرے جو قصر شیرازی کے تاریک حجرہوں میں موت کی طرح رینگ رہی تھی۔ سلطان کی زندگی تو ابھی محفوظ تھی۔ نہ جانے بیجا نگر سے کب واپسی ہو اور کب شیرازی انہیں زہر کا لقمہ بنائے لیکن شہزادہ حسن کے ارد گرد ضرور موت کے سائے ناچ رہے ہونگے۔ شیرازی کے بقول ولی عہد کی موت اُس کے ساتھ ہی روانہ کر دی گئی تھی اور وہ وہی زہر ملا ناگ تھا جو سوانا بابا کے حجرے سے روانہ کیا گیا تھا۔

زربینہ کو ایک ایک لمحہ ایک ایک سال کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کی معمولی سی غفلت ہولناک تباہی کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ لیکن وہ قصر شیرازی سے نکل بھی کس طرح سکتی تھی۔ مہر زویں آٹھوں چیز نہایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھیں حتیٰ کہ رات کو سونے کے وقت بھی جب تک وہ فیکہ کی بجائیاں نہ لینے لگتی وہ امن کا ساتھ نہ چھوڑتی تھی پھر کل سے اُس کے حجرے کے باہر دو غلام بھی نظر آنے لگے تھے جو سادی سادی رات ”کھوں کھوں“ کرتے اور نساوارتھو کتے رہتے تھے۔ زربینہ نے محسوس کیا۔ اس کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

تو پھر اب وہ کیا کرے؟

بیگم جہاں تک کیسے پہنچے۔۔۔ شہزادہ حسن کو موت کے منہ سے کس طرح نکالے؟ اگر

زیادہ دیر ہو گئی تو سوانا بابا کے بیچے ہوئے کالے ناگ اُسے ضرور ڈس لیس کے اور پھر بچانگر کے ولی عہد کا جنازہ ہی لوٹے گا۔۔۔ اُف خدایا! وہ اس تصور ہی سے تڑپ اُٹھی۔

اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دونوں محافظ غلام گردش کے ستونوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ادگھ رہے تھے لیکن ذرا سی آہٹ پر بلی کی طرح چوکنے ہو جاتے۔۔۔ پرے بیگم شیرازی کے کمرے میں قانونوں کی روشنی درپچوں اور غرفوں سے جھانک رہی تھی۔ شاید وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔

زرینہ کو قصر شیرازی میں آئے چوتھا روز تھا۔ دو دن وہ سوانا بابا کی حاضری بھی دے چکی تھی۔ مہر زریں اس کے ساتھ ہی جاتی تھی۔ سواناتے اُسے ایک نئے رقص کی تربیت دینا شروع کر دی تھی۔ لیکن زرینہ محسوس کر رہی تھی شیرازی رقص کے علاوہ اُس سے کوئی اور خطرناک کام لینا چاہتی ہے۔ وہ کام کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے متعلق وہ ابھی تک اندھیرے میں تھی البتہ مہر زریں کی باتوں سے اُسے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ زرینہ کو عبادت کی رات ایک اہم خدمت سر انجام دینا ہوگی اور وہ ”اہم خدمت“ رقص نہیں ہو سکتی تھی۔ سوانا اُسے ”خبر رقص“ سکھا رہا تھا اُسے رقص کے دوران اپنے خیر کئی کے سینہ میں اتارنا ہوں گے؟ وہ سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی اور سوچنے لگی یہ شیرازی کس قدر خوشنودار عورت ہے لیکن وہ عورت کب ہے وہ تو اپنے آپ کو ناگن کی بیٹی کہتی ہے۔ وہ ناگن ہی تو ہے۔

زرینہ نے ابھی تک اپنی کسی حرکت سے بھی شبہ کا اظہار نہ ہونے دیا تھا اور شیرازی اس بات پر خوش تھی کہ محل کی ایک معتد کینز جو سلطان کے کمرہ خاص میں بھی جاسکتی تھی اس کے ساتھ شریک ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود عیاز خواجہ مزاریں ایک سماعت کے لئے بھی اسے تباہ چھوڑتی تھی۔۔۔۔۔ اُسے صرف چند لمحوں کی ضرورت تھی بس وہ قصر لالہ تک ہو آئے اور پل بھر کے لئے بیگم جہاں سے مل سکے مگر زریں کی موجودگی میں چند لمحوں کی فرصت اور علیحدگی بھی مشکل ہی نظر آتی تھی اور ادھر جوں جوں وقت گزر رہا تھا زرینہ کے سینہ پر جیسے سانپ لوٹ رہے تھے۔



چوتھا روز۔۔۔۔۔ چوتھی رات

اور یہ رات بھی زرینہ نے کروٹیں لیتے ہی کاٹ دی۔

صبح جونہی پہرے دار غلام ہوئے۔ مہر زریں روز کی طرح چپھاتی اور تھمے بکھرتی ہوئی حجرے میں آدھنگی پھر چدری لٹھوں کے بعد وہ دونوں سرگم میں داخل ہو رہی تھیں لیکن چلتے چلتے اچانک زرینہ نے محسوس کیا سرگم میں وہ تنہا ہی چل رہی ہے۔ مہر زریں کے قدموں کی چاپ شاید کہیں پیچھے ہی ڈوب کر رہ گئی تھی وہ سرگم کی پتھر لی دیوار کے ساتھ لگ کر اندھیرے میں اس کے پاؤں کی آہٹ سننے لگی لیکن سرگم گہرے سکوت اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور دور دور تک کوئی چاپ، کوئی آہٹ، کوئی دھک بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تاریکی میں ایک پراسرار خاموشی ہو کر رہی تھی۔ زرینہ کو یوں معلوم ہوا جیسے یہ گہری خاموشی اس کے خلاف کوئی خطرناک سازش کر رہی ہو۔ اس احساس کے ساتھ ہی سینے کے اندر اس کا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ اپنے خوف پر قابو پانے کے لئے اس نے سرگم کی آواز میں آواز دی۔

”مہر زریں!“

لیکن یہ سرگم اس کے آس پاس ہی سک کے رہ گئی۔

”مہر زریں! تم کہاں ہو؟“

اس مرتبہ اس کی سہمی ہوئی آواز اندھیری سرگم میں سانپ کی طرح رینگتی ہوئی چلی گئی۔ یگانگت وہ کسی خطرے کے احساس سے لرز اٹھی۔ اسے خیال آیا۔ شاید مہر زریں سرگم میں داخل ہی نہیں ہوئی اور دہانہ ہی سے یا تو لوٹ گئی تھی یا کسی پراسرار طاقت نے اس کا گلا دیوبچ کیا تھا اور وہ اپنے حلق سے آواز تک نہ نکال سکی تھی۔

پتھر لی دیوار کی ٹنگی اس کی کمر میں سرائت کرتی جا رہی تھی شاید یہ خوف کی لہر تھی جو اس تاریک اور سنسنی انگیز میں تنہائی کے خوف سے پیدا ہوا تھا۔ اس کا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سردی کے باوجود ماتھے پر پسینہ پانی تیر رہی تھی۔ مہر زریں کا اچانک غم ہو جانا ایک معما تھا جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور وہ ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکی تھی اسے اب کیا کرن ہے۔

اگر تاریک حجرے کا وہ راستہ بھی بند کر دیا گیا جس کا زینہ اتر کر وہ سرگم کے دہانے میں داخل ہوئی تھی تو وہ ایسی تاریک اور کلبے نما میں سسک سسک کر مر جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے جسم پر ہزاروں چوہنیاں کی ریگٹے لگیں۔ کہیں مہر زریں نے اس

کو ہلاک کر دینے کی نہ سوجی ہو ورنہ وہ خود کہاں غائب ہو گئی؟

کیا اُسے واپس جانا چاہیے؟

لیکن پھر خود بخود اُس کے قدم سوانا بابا کے حجروں کی طرف اٹھنے لگے وہ معلوم کرنا چاہتی تھی آیا سرنگ کا دہانہ بدستور بند ہے یا.....

اندھیرے میں دیوار کا سہارا لئے وہ ہولے ہولے چلتی رہی۔ سرنگ کم و بیش نصف کوں تک طویل تھی اور محض سمت سے اُس نے اندازہ لگایا تھا اس کا درمیان سراسر آجھورہ ندی کے کنارے کھلنا چاہیے کیونکہ قلعہ کی فصیل سے جنوبی سمت۔ آجھورہ ندی کوئی نصف پون کوں ہی کے فاصلہ پر تھی۔

اندھیرے میں وہ کوئی آہٹ بھی پیدا نہیں کر رہی تھی۔ یہ اُس کے دل کا خوف ہی تھا جس نے اس کے قدموں میں بلی کی سی نرمی اور آہستگی پیدا کر دی تھی ایک سحر زدہ انسان کی مانند چلتی ہوئی آخر کار سوانا کے حجروں کے قریب پہنچ کر رک گئی اور خوف اس کے دل میں سانپ کے پھین کی طرح سر اٹھا کر قبضہ کرنے لگا۔ ایک لمحہ دیوار کے ساتھ لگی وہ کسی آہٹ یا آواز کا انتظار کرنے لگی لیکن معلوم ہوتا تھا ان حجروں پر بھی جیسے سکوت مرگ طاری تھا۔ ساری سرنگ ایک ٹھنڈی اور گہری جھاوٹھی میں لپٹی ہوئی تھی البتہ سانپوں والے حجرہ سے کبھی کبھار چمکا رہی سی ضرور سنائی دیتی تھیں جو اس تاریک سنانے میں خوف کی لہریں پیدا کر رہی تھیں۔

زیرینہ ہولے ہولے سوانا کے حجرے کی طرف کھسکنے لگی۔ اچانک اُسے اندر سے سرگوشی کی آواز سنائی دی۔ مہم، پُر اسرار اور خوفناک سرگوشی..... زیرینہ بنے دروازہ کے ساتھ کان لگا دیئے جس کے چوٹی بہت ٹھن سے بھیڑ دیئے گئے تھے۔ سوانا بابا کسی کے ساتھ جہم آواز میں گفتگو کر رہا تھا جسے سرگوشی ہی کہا جاسکتا تھا۔ پہلے تو زیرینہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا پھر آہستہ آہستہ وہ الفاظ اور ان کا مفہوم سمجھنے لگی۔ سوانا کہہ رہا تھا۔

”بس غم نہ سنبھالیں راج محل تک پہنچا دو راجہا رانی چندر کلانیہ ابھی دیکھتے ہی سمجھ جائے گی۔“

”لیکن بابا! تمہیں اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔ تم ایک خوفناک جوا کھیل رہے ہو..... اگر بات الٹ ہو گئی تو.....“

سوانا نے غصیلے لہجہ میں اپنے مخاطب کی بات کاٹ دی۔

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ اس وقت صرف پانچ سات ہزار سپاہی پورے فیروز آباد پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ محلات کے اندر جو کچھ ہو گا اُسے میں سنبھال لوں گا۔ بیگم شیرازی میرے اشاروں پہ ناچ رہی ہے۔ وہ خود فیروز شاہ کو لٹکانے لگا دینا چاہتی ہے۔ لیکن اگر اس نے میرا راستہ روکا تو کالا ناگ اسے بھی ڈس لے گا۔ بس اب زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

جس قدر جلد ہو سکے تم یہ پیغام راج محل تک پہنچا دو میں صرف سات روز تک انتظار کروں گا۔ اگر اس عرصہ میں مدد نہ پہنچی تو میں سمجھ لوں گا مہاراج خود کسی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہیں پھر شاید مجھے فیروز شاہ بھگنی کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے۔ تم خود سوچو! اس وقت جب فیروز آباد میں تین چار ہزار سے زیادہ فوج نہیں اور قلعہ اور محلات کا ہر دروازہ میرے ہاتھ کی ایک ضرب سے کھل سکتا ہے۔ اس شہر پر قبضہ کرنا کیا مشکل ہے؟

اگر مہاراج ذرا امت سے کام لیں اور مجھ پر دشواری کریں تو میں بھگنی حکومت کا تختہ الٹ سکتا ہوں اور اس سے جب دکن کے تمام لشکر بھاگ کر کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ ہمارے لئے میدان بالکل خالی ہے بس مہاراج پانچ سات ہزار سوار بھیج دیں باقی میں خود سنبھال لوں گا اور پھر دکن کی سر زمین پر بھی رائے رلیاں کا زور دے پھر ریل لہلائے گا۔ میں مہاراج سے صرف اپنی خدمت کا صلہ چاہتا ہوں لیکن اس وقت باتوں کا وقت نہیں۔ بس تم فوراً بھاگ کر کی طرف روانہ ہو جاؤ اور میرا یہ خط راج کمار کی تک پہنچا دو۔ میں سننے اس میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ وہ خود ہی سمجھ جائیں گے۔"

سوانا نے ایک لمبا سانس لیا اور اُس کا مخاطب جسے اس نے "رائے" کے نام سے پکارا تھا شاید یہ تقریر سننے کے بعد مطمئن ہو گیا تھا کیونکہ پھر اُس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ "تمہیں اب روانہ ہو جانا چاہیے۔" سوانا کہنے لگا۔ "وہ بد معاش خلیجہ سرا لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر آئے ہی والی ہے۔ میں نہیں چاہتا تمہیں دیکھ سکے۔"

پھر ان کے اٹھنے کی آواز آئی اور زریہ نہایت تیزی کے ساتھ سائیوں والے بھرے کی ادھ میں ہو گئی۔ اُس کا بدن ٹھٹھ سے پسینے سے جھپک گیا تھا اور ایک نئی سازش نے جسے اس کے دل کو کسی تکصراحی میں بند کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دروازہ کے پٹ

کھلے اور وہ دونوں اندھیرے میں سرگ کے اندر ایک طرف کوڑھ گئے۔

”جہارا گھوڑا کالی تیز رفتار ہے۔۔۔ اگر تم چاہو تو آج شام تک بیجا نگر پہنچ سکتے ہو۔“

”نہیں۔۔۔ سلطانی لشکروں نے بیجا نگر کو گھیر لیا ہے۔ مجھے ایک لمبا چکر کاٹ کر جانا ہو

گا پھر بھی میں پو پھنٹے سے پہلے ہی اپنی منزل پہ پہنچ جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر سوانا نے ایک تھیلی پیش کی۔ ”یہ راستے کا خرچ“ شاید رشوت ہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے اس نے سرگ کی دیوار پر ابھرے ہوئے ایک کیل کو دبایا اور دہانے کا پتھر

کسی گزرگاہ کے بغیر ایک طرف کو سرک گیا اور سرگ میں اتنا غلابیدا ہو گیا کہ اُس میں

سے ایک آدمی بخوبی گزر سکتا تھا۔ رائے نہایت تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ سوانا نے

دیوار کا کیل اوپر گھمایا خلا پھر بند ہو گیا اور پتھر پھر دہانے پر یوں جم گیا کہ ایک چھوٹی سی

درز بھی نظر نہیں آتی تھی۔ سوانا اپنے حجرے میں پلٹ آیا۔ اُس نے اندر سے دروازے کی

کنڈی جڑھائی اور شاید زریں کا انتظار کرنے لگا۔

زریہ نے نہ صرف سوانا کی گفتگو سن لی تھی بلکہ دیوار کی اوٹ سے اُس کو دیوار کی

کیل گھماتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ جس سے دہانے پہ رکھا ہوا پتھر یوں سرک گیا تھا جیسے

وہ ہلکی پھلکی لکڑی کا ایک تختہ تھا۔

اب وہ ہر قیمت پر اس بڑے اسرار سرگ سے باہر نکلنا چاہتی تھی جس کے اندھروں میں

نت نئی سازشیں جنم لیتی تھیں۔ پہلے اُس نے شیرازی ہی کو خطرناک سمجھا تھا لیکن اب سوانا

پاپا اُسے شیرازی سے بھی زیادہ بھیا تک اور خوفناک معلوم ہو رہا تھا جو دکن کی سرزمین پر

دیورائے کے منحوس اقتدار کے لئے تانے بانے بن رہا تھا اور اس مقصد کی خاطر شیرازی کو

بھی ٹھکانے لگا دینے پر تیار تھا جسے اُس نے پالا اور اپنی گود میں کھلا کر جوان کیا تھا۔ وہ دکن

میں ”دیوبان“ کے عہدے پہ رہ چکا تھا اور اب حالات کو ایک نئی کر دت لیتے دیکھ کر اُس

کے دل میں ہوس اقتدار کا شعلہ پھر بھڑک اٹھا تھا۔ اس وقت زریہ کے سارے جسم پر ایک

جھنڈی سی اسپکھاہٹ چاری تھی۔ وہ ملی ایسے نرم قدموں کے ساتھ بغیر کوئی آہٹ پیدا کئے

ہوئے ہوئے رہنے لگی پھر اندھیرے میں اس کا ہاتھ کیل پہ جا پڑا جسے اس نے بڑی آہستگی

کے ساتھ دبا دیا۔ کوئی آواز نہ کھٹکا پیدا کئے بغیر دہانے کا پتھر سرک گیا اور زریہ ایک کر خلا

سے باہر آ گئی، لیکن باہر آتے ہی وہ پتھر کو کھٹکا کر دہانے پر رکھنا نہیں بھولی وہاں پتھر بند ہو

گیا تھا۔ ذریعہ اس وقت ایک تنگ و تاریک سے عمار میں کھڑی تھی۔ جس پر کریری
جھاڑیاں سایہ کٹاں تھیں۔ جب وہ عمار سے باہر نکلی تو چھوڑ دی اُس کے قدموں کے
نیچے بہہ رہی تھی۔

اپنا منہ لپیٹ کر وہ تیز تر قدموں کے ساتھ قلعہ کے دروازے کی طرف چل دی جو
یہاں سے ایک ڈیڑھ کوس سے کم فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ اڑ کر قصر لالہ میں پہنچ جانا چاہتی تھی۔
پورے پانچ روز کے بعد اُسے آزادی نصیب ہوئی تھی لیکن ان دنوں میں اُس نے جو کچھ
دیکھا جو کچھ سنا وہ ناقابل یقین اور ناقابل اعتمادی معلوم ہوتا تھا۔ بالکل کسی جادوگر کے
کھیل کی مانند، حیرت انگیز اور ہوشربا لیکن یہ کوئی جادو اور طلسم نہیں تھا۔ دکن اور بھٹی
سلطنت کے خلاف بیک وقت دو سازشیں دریا کے بھنور کی طرح اندر ہی اندر نہایت تیزی
کے ساتھ گردش کر رہی تھیں جیسے بجلی کے پاٹ گھومتے ہیں۔ جب وہ عمار سے کافی دور ہو
آئی تو اُس نے قلعہ کی فصیل پر سیاہ پرچم کو پھڑ پھڑاتے دیکھا۔ اچانک اس کے قدم رک
گئے وہ چھوڑ دی عمار کے کنارے کھڑی ہو کر فصیل پر لہراتے ہوئے پرچم کو دیکھنے لگی اس کے
ہونٹ مل رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔

”اے دکن! میرے پیارے دلس! جس کی خاک میں میرے بزرگوں کے جسم ابدی
نہیں سو رہے ہیں۔ مجھے تیرے ذرے ذرے سے پیار ہے۔ تو ہمیشہ بہاروں کی مانند شکستہ
اور سرسبز رہا ہے اور تو نے اپنے بیٹوں کو زندگی کی توانائی بخشی ہے لیکن آج تیری چھاتی پہ
زمین کے کٹڑے ریگنے لگے ہیں۔ سانپ اور انسان مل کر تجھے دس لینا چاہتے ہیں۔ انہوں
نے کئی سال سے اپنے چھن میں زہر کی پرورش کی ہے اور اب وہی زہر تیرے حلق میں پکا
دینا چاہتے ہیں دو تیری حسین فضاؤں کو سموم کرنے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے
بزرگوں کی قسم! جو تیرے آغوش میں محو خواب ہیں۔ میں تیری شاہاب فضاؤں کو سموم نہ
ہونے دوں گی۔ میں تیری خاک پر تیرے فرزندوں کا بے گناہ لہو نہ کرنے دوں گی۔“

”اے دکن! تو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں اپنی جان دے کر بھی تیرے
اس کی حفاظت کروں گی۔ تیرے سیاہ پرچم اسی طرح لہراتے رہیں اور تیرے بھادر اپنے
کون گھوڑوں کی پشت پر بیٹھے اسی طرح تیرے دشمنوں کو پامال کر رہے رہیں۔ تو سدا
شاہد رہے۔ تو ہمیشہ آباد رہے۔“

یہ کہہ کر زرینہ نے ایک مرتبہ پھر فیصل کے بلند دروازے پر پھڑپھڑاتے ہوئے سیاہ پرچم کو دیکھا اور تیز تیز قدموں کے ساتھ چلنے لگی۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ قلعے کا دروازہ عبور کر کے محلات کی طرف جاری تھی مگر جوئی اُس نے پائیں باغ کا راستہ کاٹ کر قصر لالہ کا رخ کیا اسے مہندی کی بازھ کے پاس مہر زریں نظر آئی جو انہی دو غلاموں کے ساتھ باغ میں جاری تھی جو زرینہ کے حجرے کے باہر بیہرہ دیا کرتے تھے اچانک اس کا ماتھا ٹھنکا کہیں وہ اُسے ہی تلاش نہ کر رہی ہو؟

زرینہ لپک کر دیوار کی اوٹ میں ہو گئی اور ہولے ہولے قصر لالہ کی طرف کھسکنے لگی۔ جب وہ دروازے میں داخل ہوئی تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا پھر وہ طویل غلام گردشوں میں لپکتی چلی گئی۔

بیگم جہاں اپنے کمرے ہی میں تھی اور پر تھاں اُس کی پالتو بلی کو دودھ پلا رہی تھی۔ زرینہ کو دیکھتے ہی دونوں چونک اٹھیں۔ اسے آداب شاہی کے مطابق کورٹش کی رسم ادا کرنا بھی یاد نہ رہی اور وہ بھاگتی ہوئی بیگم جہاں کے قدموں میں گر پڑی۔

”ارے زری۔۔۔ تو۔۔۔ ہم تو تیرے لئے ریشمان تھے۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہیں اُس کتیا شیرازی نے تجھے مروا ہی نہ ڈالا ہو۔ آخر تو اتنے دن کہاں غائب رہی؟“

”بیگم حضور! میں مری گئی ہوتی تو اچھا تھا۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ مجھے آپ سے ملنے کے لئے زندہ رہنا چاہیے تھا۔۔۔“

بیگم جہاں نے اُس کا سر اٹھایا تو آنسو اُس کے رخساروں پہ بہہ رہے تھے۔

”مگر تو رونے کیوں لگی۔ کیا ہوا ہے تجھے؟“

”میرے منہ میں خاک علیہ خام! میرے دل میں شعلے دھپک رہے ہیں۔ میں سانپوں کے منہ سے نکل کر آئی ہوں۔ سارا ملک خطرہ میں ہے کل سحائی خطرہ میں ہیں دلی عہد خطرے میں ہیں، سارے فیروز آباد پر سانپ چھوڑ دیئے جائیں گے۔“

بیگم جہاں اور پر تھاں تحیر نگاہوں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ کہیں زرینہ پاگل تو نہیں ہو گئی۔

”جنہیں بیگم حضور! میں دیوانی نہیں ہوں۔ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آپ کو اطلاع دینے آئی

ہوں۔۔۔ میرے پاس وقت بہت ہی کم ہے۔“ آنسو ابھی تک اس کی آنکھوں میں لڑکھڑا رہے تھے۔

”تو کیا سنا ہے تو نے۔۔۔“

پھر جب زرینہ نے روتے روتے وہ تمام حیرت انگیز اور پراسرار واقعات بیان کئے جو اسے قصر شیرازی میں پیش آئے تھے تو بیگم جہاں اور پرتھالی دونوں ہی پتھر کی مورتیاں بن گئیں۔ اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی ہی رہ گئیں جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔

”بیگم حضور!“ زرینہ گلوگیر آواز میں کہنے لگی۔ ”خدا کے لئے ولی عہد کو بچائیے۔ اُن کی زندگی خطرے میں ہے۔ میں کئی دن سے آپ کو ملنے اور خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے بے تاب تھی۔ لیکن وہ شیطان مہر زریں سایہ کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی۔ اس وقت بھی شاید وہ پائیں باغ میں مجھے ہی ڈھونڈتی پھر رہی ہے لیکن میں واپس جاؤں گی اور اپنی جان پر کھیل کر بھی سلطان معظم کی حفاظت کروں گی۔“

”ہاں تمہیں جانا ہی چاہیے۔“ بیگم جہاں نے پرجوش لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن زری! اب تجھے جان پر کھیلنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ سلطان کی واپسی سے پہلے ہی اس ناگن کا سر کچل دیا جائے گا۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ قصر شیرازی میں آج ہی تمہاری حفاظت کا انتظام ہو جائے گا۔“

جب بیگم جہاں نے پرتھالی کی طرف دیکھا تو کانپ اٹھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح ہو رہی تھیں اور بدن پر لرزہ طاری تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے خون کی تیزی سے اس کا جسم پھٹ جائے گا۔

”باتو!“ بیگم نے کھپکپاتی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا لیکن پرتھالی یوں گم سم تھی جیسے وہ یہاں موجود ہی نہیں تھی۔ واقعی اس وقت وہ قصر لالہ میں نہیں تھی، فیروز آباد میں تھی، وکن میں نہیں تھی، بلکہ دریائے مدھ کے اُس پار بھانگر کی بلند فسیل سے باہر پہاڑی نیلوں میں بھٹک رہی تھی۔ اچانک اس کے لپٹوں کو جنبش ہوئی شاید وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔



تشویش انگیز خبریں

نیا فیصلہ

بھانگر کے ارد گرد پھیلا ہوا سلسلہ ہائے کوہ جو اس کے لئے قدرتی حصار کا کام دے رہا تھا۔ اس وقت بھی لشکروں کا مسکن بن گیا تھا۔
 سیاہ پرچوں نے تین اطراف سے شہر کو گھیر لیا تھا۔
 بھیز پئے اپنے اپنے محب میں جیسے غار ہے تھے اور اپنے شکار پر جھپٹنے سے پہلے وہ حسب عادت اپنی کلیاں چکانے لگے تھے۔ بھانگر کے پہاڑی بھیریوں کے بھٹ بنے تھے اور ان کی خوفناک غراہوں کی بازگشت اس بلند و عجیب فصیل سے ٹکرا رہی تھی۔ جس کے آہنی دروازے پر ”راسے رایاں“ کا زرد پھریا پیغام رسان لہوڑ کی طرح بھڑ پھڑا رہا تھا مگر فصیل کے دروازے بند تھے اور اس طرح کرناٹک کا سودا مہاراج زخمی سانپ کی مانند سچ و تاب کھا رہا تھا۔

”ہم فیروز شاہ کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔“
 راج محل کے ایوانوں میں جو سنگ آخر سے تعمیر کئے گئے تھے دیوارائے کی زخمی آوازوں دور تک گونجتی چلی گئی اور در و دیوار پر ایک زلزلہ سا طاری ہو گیا۔
 ادھر پہاڑی غاروں میں بھیریوں کی غراہٹ ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی..... انہیں رو کر اپنے شکار پر غصہ آ رہا تھا جو فصیلوں کے پیچھے ڈبک گیا تھا۔ اس کے سردار نے کہا۔
 ”ہم دیوارائے کو زخمیوں میں جکڑا ہوا اپنے حضور میں دیکھنا چاہتے ہیں۔“

دونوں حریف ایک دوسرے کے متعلق ایک ہی فیصلہ رکھتے تھے۔
 ”زعمہ گرفتاری۔۔۔“

پہاڑی عماروں میں دشمن کی تاک میں بیٹھے ہوئے بھیڑیے ایک ساتھ غرائے۔
 ”حملہ“ شاید وہ محاصرہ کی بے جوش و خروش زندگی سے تنگ آ گئے تھے اور ہر قیمت پر لپٹنے
 شکار پر جھپٹنا چاہتے تھے جو چالاک لومڑی کی طرح شہر میں دبکا بیٹھا تھا۔ چمردہ سب کے
 سب اپنے سردار بھیڑیے کے بھٹ میں جمع ہوئے دشمن کی سرزمین پر وہ زیادہ عرصہ تک
 نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ انہیں جلد سے جلد اپنے ملک کو لوٹ جانا تھا۔

محاصرہ کے ساتویں دن کا کپکپاتا ہوا بخشی سورج اونچے نیچے ٹیلوں کی اوٹ میں
 غروب ہو چکا تھا اور بھیا تک رات بچا مگر کے ارد گرد دُشمنی مگر مچھوں کی طرح سیار رہی تھی۔
 پہاڑی سے ہٹ کر ایک وسیع میدان کے وسط میں جہاں چاروں طرف سپاہیوں کی
 چھوڑا ریاں تھیں۔ سلطان دکن کی سفری بارگاہ اپنی منقش قاتوں، گنبد نما خیموں اور
 سرسراتے ہوئے ریشمی پردوں کے ساتھ سب سے ممتاز و منفرد نظر آ رہی تھی۔ اس کے
 دروازوں پر لوسے کی سلاخوں کے ساتھ بندی ہوئی مشعلیں فروزاں تھیں جن کی تھر تھرتی
 ہوئی روشنی میں ارگو خان کے چاق و چوبند مسلح سپاہی لیے لیے بھالے اٹھائے آہستہ آہستہ
 چل رہے تھے۔ سفری بارگاہ سے چند ہی قدم کے فاصلے پر اصطبل تھا جس میں صرف خاصہ
 کے گھوڑے نہنہا رہے تھے۔

سات روز کے محاصرہ کے بعد سلطان نے اپنے فوجی سرداروں کی مجلس مشاورت
 طلب کر لی تھی۔ اس وقت امیر فضل اللہ، شہزادہ حسن، خانخاں احمد اور گو خان، کوسل زارے
 قباچہ، فولاد خاں، سیتانی شمشیر خاں، داؤد خاں، (جو امیر فضل اللہ کے لشکر برار کا نائب سالار
 تھا) میاں بندھو، سر فوجی پیاوہ فوج کا سالار اور دوسرے سرکردہ امیر سرداراں، علما اور عامل
 حلقان کی بارگاہ میں حاضر تھے جن کی رائے پر وہ اعتماد کرتا تھا۔ ہشیار عین الملک اور بیدار
 نظام الملک اپنی روایتی مستعدی اور پوری ہوشیاری و بیداری کے ساتھ سلطان کے رائے
 بائیں بیٹھے تھے جو پہلے سے کچھ زیادہ نگر مند نظر آ رہا تھا۔

وہ سب قریباً ایک ہی پر سے بیٹھے جھلا اور غرار رہے تھے اور ابھی تک کسی فیصلہ کن مرحلہ
 پر نہیں پہنچ سکے تھے۔

ظاہر تھا بھئی سلطان بیجا نگر کو فتح کئے بغیر ملنے والا نہیں تھا لیکن رائے رایاں کا شہر ایک ناقابلِ تغیر قلعہ بن گیا تھا اور اس کی بلند و بالا فصیل جیسے سیسہ کچھلائی ہوئی دیوار میں منتقل ہوتی جا رہی تھی۔ دیوارے کو اسی فصیل پر غرور و ناز تھا وہ جانتا تھا۔ فصیل و فصیل گھرے ہوئے اس شہر کو فتح کرنا کم از کم انسانی طاقت سے ضرور باہر ہے مگر سلطان نہ صرف شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کی قسم کھا کر آیا تھا بلکہ اس کا سب سے بڑا مقصد دیوارے کو پایہ سلاسلِ دکن لے جانا تھا۔

بھئی لشکروں نے شہر کو تین اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ صرف جنوب مشرق کی ایک سمت کھلی تھی اور اسی طرف سے دیوارے نے کرناٹک کے دوسرے قلعوں کے ساتھ نام و پیام اور رسد کا سلسلہ قائم رکھا تھا۔

سب سردار یکجا چاہتے تھے بیجا نگر پر تین اطراف ہی سے ایک بھر پور حملہ کر کے انجام خدا پر چھوڑ دیا جائے لیکن سلطان نے اس مشورہ سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ وہ سر جھکائے کسی گھڑی گزرتی منہمک تھا اور اس کے ساتھ ہی بارگاہ پر سناٹا سا چھا گیا تھا۔ وہ سب کے سب محاصرے سے قریباً اس بجائے تھے اور کوئی فیصلہ کن ہنگامہ چاہتے تھے۔ جو ہندی کی اس پرسکون اور خاموش حالت کو بکسر بدل ڈالے۔

”اس مرتبہ فصیل کو توڑ کر قسمت آزمائی کی جائے کلن سہانی!“

اچانک ارگو خاں کی بھاری آواز نے خاموشی کا سیہ بھاڑ دیا۔

”تیرا عازدوں کی حفاظت میں سرگ لگانے والے فصیل کو پاش پاش کر سکتے ہیں۔“

ارگو خاں کی اس رائے کو سب نے پسند کیا۔ واقعی بیجا نگر کا حصار توڑنے کے لئے

فصیلوں کی حکمت و درخت ضروری تھی کھلے میدان میں وہ دیوارے کی پانچ لاکھ سپاہ سے نیپٹا سکتے تھے۔ سلطان بدستور خاموش تھا۔ ارگو خاں کی نگاہیں سخت اور کھردرے چہروں پر کئی استقبائے بناتی چلی گئی۔

”ہم جانتے ہیں فصیل کی حفاظت کی خاطر دیوارے اپنا آخری سپاہی بھی کٹوا دے گا۔ وہ سرگ لگاتے والوں پر پتھروں کی بارش کرنے گا۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں اس کے سپاہیوں کی تعداد شامہ قلعہ کی تعمیر میں صرف ہونے والی اینٹوں سے بھی زیادہ ہے۔ جب تک باہر کل کر مقابلہ نہیں کرتا۔ وہ ہر طرح محفوظ ہے۔“

یہ مایوس کن جواب سن کر سرداروں کے چہروں پر ایک اور جھنجھلاہٹ کے آثار طاری ہو گئے۔ انہوں نے جواب طلب نگاہوں سے صدر جہاں امیر فضل اللہ شیرازی کی طرف دیکھا۔ وہ نگاہیں۔۔۔ جو پوچھ رہی تھیں۔

”امیر! تم کوئی راستہ بتاؤ۔ لڑائی کی فوج کب پہنچے گی؟ واللہ! ہم دیورائے کا لہو چائے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔“

”تم اس قدر پریشان کیوں ہو گئے۔ کمواریں ایک مرتبہ پھر کمواروں سے ضرور نکرائیں گی۔ وہ زیادہ دیر تک قلعہ بند ہو کر نہیں بیٹھ سکتے۔ رسد ختم ہوتے ہی فیصل کے دروازے کھل جائیں گے اور دیورائے اپنی فوج لے کر باہر نکلے گا۔“

امیر فضل اللہ کی رائے نے انہیں اور زیادہ مایوس کر دیا۔ وہ تو محاصرہ سے تنگ آئے ہوئے تھے اور امیر نے یہی مشورہ دیا تھا۔ محاصرہ جاری رہنا چاہیے تا آنکہ قلعہ والوں کی رسد ختم ہو جائے۔

”لیکن رسد کب ختم ہوگی؟“

خاتماناں کے اس طنز آلود سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا پھر بیجا نگر کی ایک سمت کھلی تھی اور قلعہ کے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری تھا۔

”ہم کب تک لومڑیوں کی طرح ذبکے پڑے رہیں گے؟“

”شب خون کیوں نہ مارے جائیں؟“

”اگر محاصرہ ہی جاری رکھنا ہے تو قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیتا چاہیے۔“

بھیڑیے پھر غرانے لگے تھے۔

”ہمارے پہلے حملہ نے دیورائے کی کمر ہمت توڑ دی ہے۔ دوسرا حملہ اسے کھٹنے چکے

پر مجبور کر دے گا۔“

”حملہ۔۔۔ حملہ۔۔۔“

وہ جنگ کے جوش میں پاگل ہو رہے تھے۔ ایسا کب سلطان نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور اپنا ہاتھ بلند کر دیا۔ یہ خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ کانواری شیموں کی روشنی میں سلطان کا چہرہ چمک رہا تھا شاید اس نے اس پیچیدہ جتنی کا حل تلاش کر لیا تھا جس نے دکن کے فوجی افسروں کو دیورائے سے انکار دیا تھا۔

سلطان کا کھلی آستین دالا ہاتھ بلند ہوتے ہی وسیع و عریض بارگاہ پر خاموشی چھا گئی انہوں نے اپنی مضطرب نگاہیں سلطان کے چہرے پر مرکوز کر دیں جو کہہ رہا تھا۔

”بیجا نگر پر حملہ ضرور ہو گا۔ لیکن حملہ سے پہلے ہمیں اس کے بازو کاٹ دینا ہوں گے۔ تم اپنے سلطان پر بھروسہ رکھو۔ ہم اسی وقت حملے کا حکم دیں گے۔ جب فتح یقینی ہو گی لیکن دیورائے کو قلعہ سے باہر نکالنے کے لئے ہم نے جنگ کے لئے نقشے بدل ڈالے ہیں۔ کیا تم بیجا نگر کی خاطر کرناٹک کو چھوڑ دو گے؟ نہیں۔۔۔ ہم ایک شہر کے لئے نہیں ایک ملک سے لڑنے آئے تھے۔ احمد خاں! تم دس ہزار سوار لے کر جنوب کی طرف نکل جاؤ اور کرناٹک کا جو قلعہ سامنے آئے اس پر اپنا پرچم نصب کر دو۔ امیر فضل اللہ! تم اپنے لشکر کے ہمراہ ٹیکا پور کی طرف روانہ ہو جاؤ اور اُسے رو رو ڈالو۔ حسن خاں! تم اپنے ایک دستہ کے ساتھ بیجا نگر کے نوادہ کی دیہات میں چکر کاٹو اور قلعہ کا رستہ رسد کاٹ دو۔ اپنے جانیباڑوں کے ہمراہ ہم بھامراہ بخاری پر حملے کے اور دیورائے کا انتظار کر س گئے کہ اُس کی بدبختی کب قلعہ کا دروازہ کھول کر اُسے باہر دھکیلتی ہے۔“

سلطان کے یہ احکام سن کر تمام امیر، خاں اور سردار حیران و ششدر رہ گئے ان کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا بیجا نگر کی فتح سے پہلے وہ پورے کرناٹک کو رو رو ڈالنا چاہتا ہے بہر حال اس نے ایک بہترین فیصلہ کیا تھا اور تمام لشکروں نے اس کی اعلیٰ ذہانت کا اعتراف کر لیا جو جنگ کے میدانوں میں ہمیشہ ان کی صحیح راہنمائی کرتی تھی اس کا تازہ فیصلہ اس امر کا ثبوت تھا کہ جنگ جیتنے کے لئے صرف کھوار کی نہیں دماغ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

خانخانانا، امیر فضل اللہ اور شہزادہ حسن خاں نے اطاعت میں گردنیں جھکا دی تھیں۔ سلطان کے فیصلہ کے مطابق جنگ کے خطوط بیجا نگر سے نکل کر اب پورے کرناٹک کو اپنے گھیرے میں لے لینا چاہئے تھے۔ یہ فیصلہ افسروں اور سپاہیوں کی تمنا کے عین مطابق تھا۔ انہیں کھوار میں لہرائے اور نیزے مارنے کا موقع میسر آ گیا تھا البتہ اگر وہ خاں کے چہرے پر بدستور جھنجھلاہٹ کی ٹیکر میں تھرک رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا اسے سلطانی کے ہمراہ بیجا نگر کے محاصرہ پر رہنا ہو گا اور کون کہہ سکا ہے قلعہ کے دروازے کب تک بند رہیں گے اور اگر وہ خاں کی کھوار کب تک نیام میں پڑی تڑپتی رہے گی۔

وہ ان بہادروں میں سے تھا جو میدان میں اترنے کے بعد ایک لمحہ بھی چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ اُن کی پیٹھ آنکھوں پہر گھوڑے کی پشت پر رہتی چاہیے اور ہاتھ میں وہ کھنٹی ہوئی تلوار جو دشمن کے لبہ سے موت کے نوشتے تحریر کرتی ہے۔

عالم سلطان نے ارگو خاں کے چہرے پر اُس کے دل کی بے چینی کو کروٹ بدلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کہا۔ ”یقین رکھو ارگو خاں ہمارے اندازے بہت کم غلط نکلتے ہیں۔ امیر فضل اللہ اور احمد خاں کے جاتے ہی جب ہماری جمیعت تھوڑی رہ جائے گی۔ دیورائے کی بدبختی اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ وہ قلعہ کا دروازہ کھول کر خود ہمیں جنگ کے لئے لگا کرے گا۔ اس وقت تمہارا برچھا پیاسا نہیں رہے گا۔“

ارگو خاں نے جواب میں مسکرا کر سر جھکا لیا۔ اس کے درشت اور کھردرے چہرے پر سفاکی کا پیہر رہتا تھا مگر اس وقت مسکراہٹ اُس سفاکی سے بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک تھی جیسے موت کا فرشتہ ہنس دیا ہو۔

”ہمیں کب روانہ ہونا چاہیے کل سبانی!“

امیر فضل اللہ نے سر کو خیف سی جنبش دے کر پوچھا۔

”آج ہی رات۔۔۔“ سلطان نے جواب دیا۔ ”ان اندھیروں میں تم لشکر لے کر نکل جاؤ۔ صرف حسن خاں کی روانگی دن کے وقت ہوگی۔“

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ تمام سرداروں نے اپنی شستیں چھوڑ دیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ مجلس ختم ہوئی اور اب وہ غلوت پابتا ہے۔ سردار گورنر بھی ادا کر رہے تھے کہ اس نے اپنی پشت پر ہلے ہوئے حریری پردے کو جنبش دی اور بجلی کے سے جھبکے کے ساتھ خیمہ سرا کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کانوری شمعوں کی روشنی میں فوجی سردار موت کے بھیانک سايوں کی طرح بکھرنے لگے۔

غہاوشنو کے نام پر

امیر فضل اللہ شیرازی اور خانخانی کے لشکروں کی روانگی میں اگرچہ بہت احتیاط سے کام لیا گیا تھا اور بڑی خاموشی کے ساتھ گھوڑوں پہ منڈے کس لئے گئے تھے پھر بھی بیجا کر

کی تفصیل سے کرنا تک کے عتاب نظر خبر رسالوں نے دکنی سپاہ کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور گھوڑوں کی ہنہانہٹ رات کے اندھیروں کا سینہ چیرتی ہوئی بجے مگر کی فسیلوں سے جا کر ائی تھی اور کرنا تک کا نیا سینا بیچ راج سنگھ جو دیوارے کا بھانجہ تھا ایک بلند برہمنی پہ کھڑا بے شمار سیاہ دھبوں کو صف در صف پہاڑی گھاٹیوں سے دور۔۔۔۔ اور دور ہوتے دیکھ رہا تھا۔

روڈوں لشکروں کی روانگی نصف رات تک جاری رہی دشمن کو بے خبر رکھنے کے لئے انہوں نے ایک مشعل تک روشن نہیں کی تھی اور اندھیرے ہی میں اپنی اپنی منزل کی طرف چل دیے تھے لیکن دشمن کا سپہ سالار ایک پہر سے فسیل پر حیران و مشدد رہا اس روانگی کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے اندازہ کے مطابق دکن کے آدھے سے زیادہ لشکر تا سلطوم ستوں کی طرف کوچ کر گئے تھے۔ جب رات کے آخری پہر زرد چاند پہاڑوں پر چمکنے لگا تو راج سنگھ یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ سلطان کا خاص پرچم بدستور بجا مگر سے باہر کھلے میدان میں نصب تھا مختلف ایک خیال سانپ کی مانند اس کے ذہن میں ریگے لگے۔۔۔ کہیں ہمیشہ لشکر شب خون کے ارادہ سے فوراً نہ نہیں ہوئے؟ ممکن ہے وہ ایک طویل چکر کات کر قلعہ پر اس سمت سے حملہ کر رہیں جو عاصیہ سے ابھی تک محفوظ تھی۔

پھر اس نے فوراً ہی اپنے اسروں کو کچھ ہدایات روانہ کیں اور خود بھی برہمنی سے نیچے اتر آیا۔

بچے مگر کے مہاشوال میں صبح کا پہلا گھر گونج اٹھا اور سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ ہمیشہ لشکر شب خون مارنے کے ارادہ سے نکلے ہیں۔ کوئی دم میں صبح کا اجالا پھیل جائے گا اور اس اجالے میں قلعہ پر حملہ کرنا حماقت ہی تھی لیکن اب اس کے دماغ میں نئے دوسروں اور اندیشوں نے سر اُبھارا۔

کیا سلطان فتح سے مایوس ہو کر محاصرہ اٹھا لینا چاہتا ہے یا اس کے لشکر کرنا تک کے لیے قلعوں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں؟

بیٹا مگر کے بلند ادنی اور ٹکا پور کے علاوہ کرنا تک کے اور کسی بھی قلعہ میں ہمیشہ لشکروں کی یاغزارہ کھینے کی سکت نہیں تھی۔ اگر سلطان نے اپنی قلعوں کو سنہار کرنے کے لئے لشکر روانہ کیا ہے تو کرنا تک میں ایک تباہی پھیل جائے گی۔

سنگھ بہادر سوراہی نہیں تھا بلکہ جنگی چانوں کو سمجھنے میں اُس کی فراست ہمیشہ صحیح رائے متعین کرتی تھی اور حقیقت یہ ہے مہاراج دیورائے کی فوجی اور سیاسی عقلمندی محض اس کے تدبیر پہ قائم تھی ورنہ وہ بہت عرصہ پہلے کرناٹک کے ان ہندو راجپوتوں کے قہر و غضب کا نشانہ بن گیا ہوتا جو اس کے سیاسی مظالم اور رائے رایاں کے جذبہ برتری کا شکار ہوئے تھے۔ راج سنگھ کسی خاندانی جھگڑے کی وجہ سے دیورائے سے ناراض تھا لیکن بعد میں اُس نے اپنے بہادر بھانجے کو ادونی ایسے مضبوط قلعہ کا حاکم بنا کر صلح کر لی تھی اور چند ہی روز قبل اُسے بیجا نگر میں بلایا تھا۔ بچے نگر کی پہلی لڑائی میں میناپتی دروہن کی موت ایسے بھیاٹک اور لرزہ خیز طریق سے ہوئی تھی کہ بڑے بڑے سوراہوں کے جگر کانپ اٹھتے تھے۔ میناپتی ہونے کے علاوہ وہ مہاراج کا منظور نظر بھی تھا اور شاید اُس نے دروہن کو راجبھاری چند رکھا کے لئے منتخب بھی کر لیا تھا لیکن لڑائی میں جب وہ خود سلطان پر حملہ آور ہوا تھا بھمنی حکمران کا بھالا اس کا پیٹ پھاڑتا ہوا نکل گیا تھا اور بچے نگر کے قلعہ کے علاوہ دیورائے کے راج رنواس میں بھی کئی روز تک اُس کی موت کا سوگ منایا گیا تھا۔ دروہن کے بعد اب راج سنگھ ہی مہاراجہ کی امیدوں کا مرکز تھا اور اُسے میناپتی مقرر کر کے وہ بھمنی لشکروں کے محاصرہ کے باوجود کچھ مطمئن سا نظر آنے لگا تھا۔ اس نازک سہ سنگھ کا جنگی تدبیر ہی اُسے سہارا دے سکتا تھا۔ لیکن کرناٹک کے قلعوں پر بھمنی یلغار کے خیال سے راج سنگھ بھی کانپ اٹھا۔ وہ جانتا تھا۔ دکن کے بھرے ہوئے سپاہی پورے ملک کو روند ڈالیں گے اور رائے رایاں کا پھر برا صرف بیجا نگر کی تفصیلات پر لہراتا رہے گا۔ وہ بھاری قدموں اور مضطرب دل کے سانچہ دیورائے کے کمرۂ خاص میں داخل ہوا۔ مہاراجہ چند ہی ساعت پہلے یہ خبر سن چکا تھا کہ شیخ سے ناسید ہو کر بھمنی سلطان نے محاصرہ اٹھا لیا ہے اور اُس کے لشکر راتوں رات دریائے تنک بھدرا کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ اس خبر نے اس کے چہرے پر ہسرت کی لہر دوڑا دی تھی۔ حالانکہ صبح جب پہلے سنگھ کے ساتھ وہ بیدار ہوا تو اُس کے چہرے پر نامعلوم پریشانیوں کا ناچ رہی تھیں اور آنکھوں میں موت کا خوف سہا بیٹھا تھا جیسے اس نے کوئی بھیاٹک سہنا دیکھ لیا ہو۔ راج سنگھ کو دیکھتے ہی وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔

”سنگھ! کیا ہم نہیں کہتے تھے فیروز شاہ کو بچے نگر سے ہاپس ونا سراہ لوٹنا پڑے گا؟ اس ناکامی کے بعد اب وہ زندگی بھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔“

"تو کیا آپ سمجھتے ہیں فیروز شاہ لوٹ گیا؟"

سنگھ آہوس کے ایک منقوش تخت پر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں وہ سفرداسی دروازے کی طرف کھسک گئی تھی جو دیوارے کے لئے "صبح کا وارو" تیار کر رہی تھی۔

"ہم نے تو یہی سنا ہے اس کا لشکر اپنے خیمے اکھاڑ چکا ہے۔"

لیکن فیروز شاہ بدستور محاصرہ کئے پڑا ہے۔"

"کیا...؟" سنگھ کی زبانی سلطان کے قیام کی خبر سن کر دیوارے بوکھلا سا گیا۔

"مہاراج! اگر میرا قیاس غلط نہیں تو ہمیں حکمران نے ایک خطرناک چال کھیلی ہے۔"

جو سارے ملک کو تباہی میں جھونک سکتی ہے۔"

دیوارے جو ریشمی جکتے کے سہارے نیم دراز تھا..... ہڑ ہڑا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

خطرناک چال؟ ہم کچھ نہیں سمجھ سکے راج سنگھ!"

"میرا خیال ہے۔" سنگھ نے تشویش انگیز لہجے میں کہا۔ "سلطان نے اپنے لشکر کرناٹک کے وسطی قلعوں کو پامال کرنے کے لئے روانہ کر دیے ہیں اور خود اپنی فوج لئے محاصرہ پر پڑا ہے تاکہ ہمیں جگہ میں الجھائے رہ سکے اور ہم دوسرے قلعوں کو مدد نہ پہنچا سکیں..... یہ ایک خطرناک چال ہے۔"

مہاراج! اس طرح بچے نگر چھوڑ کر وہ پورے کرناٹک پر قبضہ کر چکا ہے اور پھر اس شہر کو زیر کرنا بھی کچھ مشکل نہیں ہوگا۔"

دیوارے کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں کاہنے لگیں۔ راج سنگھ کا قیاس غلط نہ تھا اس نے سلطان کے تباہ کن ارادوں کی بوسنگھ لی تھی اور مہاراج کو انہی آنے والے خطروں سے آگاہ کرنے آیا تھا۔ دیوارے جو چند لمحے قبل ہمیں لشکروں کے کوچ کی خبر سن کر ذہل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور وارو کے پالہ سے اس خوشی کو درجہ کرنے کا ارادہ کئے بیٹھا تھا اچانک مہاراج کی اس مہر قی کی باند سکت و جلد ہو کے رہ گیا جو دیوارے کی پشت پر دیوار کے ساتھ اپنا سر تکیا۔



مہاراج!..... حقیقی گل جو تمام روشنی کا ظہور اور سونگن کا جسم ہے۔ جو ہر ذی روح کو

.....

ہوئے سمندروں پر تیرتا رہتا تھا۔ جو بچہ جی کا خالق، اس کا محافظ اور اُس کو جہاں کر دیتے کی قوتیں رکھتا ہے جس نے کئی صورتوں میں اوتار لے کر خالوں اور رکھشوں کو جہاں و مہاراج کیا۔ گنگا جس کے پاؤں سے خارج ہوتی ہے۔ جو اپنی استری لکشی کے ساتھ ساتھ کھنڈ کے مقام پر رہتا اور جانوروں میں سے صرف گڑ (گدھ) پر سواری کرتا ہے جو ہمیشہ جوان اور خوبصورت رہتا ہے۔ جس کا رنگ شام سے ملتا جلتا نیلی قام اور جو اکثر قدیم مہاراجوں کی طرح زرق برق لباس پہنتا ہے۔ جس کے چار بازو اور چار ہاتھ ہیں۔ ایک ہاتھ میں شیخ (چلیہ سنگہ) دوسرے میں درشن (وہرناہہ چکر) تیسرے میں گڑا موسوم بہ گونگھی اور چوتھے میں پدم یعنی کنول کا پھول ہے۔ جس کے ایک ہاتھ میں شاربنگ کمان اور دوسرے میں تنک تلوار رہتی ہے۔ جس کے سینہ پر بالوں کا ایک خاص نشان "شری فلس" بنا رہتا ہے۔ گلے میں کوسجہ منی کی مالا اور بازو پر سمیک جواہر لنگتے رہتے ہیں جو اپنی لکشی کے ساتھ کبھی کنول کے پھول پر بیٹھتا، کبھی شیش ناگ کے لو پر لیٹتا اور کبھی گدھ پر سوار ہوتا ہے۔ جس کے نام غیر قافی "اجیت" "لا اجہا" "است" "شیش ناگ" پر سونے والا۔ "است شائمن" چار بازو والا "چتر تیج" پیٹ کے گرد رسی باندھنے والا "واسور" محافظ مادہ گائے "گونڈ" "گوپال" عناصر کا مالک "ہرشی کیش" پانی پر سونے والا "صل شائمن" انسانوں کا معبود "جنارون" روشن اور منور "کیشور" سر پہ کلشی والا "کرپین" لکشی کا پتی "لکشی پتی" رہا کرنے والا "ملند" دشمن "مراری" آدم زاد "تر" پانی پہ حرکت کرنے والا "نارائن" پانچ ہتھیاروں سے مسلح "پنچا یوگ" کنول کی ناف والا "پدم ناہہ" زرد پوشاک میں ملبوس "پیتامبر" سب سے اعلیٰ "پریشوتم" وہڑیو کا بیٹا کرشن "واسد دیو" سورگ کا مالک "دی کھنڈ ناتھ" زمانوں کا مختار "تج" تمیل اور اپنے ان مقدس اور پوتر ناموں کے ساتھ انسانوں کو شکتی دیتا اور مہاراجگان کے سہول پر اپنے ہاتھ کا سایہ رکھتا ہے اُسی مہاوشنو کی سورتی کرناٹک کے مہاراج دیورائے کے سر پر بھی سایہ کمان تھی لیکن اس مقدس سورتی نے بھی نہ اُسے گمراہی سے باز رکھا نہ اُس کی آتما کو شکتی بخشی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح دارو پیتا اور حسین کنواریوں سے کھیلتا تھا مگر اس وقت نبھانے دیورائے کو کیا خیال آیا۔ راج سنگھ کی زبانی آنے والے بھیاٹک خطروں کا ذکر سنتے ہی اُس نے دارو کے پیالے کو تھوکر ماری اور بے اختیار مہاوشنو کی سورتی کی طرف پلٹ کر اوندھے منہ گر گیا۔ اس کی موتی آنکھوں میں ننھے ننھے آنسو تیرنے لگے تھے۔

ایچانک دروازے پر کھٹکا ہوا اور جب سکھ نے پلٹ کر دیکھا تو راجگورو گورکھ ناتھ دلیز پر کھڑا دیورائے کو مہادشٹو کی صورتی کے سامنے سر بھیج دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

شاید زندگی میں پہلی مرتبہ دیورائے کا سر مہادشٹو کے سامنے جھکا تھا جب اس نے گردن اٹھا کر راجگورو کی طرف دیکھا تو گلوگیر آواز میں بولا "راجگورو! ہمارے قریب آؤ۔ ہمیں اس سے تمہارے مشورہ کی ضرورت ہے۔"

گورکھ ناتھ آگے بڑھ کر ایک چوٹی تخت پر بیٹھ گیا۔ دیورائے کی حالت عجیب تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو تیر رہے تھے۔ وہ راجگورو کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"مات ہم نے بڑا بھیا تک پناہ دیکھا ہے۔ دوشی نل کٹھ پہ سوار ہو کر ہم سے ملے آئی تھی۔ اس نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر کان میں رکھا اور ہماری چیخ پکار کے باوجود اسے ہمارے دل پہ کھینچ مارا۔ اس کی آواز ابھی تک ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔" دوشی نے کہا تھا "مہاراج! میرا لہو آپ کی گردن پر ہے۔ میرے بعد آپ بھی اپنی بیٹی کی طرف سے دکھ اٹھائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ نل کٹھ پہ سوار دور پر بتوں کی طرف اڑ گئی اور ہم خون میں لتھڑے تڑپتے ہی رہ گئے۔ جب آنکھ کھلی تو صبح کا پہلا سکھ سج رہا تھا۔ اسی سے ہم نے خبر سنی سلطان فیروز شاہ نے بے فکر کا حاصرہ اٹھالیا ہے۔ اس خوشی میں ہم اپنے سینے کو بھول گئے۔ اب راج سکھ نے ایک اور ہی دل شکن خبر سنائی ہے کہ سلطان نے غاصبرہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنے لشکروں کو کرناٹک کے قلعے روند ڈالنے کی خاطر روانہ کیا ہے۔ اس خبر نے ہماری آتما کا سکھ چھین لیا ہے اور ہماری سب خوشیاں پامال کر ڈی ہیں۔۔۔۔۔۔ راجگورو! ہمیں تو یوں لگتا ہے جیسے روشی کی بروج ہمارے آس پاس منزل لاتی رہتی ہے اور ہمارے دل پر کوئی گہرا چرکا لگنا چاہتی ہے۔ مہادشٹو کی سوگند اہیم نے اس کے لبہ میں ہاتھ نہیں بھرے۔ تم دوشی کے باپ ہو اور اگر اسے راج رواس میں بلانا پاپ تھا تو اس کے لئے تم ہمیں شاکر چکے ہو۔ پھر دوشی ہمارے سینوں میں کیوں آتی ہے؟

"بتاؤ! ہم اس کشت کے لئے کیا بلیدان کریں؟"

گورکھ ناتھ مہاراجہ کی بے باکی اور تشویش دیکھ کر تسخیر رہ گیا۔ "تو آج اس سوگند کو بھی اپنے کشت کا دھیان آگیا ہے۔" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا مگر وہ تو دوشی کے بے گناہ لہو کی سوگند کھا چکا ہے کہ اس کے دل پر بیٹی کے داغ کا چرکا ضرور لگے گا۔ دیورائے کی

حالت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔

"سپنے تو آدمی کے اپنے ہی دھیان کی چھایا ہوتے ہیں مہاراج! آپ اس قدر پریشان نہ ہوں۔"

"نہیں راجگورو! ہمارے دل کو قرار نہیں اور اب دانش کا کیا ہو گا۔ فیروز شاہ کے لشکر کرناٹک میں گھس رہے ہیں۔"

"تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات ہے۔" راجگورو تفتنی آئینز لہجے میں کہنے لگا۔ "آپ ان سپنوں کا دھیان بھول جائیں اور مہاوشنو کے نام پر گجرات، خاندیش اور مالوہ کے مہاراجوں کو امداد کے لئے سندیس بھیجئے، وہ اس سے ضرور کرناٹک کی سہاٹا کریں گے اور ہمیں خطرہ ٹل جائے گا۔"

"تم نے خوب یاد دلایا۔" دیورائے کے افسردہ چہرے پر بشارت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسرت افزا لہجے میں بولا۔ "واقعی اب لڑائی کے نقشے بدل گئے ہیں اور ہم تبھا شاید فیروز شاہ کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ گجرات، خاندیش اور مالوہ کے مہاراجے ہمارے دوست ہیں۔ ہمیں امید ہے وہ ضرور مدد کو آئیں گے پھر۔۔۔ لیکن راج سنگھ! تمہارا دشواش کیا ہے۔"

"راجگورو نے ٹھیک مشورہ دیا ہے مہاراج! اپنے دوستوں کو مدد کے لئے بلانا ہی چاہیے۔"

"تو پھر ان کو سندیس بھیجنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

دیورائے بوز سے چنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے ہماری روح کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے راجگورو! لیکن مہاراجوں کی طرف سے سندیس بھی تم ہی لے کر جاؤ گے۔ تم کرناٹک کے راجگورو ہو اور اپنی دیا سے بھی انہیں آنے والے خطروں سے آگاہ کر سکتے ہو۔ اگر سلطان نے کرناٹک پر فتح پالی تو پھر اس کے قدم گجرات، خاندیش اور مالوہ ہی کی طرف انہیں گئے۔ تم انہیں ہماری مدد پر اکساذ اور ہماڑی طرف سے بہترین تحفے لے جاؤ۔ اس سفر کے لئے ہماری خاص سواری تمہیں تیار ملے گی۔"

"جرا گیا مہاراج! میں ہر سبوا کے لئے تیار ہوں۔"

"پھر دیورائے اسی وقت اپنے پراوی مہاراجوں کے نام سندیس لکھوانے لگا۔ اندھیرے

میں امید کی اس نئی روشنی کی شعاعیں اس کے چہرے پر بھی منعکس ہونے لگی تھیں اور وہ اپنا بھیا تک پہنچا بھول گیا تھا جس نے کچھ دیر پہلے اس کی روح کا جین جھین لیا تھا۔



وہ ابھی بیٹھامات سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ راجکاری چندر کلا اپنے ہاتھ میں کوئی پتھر لئے داخل ہوئی۔ کمرے میں اس وقت دیورائے، راجکو رو اور سنگھ کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ اس نے آتے ہی سب پر اپنی مسکراتی ہوئی نظریں ڈالیں پھر اپنے باپ کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔

”میں تو خوشی کا ایک سندیس لائی ہوں مہاراج!“
 ”بھگوان تمہیں سدا خوش رکھے۔ کہاں سے آیا ہے سندیس؟“

”فیروز آباد سے۔۔۔“

”فیروز آباد سے؟“

سب یوں چوبیک اٹھے جیسے انہوں نے کوئی انوکھا اور حیرت انگیز نام سن لیا ہو۔ چندر کلا نے سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔
 ”دیوان سوانا کو آپ نہیں بھولے ہوں گے ہائی!“
 ”سوانا!“

دیورائے کے ذہن پر روشنیوں کا فوارہ سا پھوٹ نکلا۔ اس کی آنکھیں مسکرائیں۔
 ”تو کیا سوانا کا میا ب ہو گیا؟“

اس نے سندیس بھیجا ہے۔ اس وقت میدان خالی ہے۔ فیروز آباد میں صرف تین ہزار سپاہ ہے۔ اگر اُسے پانچ سات ہزار سوار بھیج دیئے جائیں تو یہ سارا علاقہ اس کے قبضہ میں ہو گا۔ یعنی خاندان کی تمام بیگمات اور شہزادیاں آج کل گلبرگہ سے فیروز آباد ہی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ سوانا نے لکھا ہے وہ ان سب کو گرفتار کر کے بجے مگر روانہ کر دے گا۔“
 پھر چندر کلا نے وہ پتر دیورائے کی طرف بڑھایا۔

”سوانا کا ایک خاص آدمی ابھی ابھی یہ خط لے کر آیا ہے۔ آپ اسے پڑھ لیجئے۔“
 دیورائے نہایت بے تابی کے ساتھ خط پڑھنے لگا اور اس کی آنکھوں میں بھڑبھڑیے کی سی چمک بیدار ہوتی چلی گئی خط پڑھ چکنے کے بعد اس کے رخسار تھما اٹھے اور ایک مسرت

انگیز کراہ کے ساتھ اس نے خط راجکو رو کی طرف بڑھا دیا پھر اسے راج سنگھ نے پڑھا اور سب کے سب ایک نامعلوم سے احساسی مسرت میں سرشار نظر آنے لگے۔

"سوانا کا خط غیبی امداد سے کم نہیں۔" دیورائے کے ہونٹ تھر تھرائے۔

راج سنگھ ایک لمحہ تک سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"اگر سوانا اعتماد کے لائق اور خط کا مضمون درست ہے تو جنگی لحاظ سے اس کی امداد ضروری ہے۔ وہ فیروز شاہ کی بیگمات اور شہزادیوں کو گرفتار کر کے بچے مگر روانہ کر دے تو ہمیں سلطان کی تقدیر ہمارے ہاتھ میں ہوگی ہم اپنی مرضی کے مطابق اس سے ہر بات منوا سکتے ہیں اور اگر ہمیں صلح ہی کرنی پڑی تو ہم فیروز آباد کا علاقہ جزیہ کے طور پر وصول کر سکتے ہیں۔"

"بے شک۔۔۔ بے شک۔۔۔"

دیورائے مسرت سے چیخ اٹھا۔ "سنگھ! بس آج ہی سات ہزار سوار فیروز آباد کی طرف روانہ کر دو۔"

"لیکن ان کا سالار کون ہوگا؟" سنگھ کہنے لگا۔

"اس سے کسی رائے کو بچے مگر سے باہر بھیجنا مناسب نہیں ہوگا۔"

مہاراجہ کا چہرہ لٹک گیا۔ شاید وہ سنگھ کی بات پر غور کر رہا تھا۔ اچانک چندر کلا بولی۔

"پتاجی! گھبراہٹ نہیں۔ اس فوج کی کمان میں کروں گی۔"

"تم۔۔۔"

اور ایک ساتھ چھ آنکھوں نے چندر کلا کے حسین چہرے پر نگاہوں کا جال بنا دیا۔

"ہاں۔۔۔ میں خود۔۔۔ میں میں تعجب کی گونجی بات ہے؟ کیا میں نے فوجی تربیت

حاصل نہیں کی۔ تلوار اور تیر چلانا نہیں سیکھے؟ کیا آپ نے کبھی میرا نشانہ خطا ہوتے دیکھا

ہے؟"

راجکداری چندر کلا ان سب کے سامنے ایک محکم سوال بن گئی تھی اور وہ حیرت پاش

نگاہوں سے اس کی جرأت و ہمت پر حیران ہو رہے تھے۔ یہ درست ہے دیورائے نے اپنی

بچی کو لڑکیوں ہی کی طرح جنگی فنون کی تعلیم و تربیت والی تھی۔ تیر اندازی اور شہسواری میں

بہت کم لوگ اس کا مقابلہ کر سکتے تھے اور یہ چندر کلا ہی تھی جس نے راج رنواس کے در پیچ

سے تیر چلا کر سلطان فیروز شاہ کا شانہ زخمی کر دیا تھا پھر حیرت انگیز بات تو یہ تھی وہ مردوں کی طرح میدان جنگ میں فوج کی قیادت بھی کر سکتی تھی اور کئی سرکوں میں باپ کے دوش بدوش اپنی کھوار کے جوہر بھی دکھا چکی تھی۔ اس کے باوجود ایسے نازک وقت میں جب زندگی کھوار کی دھار پہ رقص کر رہی تھی راجنکاری کا فوج لے کر دشمن کے دس میں جانا کسی لحاظ سے مناسب نہیں تھا۔

”نہیں چھوڑ رکھا! ہم تمہیں دکن جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اگر تمہیں لانے ہی کا شوق ہے تو بچے مگر میں بھی تم یہ شوق پورا کر سکتی ہو۔ ہم بہت جلد سٹکھ کو سلطان کے لشکر پر حملہ کرنے کا حکم دینے والے ہیں۔“

”مگر میرے دکن جانے میں حرج ہی کیا ہے؟“ چھوڑ رکھا کہنے لگی۔

جب فیروز شاہ کو معلوم ہو گا اس کے بہادروں نے ایک لڑکی سے شکست کھائی اور اس کے اپنے بسائے ہوئے شہر فیروز آباد پر رائے ریاں کا زرد پھریرا اڑنے لگا ہے تو اس کی کیا حالت ہو گی؟

”مردری نہیں تم اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو سکو۔“

”دیوان سوانا کبھی غلط خبر نہیں دے سکتا۔“

”لیکن جنگ کے نقشے شطرنج کی چالوں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ کیا معلوم تمہارے دکن جاتے ہی حالات کون سا رخ اختیار کر لیں۔“

راجنکاری نے اپنی نگاہیں باپ کے چہرے پر گاڑھ دیں اور پرعزم لہجہ میں کہنے لگی۔

”میں سوانا کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتی کہ حالات کو جانچے بغیر اپنی زندگی ڈاڈ پر لگا دے۔ وہ اٹھارہ برس سے لومڑی کی طرح گھات لگائے بیٹھا ہے بھلا اب اندازے کی غلطی کیوں کرے گا پھر ذرا یہ بھی سوچئے! اس وقت سارا دکن فوجوں سے خالی ہو چکا ہے۔ سلطان اپنے تمام لشکروں اور سرداروں سمیت بیجا نگر میں ڈیرے ڈالے پڑا ہے پیچھے چند مذہبی عالموں کے سوا کوئی بھی قابل ذکر امیر موجود نہیں پھر مجھ سے الجھنے والا کون ہے؟ اگر کہیں جھڑپ ہو بھی گئی تو سات ہزار سوار کم نہیں میں ہر دشمن سے پیٹ لوں گی اور یہ کبھی نہ بھولے سوانا کا پھیلایا ہوا جال بڑھائی بجلائی کی دلیلیوں تک پہنچ چکا ہے۔ نیکیا مات اور شہزادیوں کو گرفتار کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔ سوانا نے جس سرنگ کا پتہ دیا

ہے میں اسی راستے قلعہ میں پہنچ جاؤں گی اور سوانا کو پانچ ہزار سوار سوئپ کر خود قیدیوں کے ساتھ دوسرے ہی روز بجے نگر لوٹ آؤں گی۔ یہ سب کچھ اس خاموشی اور احتیاط سے عمل میں آئے گا کہ سلطان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکے گی۔ آپ اُسے بجے نگر کے باہر جنگ میں الجھائے رکھیں اُسے یہ خبر دینے والا کون ہو گا کہ فیروز آباد کی بہاروں پر آگ برس پڑی ہے۔"

چندر کا کی بات سن کر وہ سب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اس مہم کی کمان کوئی بھی کرتا بہر حال سنگھ کا خیال تھا فیروز آباد پر حملہ بے حد ضروری تھا۔ اس کے دو فائدے ناقابل انکار تھے اول تو سلطان کو اپنے سرحدی دارالحکومت کو بچانے کی فکر لاحق ہو گی اور وہ کرناٹک کو پامال کرنے کا ارادہ ترک کر کے اپنے گھر کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ دوم اگر چندر کلا بخشی بیگمات کو گرفتار کر کے بجے نگر پہنچے میں کامیاب ہو جائے تو جنگ کا نقشہ ہی بدل سکتا تھا۔ دیوان سوانا نے تیر ہی ایسا چلایا تھا جو ہر پہلو نشانے پر بیٹھتا ہے۔

چند لمحے جب دیوار نے سر اُپر اٹھایا تو اس کا آدھا اضطراب خود بخود دور ہو چکا تھا۔

"کیا فیصلہ کیا آپ نے مہاراج؟"

چندر کلا نے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ نیم رضا مند نظر آ رہا تھا اُس نے ڈبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"اگر راجکو رو پڑی راجوں کی طرف سہانا کا سندھ لے کر نہ جا رہے ہوتے تو ہم انہیں تمہارے ساتھ بھیج کر مطمئن ہو جاتے۔ لیکن۔۔۔"

"سہانا کا سندھ چار دن بعد بھی جا سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ذرا سوچئے بھائی! اگر فیروز آباد کی مہم کا سیلاب ہو جائے تو ہمیں پڑی راجوں سے سہانا لینے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کیا اس صورت میں سلطان خود آپ کے قدموں میں بندھا ہوا نہیں آئے گا؟"

"راجکمار کی کاوشاں بالکل درست ہے مہاراج! سہانا سے پہلے ہمیں فیروز آباد کی خبر لینی چاہیے۔"

اور اپنے سینا پتی کی زبان سے یہ فخر و سن کر دیو مائے بھی سوچے لگ بات کچھ ناممکن بھی نہیں تھی اس چال سے وہ فیروز شاہ کو با آسانی اپنے پاؤں پر جھکا سکتا ہے۔ یقیناً اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”راجکو رو! پہلے تمہیں چند رکلا کے ساتھ فیروز آباد جانا ہو گا۔“

”راج سگھ! تم دس ہزار بہترین سوار تیار رکھو۔ کل رات کے اندھیروں میں یہ لوگ دکن کی طرف روانہ ہو جائیں گے اور چند رکلا! تم راجکو کے قریب کرشنا ندی کو عبور کرو گی۔ شاید یہ راستہ تمہیں خالی ملے۔“

پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر ذریعہ لب بڑھایا۔

”ہم کل ہی نکلے کے دروازے کھول کر فیروز شاہ کو لڑائی میں الجھائیں گے۔“

”لجئے اور یو مائے کی بدبختی نے اُسے جنگ کے میدانوں میں بانکنے کی تدبیر سوچ لی ہے اور جب گناہ دوشی کی آتما را بکھاری چند رکلا ہی کا انتخاب کرتی ہے۔“

اور مہنی سلطان۔۔۔ جو میدان جنگ میں بھی شکست اور ہسپانی کے امکانات کو مد نظر رکھتا اور اپنے لشکروں کو اس انداز سے ترتیب دینے کا عادی ہے کہ ناکامی کی صورت میں بھی وہ اپنے سپاہیوں کو دشمن کے جنگل سے محفوظ کال لئے جائے گا کیا اتنا ہی احمق اور بے وقوف ثابت ہو گا کہ کرناٹک ایلیٹ ملک پر ہندو کے بعد وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت سے غافل ہو گیا تھا۔ یا وہ اپنے سرحدی دار الحکومت کو درعدوں کے چرنے بھاڑنے کے لئے بے سہارا چھوڑ آیا تھا؟

عقرب و یورائے کو اس کا جواب بھی مل جائے گا۔

فیروز آباد کا قاصد

شہزادہ حسن کا ستارہ کچھ اچھا ہی تھا۔

اگر وہ چونک کر جاگ نہ اٹھتا تو شاید اس وقت کالے زہر کا لقمہ بن چکا ہوتا۔

اڑخانی بالشت کا سیاہ ناگ اس کے پاؤں میں مرا پڑا تھا اور مشعل کی روشنی میں اس کا کالا جسم یوں چمک رہا تھا جیسے آئینہ چمکتا ہے۔

سلطان کے کھلم کے مطابق صبح اُسے بجے مگر کے مضافات میں چکر کاٹنا تھے۔ تاکہ

قلعہ کو ملنے والی رسد کا رستہ کاٹ دے اس لئے فولاد خاں کو تیاری کے احکام دے کر وہ سیدھا اپنے خیمہ میں آ کر بستر پہ لیٹ گیا تھا۔ امیر فضل اللہ اور خانخاناں کے لشکر نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی منزل کی طرف کوچ کر رہے تھے اور شہزادہ کے سپاہی بھی دلچسپی کے ساتھ اپنی چھوٹی اریوں سے باہر بیٹھے ان کی روانگی کا نظارہ کر رہے تھے۔ شاید اسی لمحے ولی عہد کے محافظ سپاہی بھی خیمہ سے ذرا ہٹ آئے تھے اور کسی سپرے کو اس کے سفری کمرے میں ناگ چھوڑنے کا موقع مل گیا تھا۔

حسن خاں چپ چاپ آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹا شاید پر تعالٰیٰ کے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُسے فینہ نہیں آ رہی تھی۔ باہر فوجوں کی روانگی کا ہنگامہ چاٹا اور کبھی کبھار گھوڑوں کی چہنچاہیں فضا کے سینے پر یوں تیر جاتی تھیں جیسے شوالوں میں کانسی کی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں۔ لیکن اس دبے دبے اور گھٹے گھٹے سے شور و غل کو بھول کر اس کا ذہن بہت دور فیروز آباد کی محل سراؤں کی طرف اڑا جا رہا تھا جہاں اس کے خوابوں کی تعبیر..... قصر لالہ کی مہمان تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کوئی ایسی تدبیر پیدا ہو سکے کہ چند لمحوں کے لئے اپنے خوابوں کے شہر فیروز آباد سے ہو آئے کہ اچانک اُسے خیمہ کی دیوار کے ساتھ کچھ کلکا سنا دیا..... پھر یہ سوچ کر اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ موند لیں کہ ممکن ہے کوئی محافظ خیمہ کی اس سمت آ نکلا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنے پاؤں کے قریب ہی ایک بھیاںک پھنکار سنا دیا اور وہ چونک کر بیدار ہو گیا۔

مشعل کی روشنی میں اڑھائی بالشت کا سیاہ ناگ اس کے بستر کے پاس رینگ رہا تھا۔ نہایت تیزی کے ساتھ اُس کا ہاتھ سرانے کی طرف گیا اور گوار کی ایک ہی ضرب سے کالا ناگ توپ کر ٹھٹھا ہو گیا۔

وہ سوچنے لگا یہ سیاہ ناگ جو برار کی پہاڑیوں میں پایا جاتا ہے۔ بھانگڑ کے علاقہ میں کہاں سے آ گیا؟

اس لمحے محافظ ایک آدمی کی گردن پہ بھالے کی نوک رکھے خیمہ میں داخل ہوا۔

"کون ہے یہ؟"

شہزادہ لپک کر آگے بڑھا۔

"جانب عالم! یہ داؤد خاں کے لشکر کا سپاہی ہے آپ کی بارگاہ کے عقب میں قاتلوں کی

لوٹ سے بھاگ رہا تھا۔

محافظ نے سپاہی کی گردن میں بھالے کی نوک چبھوتے ہوئے جواب دیا۔

”واؤد خاں کا سپاہی۔۔۔ برادر کا لشکری۔“

حسن خاں کو جیسے کوئی بات یاد آگئی۔ پھر وہ مردہ سانپ کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

”یہ کالا ناگ بھی برادر ہی کے پہاڑوں پہ ملتا ہے۔“

”کالا ناگ۔۔۔۔۔“

محافظ نے حیرت خیز نگاہوں سے زمین پر مرے ہوئے سانپ کی طرف دیکھا اور

دانت پیسنے لگا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

شہزادہ کرخت لہجہ میں برادر کے لشکری سے مخاطب ہوا لیکن اُس کے ہونٹوں پہ خاموشی

کا تالا پڑ گیا تھا۔ اُس کی زبان بند تھی اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔

”خاموشی برم کو نہیں چھپا سکتی۔ یاد رکھو اگر تم نے سب کچھ سچ سچ نہ بتا دیا تو کتے کی

موت مارے جاؤ گے۔“

لیکن اب بھی ملزم کے ہونٹوں کو جھنک نہیں ہوئی۔ حسن خاں کے مٹی بجاتے ہی دوسرا

محافظ خیمہ میں داخل ہوا۔

”معلوم کرو واؤد خاں کا لشکر روانہ ہو چکا یا نہیں؟“

”لشکر جا چکا ہے جاہا عالم!“ محافظ نے جھٹک کر جواب دیا۔

”واؤد خان امیر شیرازی کے میوند کا سالار ہے۔ سب سے پہلے اُسی نے اپنے خیمے

اکھاڑے تھے۔ اس وقت وہ یہاں سے تین کوس کی مسافت پر ہو گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ شہزادہ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ ”اُسے زنجیروں میں جکڑ دو اور یہ سانپ

اٹھا کر لے جاؤ۔ صبح یہ دونوں ظلی سبحانی کے حضور پیش کئے جائیں گے۔“

محافظوں نے اُسی وقت لشکری کو جکڑ لیا۔ وہ اب بھی خاموش تھا لیکن خوف کے

مارے اس کا بدن یوں کانپ رہا تھا جیسے تیز ہوا میں بید مجنوں کی شاخیں لرزتی ہیں۔ اگر

سلطان بہ نفس نفیس اس پڑاؤ میں موجود نہ ہوتا تو شہزادہ حسن کو برادر کے اس لشکری کی زبان

سکھوا لینے میں شاید اتنی مشکل پیش نہ آتی لیکن ابھی تک یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آ سکی

تھی۔ برادر کا سیاہ ناگ اس کے خیمہ میں کیوں چھوڑا گیا۔ فوج میں کون شخص اس کی جان کا دشمن ہو سکتا ہے؟
بقیہ رات اس نے جاگتے جاگتے ہی گزار دی۔



صبح جب وہ سلطان معظم کی بارگاہ میں داخل ہوا تو چوہدار نے اسے بتایا سلطان عالی اس وقت خلوت میں ہیں اور ابھی ابھی انہوں نے فیروز آباد کے ایک قاصد کو شرف ملاقات بخشا ہے۔

قاصد کا گھوڑا خیمہ سے باہر کھڑا ہو تک رہا تھا اور ایک سپاہی اس کی نگاہ تھامے کچھ فاصلہ پر کھڑا تھا۔

سورج ابھی طلوع ہوا تھا اور اس کی نفیسی شعاعیں بیجاگر کی بھوری چٹانوں پر رنگ نکھیر رہی تھیں۔ اتنے سویرے کسی قاصد کی ملاقات خالی از ملت نہیں ہو سکتی حسن خاں کا خیال تھا شاید اب دن بڑھے تک اُسے سلطان کی حاضری نصیب نہ ہو سکے بجائے قاصد کیا پیغام لے کر آیا ہے۔ کہیں فیروز آباد میں کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔۔۔ پھر فوراً ہی اُسے پر تھاں کا خیال آیا ”لیکن قاصد کون ہے۔۔۔ کس کا پیغام لے کر آیا ہے؟“

اس استفسار پر چوہدار نے بتایا۔ اس نے علیہ خانم بیگم جہاں کی انگشتی اندر بھجوائی تھی اور سلطان عالی نے فوراً طلب کر لیا تھا۔
بیگم جہاں کی انگشتی، شہزادہ حسن کا ماتھا ٹھنکا اور اچانک سینے کے اندر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

جب چوہدار واپس آیا تو اس نے جھک کر عرض کیا۔
”کل سجنائی نے جانیا عالم کو یاد فرمایا ہے۔“

شہزادہ حسن دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حریری پردوں کو ہٹاتا پلٹا ہوا گزرتا چلا گیا۔ وہ جلد سے جلد فیروز آباد سے آنے والے قاصد کی زبانی مکمل کی صورت حال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ راہداری سے گزر کر جب وہ سلطان کی خاص سراپردہ میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا کہ سلطان نہایت جوش کی حالت میں ایرانی قالین پر چکر کاٹ رہا تھا اور ایک خوش پوش نوجوان جس نے ہمنیوں کے خاص انداز میں منہ پر پٹکا باندھ رکھا تھا۔ چوبلی شہ

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

نشین کے پاس مودب کھڑا تھا سلطان کا چہرہ غصہ میں انگارے کی مانند سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے خون نکلا پڑ رہا تھا اور بدن پر ریشہ ساٹاری تھا۔ جس پردہ چلتے چلتے قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دلی عہد نے سلطان کو آج تک اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ ضرور کوئی جھوٹا انگیزہ سامنے روٹھا ہوا ہے۔ وہ پردہ کے پاس ہی ٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اس نے سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اُسے سلطان کی گرج سنائی دی۔

”قرب آ جاؤ۔“

اُس کی آواز بری طرح مرتعش تھی۔ حسن کے جسم پر کچکی سی دوڑ گئی سلطان خلاف عادت اپنے کولہوں پر ہاتھ ٹکا کر نشین کے پاس کھڑا ہو گا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ دلی عہد نے محسوس کیا آج وہ اُس سے آنکھیں نہ ملا سکے گا۔

”حاضری کا مطلب؟“

سلطان کے لہجے میں کسی درجہ سے کی سی وحشت تھی۔

”نظمِ سجائی اارات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔“ آدابِ سلطانی کے مطابق سب سے پہلے اُسے سلطان کی خیریت دریافت کرنا چاہیے تھی، قاصد نے بھی یہی ہوتی نگاہوں سے شہزادہ کی طرف دیکھا شاید وہ اس کی غلطی پر چونک اٹھا تھا لیکن حسن خانی نے اُس جانب دھیان نہیں دیا۔

”اجازت ہے۔“

”راتِ برادر کے ایک لشکری نے میرے خیمہ میں کالا ناگ چھوڑا تھا۔“ شہزادہ کا فقرہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ سلطان اور قاصد دونوں اچھل سے گئے۔ اُن کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں اور پھر سلطان کا چہرہ لال بھجھکا ہو گیا۔

”کالا ناگ؟“

”سلطان عالی اارات کسی نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجرم کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ سردارِ داؤد خاں کے لشکر کا سپاہی ہے۔“

”اور سانپ۔“

”اُسے ہلاک کر دیا گیا۔“

ایک لمحہ خاموشی رہی پھر سلطان کی کرخت آواز سنائی دی۔
 ”تو پرتھال کا بیان صحیح ثابت ہوا۔“
 ”پرتھال۔۔۔“

شہزادہ کے ہوٹ کپکپائے اور اسی وقت قاصد نے اپنے منہ سے سیاہ پکا اتار دیا۔
 اب حسن خاں کے سامنے مردانہ لباس میں پرتھال کھڑی تھی اس کے خوابوں کی تعبیر دے رہی تھی۔
 ”پرتھال کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ تمہیں سانپ کے حملہ سے خبردار کر سکے۔“
 سلطان اس کی حیرت دور کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ”اس نے آتے ہی تمہاری خیریت دریافت کی تھی۔“

”تو سانپ میرے لئے فیروز آباد سے بھیجا گیا تھا؟“
 سلطان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے جوش غضب کی اسی حالت میں آکے بڑھ کر گولگ پر ضرب لگائی اور شہنشین کا چوبلی بازو تھام کر کھڑا ہو گیا۔
 دوسرے ہی لمحے چوہدار نے خیمہ میں قدم رکھا۔
 ”ارگو خاں کو بلاؤ۔“

سلطان بدستور غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ یوں مسطرم ہوتا تھا خون کی تیزی سے اس کا جسم پھٹ جائے گا۔ ولی عہد ابھی اصل واقعہ کی نوعیت سے بے خبر تھا لیکن پرتھال کے فیروز آباد سے آنے کا مقصد سمجھ جانے کے بعد وہ اس قدر ضرور جان گیا تھا کہ اس سازش کی پشت پر جنگم شیرازی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا دو سال پہلے وہ بھی تو برابر ہی سے آئی تھی اور اسی کی سفارش پر سردار داؤد خاں کو امیر فضل اللہ کے لشکر میں ایک اہم عہدہ دیا گیا تھا۔ ارگو خاں کو آنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ بھی سلطان کی حالت دیکھ کر سنانے میں آ گیا۔

”ارگو خاں!“ سلطان غضب ناک آواز میں دھاڑا۔ ”امیر فضل اللہ پکا پور کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ ایک تیز رفتار سوار ان کی طرف دوڑاؤ۔ وہ ابھی دور نہ گئے ہوں گے۔ انہیں پیغام بھیجو۔ بزرگ داؤد کو پاب نہ نہیں بلکہ اسے حضور بھیج دیں اور اپنا منہ جادوی رکھیں۔“
 ارگو خاں دم بخود رہ گیا۔ سلطان کہہ رہا تھا۔

”ہم ایک رات کے لئے فیروز آباد میں جاؤں گے لیکن ہاڑی رداہی کی خبر کسی کو نہ

ہونی چاہیے۔ صرف ہمارے دست خاص کے ایک ہزار سوار دریائے ننگ بھدرا کے گھاٹ پر ہمارا انتظار کریں۔ لشکر گاہ سے ہم تنہا اور چھپ کر ٹکس گے ہمارے بعد جان عالم فوج کی کمان کریں گے۔ شاید دیورائے کی بدبختی اسے آج یا کل قلعہ کے باہر لے آئے لیکن ہمیں دور مت سمجھو۔ ہمارا ایک قدم فیروز آباد میں ہو گا اور دوسرا بجے نگر میں اب تم جاسکتے ہو ایک ہزار سوار فوراً دریائے ننگ بھدرا کی طرف روانہ کر دو ہم نصف رات سے پہلے ہی فیروز آباد پہنچ جانا چاہتے ہیں اور حسن خاں! تمہاری رواجی ہماری واپسی تک ملتوی رہے گی۔ برار کے لشکر کی قسمت کا فیصلہ ہم خود سنائیں گے۔ بس اب ہم تھکے چاہتے ہیں پر قتال ہمارے ساتھ ہی فیروز آباد جائے گی۔“

یہ کہہ کر سلطان نہایت تیزی کے ساتھ ایک جانب مڑ گیا ارگو خاں اور شہزادہ حسن اُلے قدموں سے دروازہ کی طرف چلنے لگے پر قتال جو ابھی تک گم صم کھڑی تھی مضطرب نگاہوں سے دلی عہد کو جاتے دیکھنے لگی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ دوڑ کر اس کے قدیموں سے پلٹ جاتی اور پاؤں پکڑ کر الحجا کرتی۔

”جان عالم! یہ کتنی آپ کی زندگی کے لئے فیروز آباد سے بھاگی آئی ہے میں نے کسی قاصد کا بھی انتظار نہیں کیا کیونکہ آپ کی زندگی کسی بھی قاصد سے مجھے زیادہ عزیز تھی پھر میں خود کیوں نہ آئی اور آپ کو کیا خبر آپ کے بعد بیگم شہزادی نے مجھے بھی دس لینا چاہا تھا۔ وہ ہم دونوں کی جان لینا چاہتی ہے۔ میں اس نے تو سلطان عالی کے لئے بھی کالے بتاگ پال رکھے ہیں۔ وہ پورے مسمی خاندان کا معنیا کر دینا چاہتی ہے۔ سارے دکن کو دس لینے پر تلی بیٹھی ہے۔ وہ عورت نہیں مانگن ہے۔ میں آپ کو اس کے زہر سے بچانے آئی ہوں لیکن سلطان عالی کی موجودگی میں میں آپ کو اپنے دل کی بے قراری کا حال کیسے سناسکتی ہوں۔ میرے من مندر کے دیوتا! بھگوان آپ کی رکھشا کرے۔“

اور واقعی سلطان کی موجودگی میں وہ شہزادے کو اپنی بے تابوں کی داستان سنا بھی کیسے سکتی تھی۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو الوداع کہی اور شہزادہ اپنے دل میں تازہ دھڑکنیں لئے کمرہ سے باہر نکل گیا۔



14

سازش کی کڑیاں

شب انقلاب

مہر زریں نے چونک کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے حجرے میں بستر پر اوندھے منہ لیٹی سکیاں لے رہی تھی۔

”ہاری میں تو سارا دن تجھے ڈھونڈتی پھری ہوں۔ مجھے کیا خبر تھی تو اپنے حجرے میں لیٹی ہے لیکن تجھے ہوا کیا۔ تو رو کیوں رہی ہے۔ بس اب آنسو پونچھ ڈال۔ بیگم شیرازی کب سے تجھے یاد کر رہی ہیں۔ ہم تو ڈر ہی گئی تھیں۔ تجھ پر کوئی نئی آفت نہ آپڑی ہو۔“

زریں نے ہزار بہلایا لیکن زرینہ کی سسکیاں بدستور جاری تھیں۔ عیار خواجہ سرا کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا آخر اس کے رونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ بڑی مشکل سے اس نے زرینہ کو شیرازی کے کمرے میں چلنے پر رضامند کر لیا۔

زرینہ تنکے لئے وہ دونوں واقعی پریشان رہی تھیں۔ خطرہ تھا کہیں وہ محل کی کسی بیگم سے مل کر سانپوں کا راز فاش نہ کر دے۔ مہر زریں نے محلات کا ایک ایک گوشہ چھان مارا تھا۔ ایک ایک کنیز اور ایک ایک خواجہ سرا سے اس کا پتہ پوچھا تھا لیکن زرینہ کسی کو دکھائی نہ دی۔ پھر اس کا پتہ کہاں سے ملا۔ جوں جوں دن ڈھل رہا تھا مہر زریں کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں نہ یہاں سے اس نے قصر لال کا چکر بھی کاٹا تھا لیکن زرینہ کہیں نظر نہ آ سکی اور اب جب وہ تنگی ہارنی اس کے حجرے کی طرف آئی تو وہ بستر پر اوندھی پڑی آنسو بہا رہی تھی۔ زریں انفرادی میں اس کے حجرے کو بھول گئی تھی۔ زرینہ کو دیکھ کر اس کی جان

میں جان آئی لیکن وہ اس کی اداسی اور رونے کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

قصر لالہ کی چالاک کنیز اپنا کام کر آئی تھی۔

جب وہ شیرازی کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ بھی اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

زیرینہ خود بخود پھٹ پڑی۔

”بیگم حضور! دشمن شاید میری جان ہی لے کر نلیں گے۔“ اس نے سسکاری لیتے

ہوئے شکایت کی۔

”واقعہ کیا ہے؟ تم ابھی تک کہاں تھیں؟“

زیرینہ نہایت محسوسیت سے کہنے لگی۔

”میں نہیں سمجھی آج سرگم میں مجھے تنہا چھوڑنے کی وجہ کیا تھی خوف سے میرا دم ٹکنے

لگا تھا۔ میں کچھ دیر اندھیرے میں زیریں کا انتظار کرتی رہی۔ جب تنہا سونا بابا کے حجروں کی

طرف چلے گی جرات نہ ہوئی تو واپس ہو لی مگر سرگم سے نکل کر اپنے حجرے کی طرف آ

رہی تھی کہ اچانک قصر لالہ کی کنیز گل رخ مل گئی۔ اُس نے بتایا بیگم جہاں میری تلاش میں

ہے اور کسی روز ضرور مجھے ہلاک کر دے گی۔ میں وہاں بے سندھی اپنے حجرے میں چلی

آئی اور اس ڈر سے باہر نہیں نکلی کہ کہیں بیگم جہاں کا کوئی غلام بچ جائے تو مجھے ہلاک نہ کر

ڈالے۔“

یہ کہہ کر زیرینہ پھر رونے لگی لیکن اب اس کی سسکیاں مدہم پڑ چکی تھیں۔

”اور میں اسے حجرے سے باہر تلاش کرتی رہی۔ مجھے کیا خبر تھی..... لڑکی میری بغل

میں ہے اور ڈھونڈ دیا شہر میں دے رہی ہوں۔“ بھر زیریں نے اپنی صفائی پیش کی۔

”خیر تم ڈرو نہیں۔“ بیگم شیرازی اُسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی۔

”زیریں کو میں نے ہی ہدایت کی تھی آج وہ تمہیں تنہا چھوڑ دے۔ تاکہ تمہارا خوف

دور ہو سکے اور بوقت ضرورت تم اکیلی سرگم میں آ جاؤ۔ اگر تم ڈرتی ہو تو زیریں ہر وقت

تمہارے ساتھ رہے گی۔ اس کی موجودگی میں کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ

سکے۔ اور وہ بوڑھی بکیتا تو جسے تم بیگم جہاں کہتی ہو میرے قدموں میں سسک سسک کر دم

توڑے گی۔ میں اس سے تمہارا بدلہ ضرور لوں گی بس چند روز اور انتظار کرو۔ سلطان کی

والہی پر سب حساب بیباق کر دیا جائے گا۔“

”لیکن اگر سلطان کی دایچی سے پہلے کسی نے مجھے خنجر گھونپ دیا تو۔۔۔“

”میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا۔“ مہر زریں ایک ٹانگن کی طرح پھکاری۔

”کنیزوں، غلاموں اور خواجہ سراؤں پر میرا ہی حکم چلتا ہے۔ اگر اس بوڑھی کتیا نے ایسی حرکت کی تو کیا وہ زہر کے لقمہ سے بچ جائے گی؟ خدا کی قسم! میں اس کی کھال میں بھس بھر دوں گی۔ اس کی زندگی اس وقت ہمارے رحم و کرم پر ہے۔“

”خاموش رہو زریں! دیواریں بھی کان رکھتی ہیں۔ ابھی تمہیں اپنی زبان بند ہی رکھنا چاہیے وقت پر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گی۔ فی الحال تم زریہ کی حفاظت کرو۔“

یہ کہہ کر بیگم شیرازی مسہری پر بیٹھ گئی۔ اچانک اُسے کوئی خیال آیا اور وہ زیر لب پرویز الی۔

”کیوں نہ بیگم جہاں کو ختم ہی کر دیا جائے۔“

پھر وہ مہر زریں سے مخاطب ہوئی۔

”تم آج ہی سوانا بابا سے ملو اور انہیں مطلع کرو بیگم جہاں کے متعلق میں نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا ہے۔ اُسے کل رات ختم کر دیا جائے گا۔“

مہر زریں نے مسکرا کر گردن جھکا دی جیسے بیگم جہاں کی موت کا فیصلہ سن کر اُسے روحانی تسکین ہوئی ہو پھر وہ زریہ کا بازو تھام کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”لوڑی! تمہارا بدلہ تو کل رات اتر جائے گا۔ تم اپنے حجرے کی طرف چلو۔ میں سوانا بابا سے مل کے آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر مہر زریں بجلی کے کوندے کی طرح قصر کے عقبی حصہ میں لپکتی چلی گئی۔ سرنگ والا حجرہ اسی سمت تھا۔

کل میں برہمنوں اور ستونوں کے سائے لے ہو گئے تھے۔ سورج مغرب کی افق پہ چمک رہا تھا اور سما کی شام ہو لے ہو لے اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ زریہ بھاری قدموں کے ساتھ اپنے حجرے کی طرف چلتی گئی۔ اچانک مہندی کی بازو کے پاس ایک سایہ سا حرکت کرتا نظر آیا۔ جونہی وہ آگے بڑھی قصر لالہ کا محافظ شاہ نگل اس کے سامنے آ گیا۔

”زریہ۔۔۔“ اس نے آہستہ سے آواز دی۔

زریہ کے قدم رک گئے۔

”مجھے بیگم جہاں نے تمہاری حفاظت کے لئے بھیجا ہے۔ تاؤ تمہارا حجرہ کون سا ہے؟“
 زریںہ نے اپنے حجرے کی طرف اشارہ کیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

”شاہ گل با بیگم جہاں سے کہنا کل رات ہوشیار رہیں۔ کل ان پر سانپ پھوڑا جائے گا۔“

پھر وہ جھاڑیوں کی ادٹ میں غائب ہو گیا۔ زریںہ بڑے اطمینان سے اپنے کمرے کی طرف چلنے لگی۔

رات مہر زریں نے اسے بتایا۔

”انقلاب کی ساعت قریب آرہی ہے۔ بیگم شیرازی نے برادر کے کچھ لوگوں کو خطوط روانہ کر دیئے ہیں۔ وہ بھی چند روز تک پہنچ جائیں گے اور پھر۔۔۔“

جب اس نے زریںہ کی طرف دیکھا تو وہ ہلکے ہلکے خراشے لے رہی تھی۔ کئی روز کے بعد آج وہ اطمینان کی فیند سوئی تھی۔ زریں مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔



سورج کی شعاعیں درختوں اور غریفوں سے چھن چھن کر حجرے کے اندر تاج رہی تھیں۔ جب زریںہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا مہر زریں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر مسکراتی تھی۔

”آج تم گھوڑے بیچ کر سوئی ہو۔“

”ہاں میں نے اپنے گھوڑے کل ہی بیچ دیئے تھے۔“

”اور آج رات بیگم جہاں کی بوزھی گھوڑی بھی بک جائے گی۔“ مہر زریں بدستور

مسکراتی رہی۔ ”سوانا بابا نے اس کے لئے دکن کا کوبرا منتخب کیا ہے۔“

”لیکن کوبرا تو بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ قصر لالہ تک جائے گا کس طرح؟“

”اوہ۔۔۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ بس یہ سوچو آج اس کتیا کی دھمکی کا آخری دن ہے جو

بہمنی محلوں پر حکومت کرتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے اس سے آخری بار ملنے جاؤں۔ لیکن

میں میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے قصر لالہ کی کینروں پر بھی اعتبار نہیں۔ وہ خودخواہ خنک کر

لیں گی۔ اب تو صبح اس منجوس کی لاش ہی دیکھوں گی۔“

”بڑی عبرت ناک موت ہوگی۔“ زریںہ نے جھرجھری سی لی۔

”لیکن آج سوانا بابا کی حاضری کا ارادہ نہیں؟ کل بھی ناغہ ہو گیا تھا۔“

”زریں! آج تو میں نہیں جاسکتی۔“

”کیوں..... آج کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”آج سارا دن جشن مناؤں گی۔“

”جشن.....“

”ہاں..... بیگم جہاں کی موت کا جشن۔“ زریں کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تیر

رہی تھی۔

”اچھا..... تو میں چلی۔ مجھے آج بہت سے کام کرنا ہیں۔“

پھر مہر زریں اپنا کوڑا سنبالے حجرے سے باہر نکل گئی۔ زریں نے درپچے سے جھانک کر دیکھا۔ بجلی بھی اُس کے ساتھ تھی۔ جسے وہ غلام گردش ہی میں چھوڑ آئی تھی۔

مہر زریں واقعی سارا دن بہت مصروف رہی۔ اس کا کوڑا محل کی کینروں اور خواجہ سراؤں پر برستار ہوا۔ گہری شام کو اُس نے زریں کے حجرے کا آخری چکر لگایا۔

”سب انتظام ٹھیک ہے میری بلبل!“ اُس نے آتے ہی زریں کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ”کوہِ قمرِ لالہ میں پہنچ بھی چکا۔ اب تمہاری علیہ خانم بیگم جہاں بس چند کمزروں کی مہمان ہے۔ جونہی وہ اپنے بستر پہ گئی.....“

ابھی اُس نے فقرہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ بجلی بھاگی بھاگی آئی۔ اس نے بتایا۔ مہر زریں کو بیگم شیرازی نے یاد کیا ہے۔

”اچھا میری بلبل! صبح اٹھیں اس منوں بڑھیا کی لاش دیکھنے چلیں گی۔ تم آج رات بھی جشن مناؤ..... بو بو..... شو شو.....“ وہ بہت خوش تھی۔ پھر اٹھاتی ہوئی حجرے سے نکل گئی اور زریں مسکراتے بستر پر گر پڑی لیکن تھوڑی دیر کے بعد دبے پاؤں غلام گردش عبور کرتی ہوئی وہ بیگم شیرازی کے کمرے کے ایک درپچے کی اوٹ میں کھڑی ان کی سرگوشیاں سن رہی تھی۔

”زریں! میں نے سنا ہے پر تھال کل اسے قمرِ لالہ میں نہیں ہے۔ آخر وہ کہاں گئی ہے؟“

”ممکن ہے بیگم جہاں نے سانپ کے ذرے اُسے کسی دوسری جگہ بھیج دیا ہو۔“ یہ

زریں کی آواز تھی۔ شاید پر تھال کی روپوشی پر خود بھی حیران تھی۔

”لیکن اس کا ردپوش ہو جانا اچھا نہیں۔ میں اپنے دشمنوں کو ہر وقت نگاہوں میں رکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے اطلاع مل جانی چاہیے۔“

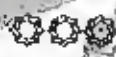
”..... لیکن رہیے بیگم حضور! کل وہ جہاں بھی ہوگی آپ کو خبر ہو جائے گی۔“

”جاؤ اب آرام کرو۔۔۔۔۔۔ ہاں آج رات تمہارا قصر لالہ کی طرف جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔“

”آج رات میں اپنے حجرے ہی میں گزار دوں گی۔“

قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی زرینہ لپک کر ایک طرف ہوئی اور آہستہ آہستہ کمرے کی طرف چل دی۔

فیروز آباد کی کوٹھک سراؤں پر اس وقت گہری خاموشی مسلط تھی۔ یہ گہری خاموشی اور تاریکی کسی بڑے اسرار و واقعہ کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی۔ نجانے کیا ہونے والا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے یوگمی زرینہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ حیران تھی آخر یہ بے قراری سی کیوں جبکہ وہ ہونے والے واقعہ کی اطلاع پہلے ہی قصر لالہ تک پہنچا چکی ہے پھر بھی شکایت آج رات اسے نیند نہ آ سکے۔



بیگم شیرازی میٹھی نیند کے بلکورے لے رہی تھی۔

قریباً آدھی رات کا گھل ہو گا جب اس کے دروازے پر کئی منٹے دستک دی۔ بالکل یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تھوڑے سے دروازہ پیٹ رہا ہو۔

شیرازی نے جھانپا لیتے ہوئے مسہری سے پاؤں نیچے رکھا یقیناً یہ مردود مہر زریں ہوگی جو اسے بیگم جہاں کی موت کی خبر سنانے آئی ہے۔ تو کچھ بڑھیا زہر کا لقمہ بن گئی۔

اس کے لیوں پر ایک خلیفہ سی مسکراہٹ تاج رہی تھی۔ پھر ہولے ہولے چلتی ہوئی وہ دروازے تک آئی۔

”مہر زریں!“ اس نے ہولے پئے آواز دی۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ باہر سے جواب ملا۔

”اری مردود۔۔۔۔۔۔ اس وقت کیوں آئی ہے۔ کیا بڑھیا ختم ہو گئی؟“

”ہاں ختم ہو گئی۔“ آواز مہر زریں ہی کی تھی۔

”تو پھر جا سوره۔۔۔“

”درد آواز تو کھولے۔“

”اوری کجوت! مجھے نیند آرہی تھی مگر تو سونے نہ دے گی۔“

اور یہ کہتے کہتے بیگم شیرازی نے درد آواز کھول دیا۔ بھر وہ بکھلتا اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ پہلے اس نے مہر زریں ہی کو دیکھا تھا جو زنجیروں میں جکڑی ہوئی سامنے کھڑی تھی۔ اس کے عقب میں اس نے جس انسان کی شکل دیکھی اس پر اسے یقین ہی نہ آ سکا۔ دکن کا بدعیت حکمران سلطان فیروز شاہ بہمنی بہ نفس نفیس اس کے سامنے تھا جس کی آنکھیں اندھیرے میں شعلوں کی مانند دکھ رہی تھیں۔ سلطان کے ساتھ بیگم جہاں، زریں اور پریشان بھی تھیں۔۔۔

بے اختیار شیرازی کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی۔ سلطان نے ایک بھوکے بھینرے کی طرح آگے بڑھ کر اس کی کلائی دبوچ لی۔

”سلطان عالی!“

”بے حیا عورت! ہم بچے مگر سے تیری پھنکار سن کر آئے ہیں۔“
شیرازی کے چہرے پر موت کی زردیاں ناچ اٹھیں پھر سلطان نے کسی کو آواز دی۔
”اس مردود کو کمرے میں لاؤ۔“

اور سپاہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سوانا بابا کو ایک کتے کی طرح تھپتھپے ہوئے اندر لے آئے اس کے پاؤں میں بھی زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ سوانا کمرے میں داخل ہوتے ہی منہ کے بل گر پڑا۔ شاید ہشیار نظام الملک نے جو سلطان کے ہمراہ تھا اس کی کمر پر لات ماری تھی پھر اس نے مہر زریں کو بھی کھینٹ کر دیوار کی طرف دھکیل دیا۔ سلطان کے حکم پر دو بڑے بڑے نوکر کمرے بھی نہ گئے ان کے اندر پہنچا دیے گئے۔ ان میں وہ سانپ بند تھے جو کچھ دیر پہلے سرنگ کے ایک خمرے میں ریگتے پھر رہے تھے۔ نظام الملک سپیروں کی ہستی سے چند ہوشیار سپیرے بھی اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا جنہوں نے سوانا بابا کی گرفتاری کے بعد سانپوں کو نوکروں میں بند کر دیا تھا۔

سلطان نے موت کی بطرح اچانک محلات کو گھیر لیا تھا پھر شیرازی میں داخل ہو کر سب سے پہلے مہر زریں کو گرفتار کیا گیا زریں نے سرنگ تک سلطان کی راہنمائی کی تھی۔ وہ

اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنا چاہتا تھا لیکن اُسے جو کچھ بھی بتایا گیا وہ حرف بحرف درست ثابت ہوا تھا۔

سوانا بابا کو بھی نہایت آسانی کے ساتھ زنجیریں پہنا دی گئی تھیں۔ وہ اپنے حجرے ہی میں سو رہا تھا۔ سرگ کے اُس دہانہ پر جو حضورِ مدی کی طرف نکلتا تھا چند سواروں کا پیروہ لگا دیا گیا تھا تاکہ سوانا کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکے صرف سانپوں کا مسئلہ پریشان کن تھا لیکن سپرے بھی سلطان کے ساتھ ہی سرگ میں داخل ہوئے تھے جنہوں نے چند ہی لمحوں میں تمام سانپ قابو کر لئے تھے۔

شیرازی کی ”صوبہ انخاب“ آجیجی تھی اور سلطان کی اچانک آمد نے اُس کے تمام سہری خواہوں کے آگینے چمکا چور کر دیئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ سلطان موت کی طرح بالکل اچانک آدھکے گا۔ وہ تو فیروز آباد سے کوسوں دور بیجے مگر کو گھیرے پڑا تھا پھر..... پھر وہ یوں آٹا ٹاٹا کہاں سے آچکا؟

جرم سے انکار ہے کار ہی تھا۔ اس کے سب ارادے خاک میں مل گئے تھے۔ تمام تدبیریں زنجیروں میں بدل گئی تھیں۔ منصوبوں کے سارے جال بکھر کر خود اُسی کے لئے دام بنا بن گئے۔ سب کچھ فنا ہو چکا تھا لیکن شیرازی کوئی بہادر عورت نہیں تھی کہ اپنی ناکامی کو برداشت کر سکتی۔ موت کے سائے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں مشعل کی لرزاں روشنی کی طرح کانپ رہے تھے اور بنحوں کا خون رک رک کر چلنے لگا۔

بے دبا عورت کو اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔

مہر زریں..... بھئی محلات کی سردارِ خواجه سرا جس کے منتھوں سے ہر وقت کچھو کچھو گرتے تھے اس وقت سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی البتہ سوانا کے چہرے پر پریشانی کے آثار نہیں تھے۔ شاید اُس نے موت کا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔

فرط غضب میں خود سلطان کے جسم پر بھی لرزش سی طاری تھی۔ اُس نے شعلہ بار لگا ہوں سے شیرازی کی طرف دیکھا۔

”ذلیل عورت! اگر ہم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا ہوتا تو ممکن ہے تیرے متعلق شک و شبہ میں رہتے۔ کچھ عجیب عورت کے روپ میں ناگن ہے۔ شاید ہم نے تیرے فریب کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا۔ بول کیا تجھے اس بات سے مجال انکار ہو

”شیرازی نے ہمارے لئے بھی ناگ پال رکھے تھے۔ اس لئے ہمارا حکم ہے۔ اُسے انہی سانپوں سے ڈسوا دیا جائے۔“

اپنی موت کا حکم سن کر شیرازی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی اور دم سے فرش پہ آ گری۔ سلطان کہہ رہا تھا۔

”مہر زریں پر خوشوار کتے چھوڑ دیئے جائیں۔ دیوان سوانا کا سرتن سے جدا کر دیا جائے۔ تینوں لاشیں فیروز آباد کے بازاروں میں گھسیٹی جائیں پھر انہیں قلعہ کے دروازے پر لٹکایا جائے گا اور وہاں ہی پر سوانا کا سر ہم دیوارے کے لئے بطور تحفہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“

”مہر زریں کے حلق سے بھی چھین اٹل پڑیں۔ نظام الملک نے کرخت لہجے میں اُسے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ موت کے فیصلے صادر کرتے کے بعد سلطان نے پرتھالی کی طرف دیکھا۔ ”پرتھالی! تم نے ہماری بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ مابذلت تم سے خوش ہیں۔ آج سے تم قصر شیرازی کی مالک ہو۔ اور زرینہ! تم نے دکن کو آنے والی ایک بھیا تک مصیبت سے بچا لیا ہے۔ ہم اس خدمت کے صلہ میں تمہیں ”دختر دکن“ کا خطاب دیتے ہیں اور مہر زریں کی جگہ نئی جملات کا نگران مقرر کرتے ہیں۔“

یہ کہہ کر سلطان نہایت تعزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ بیگم جہاں، پرتھالی اور زرینہ بھی اس کے پیچھے چل دیں۔ نظام الملک چند سپاہیوں کے ہمراہ وہیں ٹھہر گیا۔ پھر اس کے حکم پر بیگم شیرازی کو بھی زنجیریں پہنا دی گئیں اور سپاہی سینوں بجزوں کو گھسیٹتے ہوئے قلعہ کی طرف لے چلے۔

آج ہی رات سلطان کے احکام کی تعمیل ہو جانی چاہیے تھی۔ دوسرے روز اُسے پچھلے نگر کی طرف کوچ کرنا تھا۔

ہیت سلطان

سلطان ابھی تک برا فروختہ نظر آ رہا تھا۔
 زنجیروں کو اگرچہ رات ہی کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا تھا اور اُس وقت غلام اُن لاشوں کو فیروز آباد کے بازاروں میں گھسیٹ رہے تھے مگر کئی فیروز شاہ خوشوار بھیڑیے

مانند غرار رہا تھا۔ ہمارے اُن لوگوں کو گرفتار کرنے کے لئے بھی سوار روانہ ہو چکے تھے جنہیں شیرازی نے پرسوں ہی مانے بھیج کر فیروز آباد طلب کیا تھا۔ مغلوب انقبض سلطان شاید انہی کم نصیبوں کا انتظار کر رہا تھا۔

رات اُس نے قصر لالہ علی میں بسر کی تھی۔ تمام بیگمات اور شہزادیوں نے یہیں اس کی حاضری دی تھی۔ شیرازی کے بھائیک ارادوں اور اس کے غیر تاک انجام نے سب کے چہروں پر خوف و ہراس طاری کر دیا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی اس نامن سے خوش نہ تھی لیکن وہ سب اس طرح ڈری اور کھی ہوئی تھیں جیسے سلطان ان کی طرف سے بھی مطمئن نہ ہو۔ ان میں صرف بیگم عالیہ ہی کو برا فروختہ بادشاہ سے گفتگو کرنے کی جرأت ہو سکی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”مظل سبحانی! میرا بیٹا تو ٹھیک ہے نا۔۔۔۔۔ کہیں آپ کے بعد پھر تو اس پر۔۔۔۔۔“
سلطان نے خشکیں نظروں سے عالیہ کی طرف گھورا مگر پھر فوراً ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لرز گئی۔

”عالیہ! تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ تمہارا جان عالم بالکل محفوظ ہے۔ ہم بھی تمہاری ہی طرح اُس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے۔ ہماری زندگی میں تمہیں اس کے متعلق زیادہ تشویش نہیں کرنی چاہیے۔“
”مگر داد و خاں ابھی تک زندہ ہے۔“

”اس وقت وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا جان عالم کے قدموں میں پڑا ہو گا۔ ہم بچے مگر بچنے ہی اس کی لاش فیروز آباد روانہ کر دیں گے۔“
”پروردگار عالم! تیرا شکر ہے۔ تو نے سب کو محفوظ رکھا۔“

بیگم عالیہ کے ساتھ دوسری عورتوں کے بھی ہونٹ تھر تھرائے شاید وہ بھی کچھ شکر ادا کر رہی تھیں۔ ان سب میں بیگم جہاں اپنے بڑھاپے کی وجہ سے ممتاز و منفرد دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی دراندیشی مسلم تھی۔ وہ دربار اور محلات کے معاملات پر گہری نگاہ رکھتی تھی اور اب اس کی زندگی کے ساٹھ سالہ تجربہ کی فائلی نے ایک مرتبہ پھر دکن کو آنے والے سیاہ خطروں سے بچا لیا تھا۔

بہن خواتین کو جب معلوم ہوا کہ بیگم شیرازی کے خطرناک ارادوں کی خبر ملنے پر قتال

عی قاصد کے روپ میں سلطان معظم کے پاس بھاگ گئی تھی اور اس کے ایما پر سلطان نے اچانک فیروز آباد کا سفر اختیار کیا تھا تو وہ اس کی جرات و ہمت پر تعجب ہوئے بغیر نہ رہیں بالخصوص بیگم عالیہ اس کی بے حد ممنون تھی۔ اس کے بیٹے کی جان بچانے کے لئے پرتھال نے حیرت انگیز بہادری دکھائی تھی۔

”ظلم سبائی!“ عالیہ نے ملتجیانہ نگاہوں سے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”کینز کی ایک تمنا ہے۔“

”بیگم عالیہ کیا چاہتی ہے؟“ سلطان کا لہجہ تبدیل ہو چکا تھا اور اب وہ پہلے کی طرح زیادہ مشتعل نہیں تھا۔

”بانو پرتھال مجھے سوپ دی جائے۔ وہ میری تنہائیوں کو بانٹ لے گی۔“
عالیہ کی زبان سے یہ فقرہ سن کر سلطان قہقہہ مار کر ہنس دیا اس کی آواز جس میں لکواروں کی سی جھکڑھی قصر لالہ میں دور تک گونجتی چلی گئی اور غلام گردش میں نیزہ بردار محافظ بھی چونک اٹھے۔ بیگم عالیہ کے ساتھ دوسری خواتین بھی سہم سی نکلیں پھر ایک ثانیہ بعد وہ بولا۔

”بیگم! بانو پرتھال کینز نہیں۔ ہماری بیٹی ہے شاید یہ بڑی مستقل طور پر تمہیں ہی سوچنی پڑے۔“

بیگم جہاں اور پرتھال کے سوا سلطان کا یہ ذومعنی سا فقرہ کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا لیکن امیر فضل اللہ شیرازی کی بیگم اس کی نوعیت سے بے خبر نہ رہ سکی۔ اس کی ایک لڑکی پہلے ہی بے شہزادہ حسن کے نکاح میں تھی۔ سلطان کا یہ فقرہ سن کر وہ چونک سی گئی۔ اس نے عجیب نظروں سے پرتھال کو دیکھا۔ سلطان نے اس کے دل کی پریشانی کو چیرنے پر پڑھ لیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”نہیں بیگم! امیر! تمہاری بیٹی کے حقوق پامال نہیں ہوں گے۔ تمہیں فکر مند نہ ہونا چاہیے۔“

”ظلم سبائی کی موجودگی میں مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو بانو کو اپنے لئے مانگ لیتا چاہتی تھی۔“

امیر فضل اللہ کی بیگم کے لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تیر گئی تھی اب پہنچی خواتین سلطان

کے خمرے کا مفہوم بخوبی سمجھ چکی تھیں اور پرتھال کا مستقبل سب پر روشن ہو گیا تھا۔ وہ ایک سار زاوی کی قسمت پر رشک کرنے لگیں پھر سلطان اچانک پرتھال سے مخاطب ہوا۔
 "ہانو! ہمارا خیال ہے۔ تم اپنے ماں باپ کو بھی محل میں بلوالو۔ قصر شیرازی میں ان کے قیام کی گنجائش نکل آئے گی۔"

پرتھال نے ایک سعادت مند بیٹی کی طرح فوراً گردن جھکا دی۔
 "ظہل سبحانی! کتنے پر بے پایاں کرم فرما رہے ہیں۔"
 "نہیں ہانو! ہم اپنا حق ادا کر رہے ہیں اور ہاں قصر شیرازی کا نام بدل جانا چاہیے۔ اب اسے قصر پرتھال کے نام سے یاد کیا جائے گا۔"
 پرتھال کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ زرینہ نے ہشیار نظام الملک کے آنے کی اطلاع دی۔ سلطان نے بعض ضروری انتظامات کے لئے اسے خود ہی طلب کیا تھا فوراً ہی خواتین کی محفل بکھر گئی اور وہ پرتھال کو گھیرے ہوئے بیگم عالیہ کے قصر کی طرف چل دیں۔ نظام الملک کو اسی کمرے میں حاضری کی اجازت مل گئی۔
 جب وہ کورٹس کی رسم ادا کر چکا تو سلطان نے بھرموں کی لاشوں کے متعلق استفسار کیا۔

"بازاروں میں تھینے کے بعد تینوں لاشیں قلعہ کی دیوار پر لٹکا دی گئی ہیں۔"
 "لوگوں کا کیا خیال ہے؟"

"وہ سب باغیوں سے شہر ہیں عالی جاہ!"

پھر ایک لمحہ رک کر نظام الملک نے خوشخبری سنائی۔

"ہمارے مجرم راستے ہی میں گرفتار کر لئے گئے ہیں سلطان عالی! وہ فیروز آباد سے صرف ایک منزل کے فاصلہ پر تھے۔ کل بارہ آدمی تھے اور سردار عظیم ان کی قیادت کر رہا تھا۔"
 "گو باغی قلعہ میں چھپا دیئے گئے ہیں؟"

"صرف ظہل سبحانی کے حکم کا انتظار ہے۔"

"ہمارے پاس ان کے لئے موت کے سوا اور کوئی انعام نہیں لیکن گروہر مارنے سے پہلے ان کے بارے میں تحقیق ضرور کر لینی چاہیے۔ ہم کسی بے گناہ کے لہو میں ہاتھ نہیں بھرے گے۔"

”سردار رحیم کے علاوہ سب معافی کے خواستگار ہیں۔ اُن کا بیان ہے انہیں سردار داؤد خاں نے گمراہ کیا تھا۔“

”بغاوت ناکام ہو جانے کے بعد ہر مجرم اپنا جرم کسی دوسرے کے کندھوں پہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن انہیں معافی نہیں مل سکے گی۔“

”تو کیا۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ ابھی تلواریں نیام میں رہنے دو۔ ہم سردار داؤد خاں کے سامنے ان کی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔ انہیں زنجیریں پہنا کر بجے نگر تک لے جاؤ۔“

ظلام الملک نے سر اطاعت خم کر دیا۔

”اور بجے نگر کے سواروں کی کوئی خبر؟“

”ابھی تک کوئی خبر نہیں مل سکی ظلم سبحانی! سرحدوں پر نگرانی جاری ہے۔ کرناٹک کا کوئی پردہ بھی دکن میں داخل ہوا تو اطلاع مل جائے گی۔“

”تو پھر کوچ کی تیاری کرو۔ ہم سب کے وقت بجے نگر کی طرف روانہ ہوں گے لیکن واپسی دریائے ننگے بھدرائی بجائے کرشنا ندی کے راستے ہوگی۔“

”بہتر ہے عالی جاہ!۔“

ظلام الملک کے جاتے ہی سلطان نے بیگم جہاں کو سردی ملایات دیں اور خود بھی واپسی کی تیاریاں کرنے لگا۔



فیروز آباد کی تفصیل پر سیاہ پرچم بدستور لہرا رہا تھا اور اُس کے سائے میں بیگم شیرازی دھڑکیں اور ویوان سوانا کی وہ مکڑیہ لاشیں لٹک رہی تھیں تمام سانپ ایک بڑے الاؤ میں زندہ ہی جلا دیئے گئے تھے۔ چند مکے مڑنے ناگ لاشوں کی گروٹوں میں بھی پناہ دیئے گئے سازش کی تمام کڑیاں جلا کر راکھ کر دی گئی تھیں اور فیروز آباد کے لوگوں پر سلطان فیروز شاہ بھمنی کی بہت اور دہشت طاری تھی۔ سب جانتے تھے سلطان عادل اور رحم دل ہے۔ اُس کا قانون ظلم کی حمایت نہیں کرتا۔ وہ اپنی رعایا کے ساتھ مہر و محبت کے ساتھ پیش آتا۔ اُن کی شکایتیں سنتا اور منیتوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ انہیں بخشش سے نوازتا ان کے حق ادا کرتا اور درخواست کے بغیر اُن کے احوال سے باخبر رہتا ہے لیکن مجرموں

کے سروں پر اس کی تلوار بھی کے ٹوٹنے کی طرح پھٹی اور انہیں نیست و نابود کر دیتی ہے۔ کوئی ظالم اس کی نگاہ سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ وہ انہیں پکڑتا اور عبرت ناک سزائیں دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے قریب ترین عزیزوں کے متعلق بھی اس کے فیصلوں میں کوئی چلک پیدا نہیں ہو سکتی ظالم اور مجرم کے سر پر اس کی تلوار بہر طور جھگکائے گی۔ خواہ وہ کوئی ہو اور جنگم شیرازی، مہر زریں اور دیوان سوانا کی لرزہ خیز موت نے ایک مرتبہ پھر اس حقیقت پر مہر تھدیق ثبت کر دی تھی کہ وفاداروں کے ساتھ وہ مشفق و مہربان باپ کی طرح سلوک کرتا مگر غداروں، باغیوں اور منافقوں کے حق میں خونخوار بھیڑیا بن جاتا اور آنکھیں بند کر کے ان کی موت کے احکام صادر کرتا ہے۔

کرناٹک کے ظالم اور عیاش مہاراج دیورائے کے ساتھ مل کر مملکت دکن کے خلاف سازش کا جرم ایسا نہیں تھا کہ فیروز آباد کے باشندے اُسے با آسانی معاف کر سکتے۔ انہوں نے شیرازی، مہر زریں اور دیوان سوانا پر با آواز بلند لعنت پڑھی۔ وہ گروہ درگروہ قلعہ کے سامنے جمع ہونے لگے پھر چلائے۔

”ہم سردار واڈو اور اس کے ساتھیوں پر تھوکنے آئے ہیں۔ ان کی لاشیں بھی تفصیل پر لٹکا دی جائیں۔“

لیکن نظام الملک نے انہیں بتایا۔ ”سلطان بیچے مگر بیچ کر اُن کا بقدرہ سنیں گے۔ ہمارے سب باغی گرفتار کر لئے گئے ہیں۔“

ہمارے۔۔۔ دکن کا خطہ جنت نگاہ فیروز آباد کے لوگوں کو جہنم کا دروازہ معلوم ہونے لگا۔

سب باغی اسی علاقے سے اٹھے تھے تو ہمارے سرکش بیٹوں میں سرکش خون ووڑ رہا ہے؟ لیکن یہ فردوس نظر سر زمین شاید اب گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالی جائے گی۔ سلطان جب بیجا نگر کی بہم سے لوٹ کر آئے گا تو امیر فضل اللہ کی بجائے کسی سخت گیر سردار کو اس پر مسلط کر دے گا۔ اگر اس کی نگاہ انتخاب ارگو خاں پر پڑی تو وہ خونخوار بھیڑیا اُس وقت تک چین نہیں لے گا۔ جب تک ہمارے سرکش بیٹوں میں دوڑتا ہوا خون محمد نہ ہو جائے۔

آہ بد قسمت ہمارے۔ تیرے گلزاروں نے شیطانی اگلی کر تیری بہاروں میں آگ لگائی ہے۔ اب تجھے تقدیر کے فیصلے کا انتقاد کرنا چاہیے۔

سہ پہر کے وقت جب سلطان فیروز شاہ اپنے کوئل گھوڑے پر سوار تلوار کے دستے پر

ہاتھ لٹکائے اور لوہے کا لباس پہنے فیروز آباد کے بازاروں سے گزر رہا تھا تو شہر کی فضا۔۔۔
”مزمعہ باد“ کے نعروں سے گونج اٹھی۔

نہمئی سواروں کے آگے آگے وہ ایک پردہ قاتح کی مانند گھوڑا بڑھائے جا رہا تھا۔
برار کے بد نصیب باغی زنجیروں میں جکڑے اس کی رکاب میں چل رہے تھے جنہیں خوفناک
چروں والے سوار نیزوں سے ہانک رہے تھے اور بھالے کی ٹوک پر دیوان سوانا کا سر سب
کو نظر آ رہا تھا۔

لوگوں نے بلند آواز سے اُن پر لعنت پڑھی اور ان کے چروں پر تھوک دیا۔ سلطان
نے فیروز آباد سے ایک ہزار سوار اور اپنے ہمراہ لئے تھے اب دو ہزار مسلح سوار جو سب کے
سب آہن پوش تھے بڑے کروفر کے ساتھ لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری کرتے ہوئے
بازاروں سے گزر رہے تھے۔ اُن کے گھوڑوں کی ٹاپیں دلوں میں دھمک رہی تھیں۔ ورو
دیوار پہ ایک لرزہ سا طاری تھا۔ سلطان کا یہ فاتحانہ جلوس شہر کے دروازہ سے نکل کر چھوڑ
مدی کی طرف متوجہ ہوئے۔

یقیناً وہ لوگ بد بخت ہی تھے۔ جنہوں نے دکن کے مہیت نکلن سلطان کے خلاف ایک
قتلہ پرواز عورت کے اشارہ ابرو پر نقش کیا تھا۔ فیروز شاہ اپنی رعایا کے جسموں پر نہیں دلوں
پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے خلاف بغاوت کا خیال ہی احمقانہ تھا مگر شاید وہ لوگ اپنی تقدیر
سے روٹھ گئے تھے یا پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ ایک حسین عورت نے کینٹیلی اُتار کر
لوگوں کو اپنا اصل روپ دکھایا تھا۔ عورت جو ازل سے زمین پر بغاوت، جنگ اور قتل و
خونریزی کا باعث رہی ہے۔

تاریخ کا کوئی ورق عورت کے ذکر سے خالی نہیں۔

موت کا ورثہ

کرشنا مدی کو عبور کرتے ہی راجہ بھاری چند رکالے اپنا گھوڑا راجپور کے میدانوں میں
ڈال دیا۔

دکن کی نیپالی بھوری پہاڑیاں جن کی سرسبز جھاڑیوں پر غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی
نارنجی شعاعیں سونے کی پتلیں تھیں بائیں ہاتھ پہ چھوڑ کر اس کا رخ فیروز آباد کو جانے والی

اُن سڑی تڑی پلڈنڈیوں کی طرف تھا جن پر تل گاڑیوں کے نشان دم دم پڑ گئے تھے اور پھیوں کی لکیروں پر گھاس آگ آئی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہ راستہ مدت سے دیران پڑا ہے اور اب تل گاڑیوں کے مسافر ادھر سے نہیں گزرتے۔

اس کے عقب میں دس ہزار مسلح سواروں کا لشکر شام کے سرخ اندھیروں میں دھول اڑاتا بڑا آ رہا تھا۔ راجگورو چندت گوروکھ ناتھ ایک سیاہ گھوڑے پر سوار ہوئے راستے راہیاں کا زور جھٹا اٹھائے راج کمار کی کے پہلو پہ پہلو چل رہا تھا۔ ان کی منزل فیروز آباد تھی لیکن رات کے آخری پہر یا صبح کاؤب سے پہلے ان کا اپنی منزل پہ پہنچنا مشکل ہی تھا۔ فیروز آباد سے ابھی کوسوں دور تھا لیکن چندرکھا کی رفتار سے معلوم ہوتا تھا وہ بہر طور آج ہی رات منزل کو جا لینا چاہتی ہے۔

بجے گھر سے جنوب شرق کی سمت ایک طویل چکر کاٹ کر انہوں نے کرشنا ندی کو عبور کیا تھا۔ چندرکھا نے راستہ ہی ایسا اختیار کیا تھا کہ سلطان کے کسی لشکر سے ٹکرا بھی نہیں ہوئی تھی۔ دراصل وہ لکراؤ سے خود ہی بچنا چاہتی تھی۔ اُس کے سر پر تو صرف فیروز آباد کی دھن سوار تھی۔ گھوڑے سارا دن چلتے رہے تھے اور اب وہ تھک کر ہو گئے تھے لیکن ابھی اُن کے آرام کی ساعت نہیں آئی تھی۔

مدھل کی طرح راہچور کا راستہ بھی راجگورو کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ ایک مرتبہ ادھر سے بھی گانڈی کی پاترا کو جا چکا تھا مگر تب یہ راہ آباد تھی اور امیر مسافروں یا سودا گروں کی تل گاڑیاں اس رستہ پر بھاگتی نظر آیا کرتی تھیں۔ پیادہ مسافر بھی ٹولیوں کی شکل میں گزرتے رہتے تھے اور اب مدھل کی شاہراہ کی طرح یہ راستہ بھی کئی سال سے بند پڑا تھا پھر بھی بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ راجگورو کے پاؤں رستہ سے آشنا تھے اچانک ایک سمت انکی اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

”وہ پہاڑی درے عبور کرنے کے بعد ہمیں سیدھا راستہ مل جائے گا۔“

چندرکھا نے گزروں ادھنی کر کے سامنے نظر دوڑائی۔ شام کے اندھیروں میں ادھنی چنی پہاڑیاں بالکل بھول بھلیاں سی دکھائی دے رہی تھیں جن پر لگروندے کی جھاڑیاں اپنے بازو پھیلائے اگھ رہی تھیں راجگورو نے بتایا۔ ان پہاڑیوں کا سلسلہ اڑھائی کوس سے زیادہ طویل نہیں اور لگروندے کی جھاڑیاں جو دم دم پھیلتے ہوئے اندھیرے میں سیاہ دھبوں کی

شکل اختیار کر گئی تھیں۔ صرف ایک کونٹا سا ساتھ دیں گی۔ آگے پہاڑیاں بالکل سیاہ ہیں۔

ان پہاڑیوں پر کہیں کہیں چھتری دار درخت بھی نظر آ رہے تھے جو تاریکی میں بھوتوں کی مانند جھوم رہے تھے۔ یہاں سے انہیں ایک تنگ درہ میں سے گزرنا تھا لیکن راجکو رو کے بقول وہ اتنا چوڑا ضرور تھا کہ بیک وقت چھ سات سوار اپنے گھوڑے ساتھ ملائے اس میں سے گزر سکتے تھے دوسرے دروں کی طرح یہ درہ بھی پُر پیچ اور ٹیڑھے میڑھے رستوں میں بنا ہوا تھا۔ اگر اندھیرے میں انسان بھٹک کر کسی غلط سمت مڑ جائے تو شاید ان کو ہستانی بھول بھلیوں میں بھٹکا اور چٹانوں ہی سے ٹکراتا رہے گا اس لئے سواروں کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ کسی دوسری سمت مڑنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ اپنے اگلے سواروں کے پیچھے پیچھے چلتے آئیں۔

اندھیرا اندھ بن گیا تھا اور مشعل بردار سواروں نے مشعلیں روشن کر لی تھیں۔ لیکن راجکواری کے حکم پر دوسرے ہی لمحے انہیں گن کر دیا گیا۔ اس وقت وہ دشمن کی دھرتی پر تھے اور مشعلیں روشن کر کے چلنا خطر ہے سے خالی زمین تھا۔ اگرچہ ابھی تک انہیں دکن کا ایک بھی سپاہی نظر نہیں آیا تھا جس سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ سلطان اپنی تمام سپاہ کو بجے نگر کی طرف ہانک لے گیا ہے پھر بھی احتیاطی طور پر ڈیڑھ گھنٹہ کی گھیر رہے تھے۔ چدر کا نئے حکم پر صرف ایک مشعل جلتی رہنے دی گئی جسے ایک سوار راجکو رو کے ہاتھ ساتھ لئے چل رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ ایک درے سے گزرنے لگے جس کی دونوں طرف بلند عمودی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ گھوڑوں کی ناپوں نے پہاڑیاں گونج اٹھیں اور ان کی آوازیں دور دور تک بھیل گئیں۔ رات کی تاریکی میں مڑے مڑے درے واقعی ایک دوسرے سے یوں بھل گئے تھے کہ صحیح سمت کا تعین کرنا مشکل ہی تھا۔ اگر راجکو رو ایک مرتبہ پہلے اس راہ سے سفر نہ کر چکا ہوتا تو شاید وہ کئی روز تک ان پہاڑی بھول بھلیوں ہی سے باہر نہ نکل سکتے۔ چلتے چلتے ایک راستہ اچانک دوسرے راستے کو یوں بکات دیتا تھا کہ اصل راہ گھو جاتی تھی۔ یہ درے ہاتھوں کی انگلیوں کی طرح ایک دوسرے سے منظر تھے اور بالکل گھروندے کی جھاڑیوں کی مانند ان کی شاخیں بھونتی تھیں۔

چلنے کے بعد راجکو رو نے یہ منظر دیکھا کہ وہ بھی راستہ بھول گیا ہے۔

چندر کلا کے ماتھے پر لگر کی لکیریں ابھریں پھر اُس نے ایک ساتھ کئی مشعلیں روشن کرنے کا حکم دیا اور ان کی لرزتی ہوئی روشنی میں پنڈت گورکھ ناتھ بیچ در بیچ دروں کو گھورنے لگا۔ لشکر کے آخری سوار تک یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ راجگورو راستہ بھول گئے ہیں۔ سب سپاہی غم و فکر میں ڈوب گئے گھوڑوں نے رکتے ہی ہنہاننا شروع کر دیا اور سانپ کی طرح بلی کھاتے ہوئے درے میں گھوڑوں کی ہنہانٹیں رعد کی سی آواز میں گونجتی چلی گئیں۔ جیسے کانسی کی سینکڑوں تھالیوں پر ایک ساتھ ضرب لگائی گئی ہو۔ سوار پریشان تھے نہ جانے انہیں کب تک رکنا پڑے۔ وہ دس میں نہیں پورے دس ہزار تھے لیکن اپنے سروں کے اوپر مگر وعدے کی جھاڑیاں انہیں بدروحوں کی طرح طنزیہ ہنسی ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور اکثر کے دل بھوت پریت کے تصور سے کانپ رہے تھے مگر انہیں زیادہ دیر تک اُس پُرہول درے میں ٹھہرنا نہیں پڑا شاید راجگورو نے رستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ لشکر پھر چلی دیا لیکن اس مرتبہ رفتار بہت سست تھی بس یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں ٹیکڑے رینگ رہے ہوں۔

شاید کرنا لگی سواروں کی بدبختی ہی انہیں ان کو ہستانی بھول جھیلوں تک ہانک لائی تھی۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ چٹانوں کی بلند یوں سے ایک ہول ناک آواز ابھری پھر سینکڑوں بھیا تک قہقہے اندھیری فضا میں کھر گئے۔ سواروں نے گردنیں اوپر اٹھائیں لیکن چٹانوں پر بدستور ایک پُر اسرار سناٹا طاری تھا اور اس سناٹے میں بھیا تک قہقہوں کی صدائے بازگشت بہت دور سنائی دے رہی تھی۔ ضعیف الاعتقاد سپاہی کانپ اٹھے۔ بدروحوں کے خوف سے اُن کے کلیجے اچھل کر چسے حلق میں آ گئے تھے اچانک چندر کلا نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور بولی۔

"راجگورو! یہ آوازیں کسی تھیں؟"

"میں نہیں جانتا۔ ان ویران پہاڑیوں میں انسانوں کا تصور تو کیا نہیں جاسکتا۔"

"تو پھر۔۔۔ پھر یہ آوازیں۔۔۔ یہ پُر اسرار قہقہے؟" چندر کلا خوف زدہ آواز میں بولی۔

"یوں لگتا ہے جیسے کوئی خطرہ ہمارے پاس رینگ رہا ہے۔"

"ہمیں جلد از جلد ان دروں سے نکل جانا چاہیے۔ ایسے مقام عموماً بھوتوں اور بدروحوں کے مسکن ہوتے ہیں۔"

اور راجگورو نے اپنے گھوڑے کو اڑ لگائی پھر چند ہی لمحوں کے بعد راجگورو کے خوف

کا اٹھار سارے لشکر میں پھیل گیا۔ درے میں اندھیرا جیسے سیاہ دھوئیں کی تہ بن کر جم گیا تھا۔ چاروں طرف ایک پرہول، پراسرار ساٹا طاری تھا جسے گھوڑوں کی ٹاپیں زخمی کر رہی تھیں۔

اچانک درے کے آس پاس چھ اٹو چیخ اٹھے بھر سواروں نے اپنے سردوں پر غلطے سے چپکتے دیکھے۔ دوسرے لمحے جب ان کے خوفزدہ چہرے عمودی چٹانوں کی طرف اوپر اٹھے تو درے میں سینکڑوں سواروں کی بھیانک اور مکروہ چیخیں گونج اٹھیں۔ ان کے چہرے گردنوں اور سینوں میں آتشیں تیر پیوست ہو چکے تھے۔ فوراً ہی ان کی چیخیں موت کی خرخراہیوں میں تبدیل ہو گئیں اور ایک ساتھ سینکڑوں سوار گھوڑوں کی پیٹھ سے نیچے لڑھک گئے بعض کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی جس کی چمک اور لپک سے بے سوار گھوڑے خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے تھے۔ موت کے درے سے سپے ہوئے سپاہیوں نے پھر گرجشیں اوپر اٹھائیں اور بلند چٹانوں کی طرف دیکھا۔ آتشیں تیر بھر سینکڑوں سواروں کی موت کا سندس لے کر آئے اور ایک مرتبہ پھر سینکڑوں چیخیں موت کی خرخراہیوں میں ڈھل کے رہ گئیں۔ درے میں ہر طرف افزائشی سی گنج گئی۔ سینکڑوں سوار گھوڑوں سے لڑھک کر پتھروں پہ پڑے دم توڑ رہے تھے۔ ان کے لباس جل رہے تھے۔ سرگ آگسا چیخیں موت کی سسکیوں میں ڈھل رہی تھیں اور بے سوار، مشتعل گھوڑے لاشوں کو رو بکاتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ عمودی چٹانوں سے آتشیں تیروں کی مسلسل بارشیں ہو رہی تھیں۔ حملہ آور اوپر چٹانوں پر تھے اور اندھیرے میں ان کا سایہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے برعکس آتشیں تیروں نے درے میں ہر طرف روشنی عی روشنی پیدا کر دی تھی اور اس روشنی میں حملہ آور نہایت آسانی سے سواروں کو اپنا نشانہ بنا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار سوار موت کی وادی میں پہنچ گئے۔ چھوڑ کلا و ہشت زورہ آواز میں بولی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے راجگو روا“

”دھوکا.....“ راجگو روا نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”بہمنی سواروں نے ہمیں ان دروں میں گھیر لیا ہے شاید انہوں نے ہمیں کرشنا ندی عبور کرتے ہی دیکھ لیا تھا مکروہ خاموش رہے اور جونہی دم درے میں داخل ہوئے انہوں

نے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا۔

راجگورو کا خیال صحیح تھا۔ کرناٹکی سوار چاروں طرف سے گھیر لئے گئے تھے اور اب ان کا موت کے اس درے سے بچ نکلتا مشکل ہی تھا۔ پہنچی تیر انداز عمودی چٹانوں سے آتشیں تیر برسا رہے تھے۔ موت سے بچنے کے لئے حواسِ باخشا سوار پیچھے کی طرف بھاگے اور سرنگ نما درے میں ایک بھگدڑی بچ گئی۔ سوار اپنے ہی سپاہیوں کو روندتے ہوئے واپس بھاگتے نکلے مگر موت ہر جگہ ان کے تعاقب میں تھی۔ درے کے دہانے تک آتے آتے ان محنت انسان موت کا لقمہ بن گئے تھے مگر یہاں بھی موت ان کے استقبال کے لئے کھڑی تھی۔ چاروں طرف سے آگ کے تیر برس رہے تھے۔

"سپاہیوں کو مردانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی بھی یہاں سے زندہ بچ کر نہ جاسکے گا۔"

"تو پھر ہم کیا کریں راجگورو؟" چندر کلا کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سینکڑوں سوار موت کی کالی دیوی سے ہلکتا ہو گئے تھے۔

"ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

پھر درہ "الامان۔۔۔ الامان" کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ کرناٹکی سوار ہتھیار پھینک کر گھوڑوں سے اتر آئے اور پہنچی سپاہی انہیں دہانے تک ہانک لائے جہاں انہیں ریشم کی مضبوط ڈریوں میں باندھا جانے لگا۔

نصف سے زیادہ سوار ہلاک ہو چکے تھے۔ بے شمار زخمی ہوئے تھے کسی کے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کرناٹکی سپاہیوں کو باغھ کر ایک طرف ہانک دیا گیا۔ گھوڑے ذرا مشکل ہی سے قابو میں آئے لیکن انہیں بھی اس سلیقے سے گھیر لیا گیا کہ کوئی بھی بھاگ کر نہ جاسکا۔

حملہ آور وہی آہن پوش سوار تھے جو سلطان کے ہمراہ فیروز آباد سے روانہ ہوئے تھے جب کرناٹکی قیدیوں کو مطمئن ہوا کہ حملہ آور دو ہزار سے زیادہ نہیں تھے تو وہ جبران و دشمن رہ گئے مگر انہیں جس جال میں پھانس لیا گیا تھا وہاں چند سو آدمی بھی جا ہی پا کر سکتے تھے۔ یہ سوانا کی سازش کی آخری کڑی تھی جسے سلطان نے حسین تدبیر سے توڑ دیا۔

چند ہی لمحوں کے بعد راجیکاری چندر کلا اور راجگورو سلطان کے حضور پیش کئے گئے۔

وہ بدستور اپنے سفید کوئل گھوڑے پر سوار تھا۔ اُسے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا لشکر کی قیادت راجکمار کر رہی ہے اور راجگورو صرف اُس کی رہنمائی کے لئے ساتھ ہے اس لئے اُس نے حکم دیا تھا۔ راجکمار کے ہاتھ پاؤں نہ باندھے جائیں نہ اُسے کوئی تکلیف دی جائے۔ سلطان کو پُرسش تھی کہ اپنے دربار دیکھ کر چندر کلا کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ اسے زخمی کر چکی تھی اور اب۔۔۔ اب فیروز آباد پر بھرمانہ چڑھائی یقیناً وہ اس کے لئے موت ہی کا حکم صادر کرے۔

”راجکمار! ہمیں افسوس ہے۔ ہم آپ سے ایک قیدی کی حیثیت میں مل رہے ہیں لیکن اس کی ذمہ دار آپ خود ہیں۔ جرم آپ کے سامنے ہے اپنے لئے سزا بھی آپ خود ہی تجویز کر لیجئے۔“

سلطان کا لب و لہجہ اور انتہائی شریفانہ انداز گفتگو دیکھ کر چندر کلا حیران و ششدر رہ گئی۔ کیا کوئی مہاراج اپنے جرموں کے ساتھ اس نرمی سے بات بھی کر سکتا ہے؟

”مجرم اپنے لئے سزا بھی تجویز نہیں کیا کرتے۔“ چندر کلا سلطان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں بچے مگر لڑائی میں آپ پر حملہ بھی کر چکی ہوں۔“

”ہمیں وہ حملہ ضرور یاد رہے گا لیکن ہم نے راجکمار کی کاتیر لونا دیا تھا۔ آدمی تو صرف ایک نگاہ سے گھائس ہو جاتا ہے۔“

سلطان کے منہ سے یہ بات سن کر چندر کلا نے اپنی گردن نیچو ڈالی اور نیچی نظروں سے سلطان کو دیکھتی رہی جو مشعل کی روشنی میں بڑا بادشاہ اور پُر عظمت نظر آ رہا تھا۔

”ہمیں عداوت ہے اس دیرانے میں ہم راجکمار کی کوئی سزا نہیں کر سکتے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج! مجرموں کی سزا کون کرتا ہے؟“

”بعض مجرم تیر بھی چلاتے ہیں اور اُن کی سزا بھی کرنی پڑتی ہے۔ عورتوں کے ساتھ ہم نے کبھی اُن کی مرضی کے خلاف سلوک نہیں کیا۔“ سلطان کہنے لگے۔

”ہم بھی بچے مگر جا رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ چلتا پسند کریں تو بہتر درندہ الگ سواری کا انتظام کر دیا جائے گا۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتی۔“

”اس میں نہ سمجھنے کی کون سی بات ہے۔ کیا آپ اپنے گھر واپس نہیں جائیں گی؟“

"لیکن میں تو آپ کی قیدی ہوں۔ جانا بھی چاہوں تو نہیں جاسکتی۔"

"نہیں راجکماری! آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ آپ ہر وقت جاسکتی ہیں۔ سوال صرف حفاظت کا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم کچھ محافظ آپ کے ساتھ کر دیں۔ وہ آپ کو بچے نگر کے دروازہ پہ چھوڑ کے لوٹ آئیں گے۔"

چندر کا حیرت پاش نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔ وہ حیران تھی کہیں سلطان اس کے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہا لیکن پھر اس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب اس نے سلطان کو یہ کہتے سنا۔

"نظام الملک! راجکماری کی سواری کا بندوبست کرو اور انہیں بحفاظت بچے نگر چھوڑ آؤ۔ ہم ان کی اور کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔"

"چندر کا جو بیٹنی بیگمات اور خیرادیوں کو گرفتار کرنے کے لئے فیروز آباد جا رہی تھی یہ عجیب و غریب سلوک دیکھ کر پتھر کی مورتی بن کے رہ گئی۔ جب سواری آگئی تو سلطان نے کہا۔ اپنے آدمیوں میں سے آپ جسے بھی ہمراہ لے جانا چاہیں لے جاسکتی ہیں۔"

"چندر کا کی حیرت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ شاید آزمائش کے لئے اس نے پوچھا۔

"اگر میں اپنے تمام سپاہیوں کو ہمراہ لے جانا چاہوں تو؟"

سلطان نے ایک لمحہ سوچا پھر مسکرا کر بولا۔

"آپ سب کو لے جاسکتی ہیں لیکن ان کے ہتھیار واپس نہیں کئے جائیں گے۔"

"مجھے حقیقت ہے۔ آپ انہیں رہا کر دیجئے؟"

سلطان نے حکم دیا۔ "تمام قیدی رہا کر دیئے جائیں۔"

پھر قیدیوں کی ڈوریاں گھٹلے لگیں اور تھوڑی سی دیر میں سارے چار ہزار قیدی آزاد تھے۔ خزانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر یہ معاملہ کیا ہے۔

"اب آپ جاسکتی ہیں۔ سواری حاضر ہے لیکن آپ کے سپاہیوں کو بچے نگر تک پیدل ہی جانا ہوگا۔"

"تو کیا سلطان اوجھڑی بخش کر رہے ہیں؟"

اُس نے ایک ساعت کے لئے بھر کچھ سوچا اور پکارا۔

"نظام الملک! سواروں کے گھوڑے بھی واپس کر دیئے جائیں۔"

سلطان کی نگاہیں چندر کلا کے چہرے پر مرکوز تھیں جو مجسمہ حیرت بنی بھنی حکمران کے طرف پودم بخود تھی۔

”اب آپ بخوشی بیجے مگر جاسکتی ہیں۔“

چندر کلا نے ایک لمحہ تک سلطان کو بغور دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک قیامت خیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

”سلطان معظم! اب تو چندر کلا آپ کے ساتھ ہی جائے گی۔“

”ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ بیجے مگر تک ساتھ رہے گا۔“

پھر سلطان نے روانگی کا حکم دیا اور دونوں لشکر ساتھ ساتھ بیجے مگر کی طرف چل دیے مشعل بردار سواروں نے مشعلیں روشن کر لی تھیں۔ راستے میں ان کے درمیان بہت کم گفتگو ہوئی۔ سلطان نے اسے بتایا۔ وہ عورتوں کے متعلق بڑی غیرت رکھتا ہے اور اس وقت تک بچا مگر کو نہیں چھوڑے گا جب تک پر تعالٰی کی بے عزتی کا انتقام پورا نہیں ہو جاتا۔ چندر کلا اس کے حسن سلوک ہی سے متاثر نہیں ہوئی سلطان کی گفتگو نے بھی اسے متحیر کر دیا تھا۔

جب وہ بیجے مگر کی حدود میں داخل ہوئے اس وقت سورج طلوع ہو چکا تھا اور صبح کی رنگین شعاعیں خشک پہاڑیوں پر رنگ پھیر رہی تھیں۔

سلطان نے چندر کلا کو الوداع کہی۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے کہا۔

”میں آپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔“

”سلطان عالی! مگر میں یقین دلاتی ہوں۔ مہاراج کو صلح کرنے اور معافی مانگنے پر

مجبور کروں گی۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس سے میں بھی شرمندہ ہوں۔“

”شاید صلح کا وقت گزر چکا ہے۔“

اچانک سلطان کے لہجے میں درشتی اور کڑھکی پیدا ہو گئی۔ وہ نفرت آلود لہجہ میں بولا۔

”مہاراج دیورائے ان آدمیوں میں سے نہیں جن کی نیکی بات پر اعتبار کر لیا جائے۔

اب تو تکرار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔“

یہ کہہ کر سلطان نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑ لی اور اپنے لشکر کی سب سے چل پڑا۔

چندر کلا ایک ٹیلے پر کھڑی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ یہ انسان یقیناً اس کے فہم و شعور سے بالا

تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ راجگورو اس کے پاس ہی کھڑا کہہ رہا تھا۔ ”آئیے راجگاری یا
 دھوپ تیز ہو رہی ہے۔ سلطان کے متعلق سوچنا بے کار ہے وہ جو کچھ کہتا ہے کر دکھاتا ہے۔
 دنیا کی کوئی طاقت اس کے ارادے تبدیل نہیں کر سکتی۔“
 چند رکلا ہو لے ہو لے راجگورو کے ساتھ چلنے لگی۔ شاید وہ اپنا دماغ کہیں بھول آئی تھی۔



پاک سوسائٹی
 ڈاٹ کام

کامیاب مراجعت

شبنون

دوسرے روز لشکرِ برادر کے سپہ سالار سردار داؤد خاں اور اُس کے بارہ ساتھیوں کی لاشیں پھانسیوں پر لٹک رہی تھیں۔

باغیوں کے متعلق سلطان کے احکام پڑے سخت اور لرزہ خیز تھے وہ ہر اُس چیز کو نیست و نابود کر دینے کی قسم کھا چکا تھا جن کا سازش سے کوئی بھی تعلق ہو سکتا تھا۔

سردار داؤد کو امیر فضل اللہ کے لشکر سے زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا تھا۔ برادر کے وہ باغی جنہیں وہ فیروز آباد سے لے کر آیا تھا۔ سردار داؤد کے ساتھ ہی علا کی مجلس کے سپرد کر دیے گئے قاضی القضاۃ علامہ منہاج، مولانا لطف اللہ سبزواری، قاضی سراج اور سید محمد کازونی اس جنگی عدالت کے رکن تھے جو فوجی سرداروں کے مقدمے سن رہی تھی۔

دوپہر کے وقت نظام الملک سلطان کی بارگاہ میں حاضر ہوا علا کی عدالت نے صرف ایک شخص فریدیوں کی رہائی کی سفارش کی تھی۔ باغی اُسے دھوکا سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ وہ اس سازش کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ باقی مجرموں کے لئے علماء نے قتل کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جس کے لئے صرف سلطان کی رضامندی ضروری تھی۔ اُس نے قتل کے احکام پر شاہی مہر ثبت کر دی۔ اس کا چہرہ ایک سنگین مجسمہ کی طرح ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور اس وقت صرف سفاکی کا میکر نظر آ رہا تھا۔

جب نظام الملک اس کے احکام لے کر بارگاہ سے چلا گیا تو اُس نے اطمینان کا

سانس لیا۔ وہ مجرموں کے ساتھ ذرا سی رعایت برتنے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ اگر اس نے بچا کر پرچہ حائی نہ کی ہوتی اور جنگ کی آگ میں نہ کودا ہوتا تو ممکن ہے وہ اتنے سخت فیصلے صادر نہ کرتا اور اس کی کریم انجسٹی بعض مجرموں کو معاف بھی کر دیتی لیکن ایک طرف مہاراج دیورائے کی سرکشی اور رواجی کینہ توری اور دوسری سمت پورے بھٹی خاندان کو ہلاک کرنے اور حکومت کا تختہ الٹ دینے کی بھیاں سازش اس کے قہر و غضب کو بھڑکا دینے کے لئے کافی تھی آخر وہ ایک انسان تھا۔ غلطی بھی کر سکتا تھا لیکن جو حالات اس نے پیش خود ملاحظہ کئے تھے۔ ان کے پیش نظر اس کا برا فردخت ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔

اگر باغی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے اور بیگم شیرازی کے زہریلے ارادے پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے تو اس کے لئے کسی رحم کی توقع ہو سکتی تھی؟

شاید خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ وہ بھی کالے زہر کا لقمہ بن جاتا اور اسے سک سک کر مرنا پڑتا یا اس کا جسم لوہے کی گرم سلاخوں سے داغ دیا جاتا پھر اس کی لاش کتوں اور گدھوں کی خوراک بن جاتی اور بھٹی خاندان کا نام صفحہ ہستی سے ناپود ہو جاتا۔ اب وہ مجرموں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کیوں کرتا انہیں اپنے رحم سے کیوں نوازتا؟ زبان کی بجائے باغیوں کے ساتھ اس نے نوک شمشیر سے گفتگو کی تھی اور یقیناً وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھا۔

تموڑی ہی دیر کے بعد نظام الملک نے پھر حاضری کی اجازت طلب کی اور اسے بتایا کہ سلطان کے احکام کی تعمیل کر دی گئی ہے۔ تمام مجرم بچانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ یہ سن کر وہ مطمئن ہو گیا اور اس کا غضب ناک چہرہ جو تین روز سے شطے کی مانند دھک رہا تھا ہلے ہلے ہوئے اعتدال پر آتا چلا گیا۔ اب وہ پہلے کی طرح پرسکون تھا۔

سہ پہر کے وقت اس نے غنیمت اور حسن خاں، ارگو خاں، تاجہ، کوئل رائے، غلام خاں، اور شمشیر خاں کو طلب کیا اور ان کے ساتھ جنگ کی باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ہشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک حسب دستور اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ سائے کی طرح دونوں سردار ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے گویا وہ اس کی زندگی ہی کا جرد بن کے رہ گئے تھے سلطان سازش کے واقعہ کو اپنے ذہن سے یوں جھٹک چکا تھا جیسے یہ واقعہ کبھی ہوا ہی نہیں تھا اور اس وقت اپنی رواجی دجائیت کے ساتھ اپنے افسردہ کے مشورے سن رہا



سلطان کے فیروز آباد جانے کے بعد جس کا علم خود اس کے لشکریوں کو بھی نہیں ہو سکا تھا۔ دیورائے صرف ایک مرتبہ قلعے کا دورہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ اس کے ساتھ بیس بچیس ہزار سوار اور اچھی ہی تعداد میں پیادہ سپاہی تھے۔ اس نے فیصل سے تھوڑی ہی دور اپنا زریں چتر نصب کر لیا اور فوج کو آگے بڑھا کر خود اس چتر کے نیچے ٹھکن ہو گیا تھا۔ اس کا سینا چتر راج سنگھ ایک ہاتھی پہ سوار تھا۔ اس نے جنگی ہاتھیوں کو ایک خاص ترتیب سے آگے بڑھایا تھا۔ کافی دیر تک وہ اپنی صفیں ہی درست کرتا رہا تھا۔ اس لڑائی میں دیورائے کی حیثیت ایک تماشا کی سے زیادہ نہیں تھی۔

شہزادہ حسن نے فوراً ہی اپنے لشکر کو آراستہ کر دیا تھا لیکن ہاتھیوں کے مقابلہ پر اس نے اپنے جنگی ہاتھی نہیں بڑھائے بلکہ اُن کی بجائے بار برداری کے ساتھ سٹراؤٹ سب سے آگے کھڑے کر دیئے تھے جن کے پورے جسم سیاہ چادروں سے ڈھک دیئے گئے تھے اور ان کے پاؤں اور گردنوں میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

بچے مگر کی فیصل سے بیک وقت سیڑیوں، سنگ بھوکے خار پہ تھے پھر کرناٹک کے ایک طویل قامت اور بھاری بھر کم پہلوان نے جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا۔ مبارزت طلب کر لی تھی۔ ارگو خان یہ کہتا ہوا میدان کی طرف بڑھا۔

”بے کار پڑے پڑے میرے برچھے کو رنگ لگ جائے گا۔ میں آئین پوش کرناٹکی پر آنے ذرا صبر کر آؤں۔“

دراصل ارگو خان لڑائی کے لئے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے جاتے ہی حریف پر بھالے سے وار کیا تھا پھر اُس کے ارد گرد اپنا گھوڑا بچاتا رہا۔ اس نے زور بکتریک نہیں پہنا تھا لیکن دشمن کو ٹھکانے لگانے میں اسے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ چوتھے وار ہی میں ارگو خان کے بھالے کی تیز نوک اس کا حلق پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی اور وہ ایک مکروہ چیخ کے ساتھ گھوڑے سے نیچے آ رہا تھا پھر ارگو خان نے یکے بعد دیگرے چھ دشمنوں کو موت کی دیوی کی بھیجٹ چڑھا دیا تھا اور جب راج سنگھ نے اپنے جنگی ہاتھی بڑھائے تو اونٹوں کے پیچھے ڈھول بجا کر انہیں موت کی سیاہ چٹانوں کی طرف ہانک دیا گیا۔ ڈھول پیٹنے والے بدستور

ان کے پیچھے تھے۔ ہاتھی ایک مرتبہ پھر مشتعل اذتوں کو دیکھ کر جن پر سیاہ لہاوے جھول رہے تھے۔ گھبرا سے گئے تھے۔ پھر ارگو خاں نے ایک ہاتھی کی سوئڈ کاٹ ڈالی تھی اور وہ بے تحاشہ چکاڑتا ہوا دایس بھاگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھیوں کا قافلہ پلٹ گیا اور کرناگی سپاہ میں بھگدڑ سی گج گئی تھی لیکن سینا جی نے عکندی سے کام لے کر قلعہ کا دروازہ کھلوا دیا تھا اور سب ہاتھی اندر ہانک دیئے گئے تھے پھر اس کے سوار آگے بڑھے تھے اور شام کا اندھیرا پھیلنے لگا وہ میدان جنگ سے پلٹ آئے تھے۔ دیورائے نے اپنا ہتھکڑا اٹھا کر دایس کا سگھ پھونکنے کا حکم دے دیا اور پچانگر کی فوج ڈیڑھ ہزار لاشیں چھوڑ کر پھر قلعہ بند ہو گئی تھی۔

ارگو خاں کے برہمچہ کا رنگ اتر گیا تھا۔

شہزادہ حسن نے ایک تجربہ کار سپہ سالار کی طرح فوج کی قیادت کی تھی اور اپنے دو سو پہرے اردوں کی شہادت کے عوض دشمن کو شکست دینے میں کامیاب رہا تھا۔ قباچہ خاں اور کوسل رائے جو چوہوں کی مانند پہاڑی گھاٹیوں میں دبکے پڑے تھے ایک ہزار کے قریب دشمنوں کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب رہے تھے جنہیں وہ بھیڑوں کی طرح لشکر گاہ کی طرف ہانک لائے تھے۔

اس سمر کہ کو آج تیسرا روز تھا اور پھر قلعہ کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ کرناگی سپاہ نے حیرت انگیز خاموشی اختیار کر لی تھی اور ارگو خاں کے برہمچے کو پھر رنگ لگنا شروع ہو گیا تھا۔



کوسل رائے کا خیال تھا۔ فیصل میں سینہ لگائی جائے اور ارگو خاں اس بات پر مصر تھا کہ قلعہ پر مسلسل شب خون مارے جائیں اور دیورائے کی قلعہ بندی میں رخنہ ڈال دیئے جائیں۔ شجائے کیوں سلطان نے اس کی رائے کو پسند کر لیا اور حسن خاں کو حکم دیا۔ وہ فیصل کی جنوب مشرقی سمت اور ارگو خاں مغربی جانب سے قلعہ پر شیون ماریں۔ کوسل رائے اور قباچہ خاں ان کے لئے کندیس اور رسیوں کی بیڑیاں مہیا کریں اور فیصل کو جس جگہ کمزور دیکھیں وہاں سینہ لگانے کی کوشش کریں۔

دیورائے کو قلعہ سے باہر نکالنے اور فیصل کن لڑائی پر مجبور کرنے کے لئے وہ اور کبھی کیا سکتا تھا۔

حسن خاں اور ارگو خاں کے لشکر شام تک شیون کی تیاریاں کرتے رہے لیکن فیصل در

فصیل قلعہ کے اندر مگرمی ہوئی فوج پر شیخون مارنا ایک جنگی حماقت ہی تھی اور یہ سمجھتے ہوئے کہ قلعہ بند فوج پر شب خون مارنے والا پہلا اور دراصل موت کے دروازے پر دستک دینا ہے سلطان نے قلعہ پر دھاوے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کا مقصد صرف دشمن کو پریشان اور مشتعل کرنا تھا۔

رات کا اندمرا پھیلے ہی شیخزادہ حسن کا لشکر نہایت خاموشی کے ساتھ ایک سمت کو نکل گیا۔ گھوڑے لشکر گاہ ہی میں چھوڑ دیئے گئے تھے۔ انہیں چند کوس کا چکر کاٹ کر فصیل کی جنوب مشرقی سمت پہنچنا تھا۔ یہی جانب ابھی تک محاصرہ سے محفوظ تھی اور کرناٹک کے دوسرے قلعوں کے ساتھ نامہ و پیام کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ ارگو خاں بھی نصف رات کو مغربی جانب چل دیا اُسے نسبتاً تھوڑا فاصلہ طے کرنا تھا۔

کوسل رائے اور قباچہ کے سینہ لگانے والے سرگرم دوز شام ہی سے چٹانوں میں دیک کر بیٹھ گئے تھے۔ فصیل پر پھرنے والے پہرے دار جب آدمی رات کے خواب آور چھوٹوں سے آنکھیں بند کرنے لگے تو چٹانوں میں دیکے ہوئے ”پھاڑی چوہے“ اپنی کسین گاہوں سے نکل کر آگے بڑھے۔

قلعوں پر شیخون مارنے والا افسر اسحق بنی ہو سکتا ہے اور کرناٹکی پہرے دار سلطان فیروز شاہ کی جنگی فراست سے بے گھر نہ تھے۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ سلطان کی ذہانت کوئی غلط فیصلہ کر سکتی ہے۔ اُن کی آنکھوں میں نیند کا اختار گھوم رہا تھا۔ انہوں نے بھانپاں لیتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور لڑکھرائی ہوئی آواز میں ہانک لگائی۔

”دوسرا! تمرا دچار کیا ہے۔ رات کے سسے دشمن قلعہ کی طرف آنے کا دھیان بھی کرے ہے؟“

”رام رام کرو جگو! کس مائی کے لال میں بیت ہووے کہ کالی پہاڑیوں کی طرف پاؤں بھی اٹھا جلاوے۔ ہرے تیر اُس کا ناش نہ کرو میں گے۔“

پھر پہرے دار اُسی طرح ہانکین لگاتے فصیل کے کنگوروں کے ساتھ ایک لگا کر بیٹھ گئے اور اُن کے اس پاس نیند کی پڑیاں ٹاپے لگیں۔ انہیں ہوش اُس وقت آیا جب بھی سپاہیوں کی گولازیں اُن کے سروں پر گونڈ رہی تھیں لیکن فصیل کے اوپر زیادہ ہنگامہ نہیں ہوا۔

رات کے اندھیروں میں حملہ آور ہرجوں سے ہوتے ہوئے نیچے اترنے لگے اور خیمہ میں غرق سپاہیوں کے لئے اجل کا فرشتہ بن گئے۔

جب سیناچی کو خبر دی گئی کہ کئی لشکر نے جنوب مشرقی فصیل پھانسی کر شب خون مارا ہے تو وہ سلطان کی حماقت پر حیران و ششدر رہ گیا۔ ایک آن کے اندر دوسری فصیل کا دروازہ کھلا اور ہزاروں سپاہی حملہ آوروں کو گھیرنے لگے۔

رات کی تاریکی میں ہتھیاروں کی کھٹکھٹ اور مرنے والوں کی بھیاں بک چھینیں بن کر سینوں میں ڈوبے ہوئے راج محل کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ سنگھ کا خیال تھا وہ ایک بھی حملہ آور کو زندہ سلامت واپس نہ جانے دے گا پھر جب اُسے یہ اطلاع ملی کہ شہنشاہ مارنے والا دکن کا ولی عہد شہزادہ حسن خاں ہے تو اُس کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ اس نے حکم دیا۔

”راجہا کو زندہ گرفتار کیا جائے۔“

لیکن ابھی وہ سنہلے بھی نہ پایا تھا کہ قلعہ کی مغربی سمت سے بھی حملہ کی خبر ملی۔ حیرت سے بوکھلا کر وہ خبر رساں کو گھورنے لگا۔

”کیا بکواس کرتے ہو۔“

”بکواس نہیں مہاراج! ارگو خاں۔۔۔۔۔“

”ارگو خاں۔۔۔“

سنگھ کو اپنے حلق میں گولے سے اکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کرناٹکی سینا کے لئے موت کے خونخوار دیوتا کا نام ارگو خاں تھا۔ اب وہ سمجھ گیا۔ یہ شب خون سلطان کی حماقت نہیں ایک جاہل چال تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو لے کر فصیل کی مغربی جانب پکا تھان ارگو خاں کے برعکس کا رنگ اتر رہا تھا۔

راج محل کے در پیچوں کے پتے کھلے۔ چلے گئے۔ شہر کی پہلی فصیل بھی بھڑیوں کی شکار گاہ بن چکی تھی۔

حملہ آور زیادہ دیر تک قلعہ کے اندر نہیں ٹھہرے۔ انہوں نے جلدی جلدی تلواریں چلائیں۔ محصور سپاہیوں کی تعداد کو خون کا غسل دیا اور بھاگتے کاتے پھر فصیل پر آگئے اور سڑیوں سے نیچے اترنے لگے۔ پو پھونے سے پہلے ہی وہ مختلف سمتوں سے بھی لشکر سرا کی طرف بڑھ رہے تھے۔

کواروں کی کٹنا کٹ بند ہو چکی تھی اب تلگے اندر سے میں صرف فصیل کے جھروں کے آس پاس دھبی سپاہیوں کے کراہنے کی آوازیں سسیا رہی تھیں اور اُن آوازوں میں مہاراج دیورائے کی غضب ناک آواز دھد کی طرح کڑک اور لپک رہی تھی۔

سورج کی پہلی کرنوں میں جب فصیل کا معائنہ کیا گیا تو وہ کئی جگہوں سے کھدی پڑی تھی کوسل رائے اور قباچہ کے سرگم دوز اپنا کام کر گئے تھے اور قلعہ کی مشرقی اور مغربی چوکیوں پر جب بھی سپاہی موت کے فرشتوں کا حساب چکا رہے تھے۔ ٹھیک اُسی وقت سرگم دوز باہر سے فصیل کو ادھڑنے میں مصروف تھے اور یہ کھوکھلی دیوار جس میں کئی جگہ بڑے بڑے رخنے پڑ گئے تھے اب شاید حصار کا کام نہیں دے سکتی تھی۔

”بیجے! بیجے! مگر کے ناچا مل گسٹ قلعہ کی دیواریں ٹوٹنے لگی ہیں۔“

دیورائے نے اپنا سر پیٹ لیا اور فصیل کے رختوں کو دیکھ کر جنگی سوار کی طرح غرائے اور چلانے لگا پھر اسی روز فصیل کی مرمت شروع ہو گئی اور دیوار میں پیوہ لگنے لگے۔

میدان کارزار

مہاراج دیورائے فیصلہ کن جنگ کا ارادہ لے کر قلعہ سے باہر نکل آیا۔

اس کے سوا اب چارہ بھی نہیں تھا۔ سلطان نے قلعہ پر شب خون مار کر اُسے سرہیمہ کر دیا تھا۔ چوہوں کی طرح دیک کر مرنے سے یہ بہتر تھا وہ میدان جنگ میں کسی بہادر کی کوار کا دھم کھا کر پران تیاگ دے۔

راجکمار دیو چھوڑ کلا کے ایما پر مہاراج نے صلح پر آمادگی کا اظہار کیا تھا اور شب خون کے چوتھے روز جب ٹوٹی ہوئی فصیل کی مرمت کر لی گئی تھی۔ اس نے سلطان کی طرف اپنے سفیر بھیجے تھے۔ اس سفارت کا مقصد صرف بھیجی حکمران کے ارادوں سے آگاہی حاصل کرنا تھا۔ صلح کی پیش کش مبہم الفاظ میں کی گئی تھی جس کی طرف سلطان نے کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔

کرتا کی بارود پریشان سا ہو گیا۔ اس نے معنی خیز نگاہوں سے اپنے ہمراہی مہاتروں کی طرف دیکھا پھر سلطان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”مہاراج! بیجے مگر دیر پا کشا کی دھرتی ہے اس کی تغیر انسانوں کے ہن کی بات نہیں۔“

لیکن سلطان نے اس کا فقرہ بھی مکمل نہیں ہونے دیا۔ وہ خوفناک آواز میں دھاڑا۔
 ”واللہ! ہم بچے نگر پر قبضہ کئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ اگر مہاراج دیورائے
 صلح چاہتا ہے تو پاپہ زنجیر ہمارے حضور میں چلا آئے۔ ہم سوچیں گے ہمیں اس کے ساتھ کیا
 سلوک کرنا چاہیے۔ ورنہ تلواریں خود بخود ہمارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔“
 سفیر ناکام لوٹ گئے۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے مہاراجہ کو سلطان کے فیصلہ سے آگاہ
 کیا اور وہ غصہ میں وحشی تیل کی مانند کراہنے لگا۔

”کرناٹک کا مہاراج اپنے پاؤں میں زنجیریں پہن کر بحرِ موسیٰ کی طرح اپنے دشمن
 کے سامنے پیش ہو۔۔۔؟“

واہ کہیں غیر درشاہ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔
 مہاراجہ کی سوگند اب وہ بچے نگر کی فیصل کو بھی چھو نہ سکے گا۔ ہم اسی قلعہ کے دروازہ
 پر اُس کی لاش لٹا دیں گے۔“

پھر اُس نے گجرات، خاندیس اور مالوہ کے راجوں کے نام مدد کے خط لکھوائے اور
 راجکو رو پٹنٹ گورکھ ناتھ یہ سند لیس لے کر بچے نگر سے روانہ ہو گیا۔

دیورائے اس زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا جسے بیچرہ میں بند کر دیا گیا ہو پھر اس نے
 بیچرے کا دروازہ کھول دینے کا حکم دیا اور پوری قوت کے ساتھ اپنے خاص ہاتھی پہ سوار
 چھوٹا ہوا باہر نکلا۔ اس کے آگے اور پیچھے آہن پوش سواروں کے پرے کے پرے جتنے
 تھے جن کی دھت سے دلوں پہ لرزہ طاری ہوتا تھا پیادہ فوج کی صفیں ڈیڑھ کوس تک پھیلی
 ہوئی تھیں۔ بچے نگر کی فیصل پر سینکڑوں پروہت گہرے کپڑے پہنے سکھ بھونک رہے تھے۔
 مندروں اور شوالیوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور بچے نگر کی سلامتی کے لئے تلے تلے کلنگ اور گرز
 پر سواری کرنے والے دیشو سے پراعتنا کی جا رہی تھی۔ کرناٹک میں پوری شدت سے چلا رہی
 تھیں اور فیصل سے باہر میدان میں مورچوں کی طرح سپاہیوں کے لشکر دیکھ کر مظلوم ہوتا تھا
 کرناٹک کی تمام فوجی طاقت اس وقت بچے نگر میں سمٹ آئی ہے۔

سلطان نے اپنے لشکروں کا جائزہ لیا۔ پیادہ فوج اور سرنگ دونوں کو ملا کر سپاہیوں
 کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی جن میں نصف سوار تھے۔ تین صد ہاتھیوں کا ”سیاہ
 دستہ“ اس کے علاوہ تھا لیکن دیورائے کم از کم ایک لاکھ لشکرِ جوار کے ہمراہ قلعہ سے باہر آیا

تھا اور اس کا خیال تھا آج وہ ہمیشی حریف کا خاتمہ کر کے ہی لوٹے گا۔

سلطان نے لشکروں کو آراستہ کیا۔ مینہ پر شہزادہ حسن اور میسرہ پر ارگو خاں کے سوار کھڑے کئے۔ قلب میں خود جم گیا۔ سلطان کا پرچم ہشیار عین الملک نے سنبھال رکھا تھا۔ بیدار نظام الملک بھی اُس کے قریب ہی تھا۔ اس نے حکم دیا تھا اگر عین الملک شہید ہو جائے تو ہمیشی پرچم نظام الملک سنبھالے گا۔ علاوہ اکثر عسکری دستوں میں لڑتے تھے۔ سلطان کی خاص اجازت پر لشکر قلب میں اس کے آس پاس ہی جمع ہو گئے تھے۔ آج کے معرکے میں وہ سلطان کے قریب ہی رہنا چاہتے تھے۔ کوسل رائے جو ہر اول دستوں کی قیادت کرتا تھا۔ سلطان کے عقب میں صف آرا تھا لیکن قباچہ خاں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سلطان نے گزشتہ رات ہی اُسے دو ہزار سپاہیوں کے ہمراہ کسی مہم پر روانہ کر دیا تھا۔

کرتا گئی سپاہ کا مینہ سینا پتی راج سنگھ کی قیادت میں تھا۔ مہاراج چتر رداں کے زیر سایہ ہتھیار سوار خود قلب پر جما ہوا تھا۔ اس کا میسرہ بنے مگر کے ظالم ترین جنگی سردار سنگرام نے سنبھال رکھا تھا جو رائے دایاں کے خاندان ہی کا ایک فرد اور رشتہ میں دیورائے کا چچا تھا۔ فوج کی قیادت مہاراجہ خود کر رہا تھا اور سابقہ تجربوں کے پیش نظر ایک ہزار ہاتھیوں کی فوج قلب کے آگے آراستہ کرنے کی بجائے میسرہ کے ایک رخ کھڑی کی گئی تھی اور اس کے پیچھے سواروں کے ایک دستہ کے علاوہ پیدل سپاہ کا ایک بھی آدمی نہیں تھا غالباً یہ احتیاط مد نظر رکھی گئی تھی کہ اگر ہاتھی مشغول ہو کر بھاگیں تو اپنی ہی سپاہ کو بکھلتے نہ پہلے جائیں۔

بڑے بڑے جنگجو اور تجربہ کار سوار، آہن پوش راؤ، اور گیروی چادروں میں لمبوس مہاراجہ مہاراجہ کے جنگی ہاتھی کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے یوں کھڑے تھے جیسے اس کے اشاروں پر تیروں کی مانند کمان سے نکل جائیں گے۔ دیورائے نے ہاتھی کے ہودے سے دونوں فوجوں کا جائزہ لیا اور اپنی سپاہ کی کثرت پر خوش ہوئے بغیر نہ رہ سکا اگرچہ اس وقت میدان میں ایک اور پانچ کا مقابلہ تھا لیکن وہ اس بات پر مطمئن تھا کہ قلعہ کے اندر چار گناہ سپاہ موجود ہے جو اُس کے ایک اشارہ پر صف آرا ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی پوری فوج لے کر نکلے اور عام حملہ شروع کر دیتا تو کچھ عجب نہ تھا اس کا بڑی دل ہمیشی سپاہ کو اپنے گھوڑوں کے سموں ہی سے کھل کر رکھ دیتا مگر مہاراجہ جانتا تھا۔ سلطان کو فوج کی کثرت سے ہراساں

نہیں کیا جاسکتا۔ کیا دوسرے پہلے وہ اس کا تجربہ نہیں کر چکا تھا۔

مہماتروں کی ایک ٹولی فیصل پر سنگھ بھونکنے میں مصروف تھی۔ سنگھوں کی ڈراؤنی آوازوں نے فضا میں ایک عجیب سی دہشت طاری کر دی تھی اچانک کرناٹکی فوج سے ایک سوار گھوڑا دوڑا کر آگے بڑھا اور دونوں فوجوں کے درمیان پہنچ کر تلوار لہرانے لگا۔ یہ آہن پوش راؤ سینا پتی کی فوج سے نکل کر آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے شمشیر خاں نے دلی عہد سے اجازت حاصل کی اور مقابلہ پر پہنچ گیا۔

راؤ نے اپنے داؤ سے شمشیر خاں کو ہراساں سا کر دیا وہ اپنا گھوڑا دور دور ہی رکھتا تھا۔ شمشیر خاں ایک جگہ کھڑا بڑے غور سے اس کے گھوڑے کی اچھل کود دیکھتا رہا پھر اس نے برہتھی کی بجائے نیزہ سنبھالا اور اسے سیدھا کر کے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ دوسری ساعت راؤ کے لئے قیامت خیز ثابت ہوئی اور وہ خرابا ہوا گھوڑے سے نیچے آ رہا۔ پھر شمشیر خاں کا گھوڑا جب پلٹ کر آیا تو اگلے سوں سے راؤ کا سر کپٹنے لگا۔

دیورائے نے شمشیر خاں کو پہچان لیا تھا۔ وہ سانپ کی طرح لہریا بھر اس کے اشارہ پر راج سنگھ خود اپنا گھوڑا اڑاتا ہوا سامنے آ گیا لیکن شمشیر خاں تو بھوکا بیڑیا بن گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر سینا پتی کا بھی حساب چکا دینا چاہا۔ وہ گھوڑا پچا کر نکل گیا لیکن نیزے کی نوک اس کے خود میں چھید کر گئی تھی اور پیشانی سے خون کی ایک لکیر بھی پھوٹ نکلی تھی۔ وہ بدحواس سا ہو گیا اچانک شمشیر خاں نے نیزہ چھوڑ کر اپنا برچھا نکالا جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ مہاراج دیورائے کے چہرے پر زخم لگا چکا تھا۔ سنگھ پھٹکی کی طرح تڑپ کر اس کے قریب سے نکلا۔ اگر شمشیر خاں جھک نہ گیا ہوتا تو تلوار اس کی گردن کاٹ چکی ہوتی لیکن شمشیر خاں کو برا فروختہ کر کے وہ خود بھی کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس نے بظاہر سنگھ کے پیلو میں برچھانا مارا تھا لیکن جب ہاتھ اٹھا تو کرناٹکی سینا پتی کا چہرہ لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔ شمشیر خاں نے برہتھی کی نوک سے اس کے چہرے پر بھی لکیر کھینچ دی تھی اور دور۔۔۔ ہاتھی پر بیٹھے ہوئے دیورائے نے دیکھ لیا تھا کہ شمشیر خاں نے سنگھ پر بھی اپنا مخصوص ہاتھ چلا دیا ہے۔

اچانک مہاراج نے ہاتھ کے اشارہ سے فوج کو عام حملہ کا اشارہ کیا۔ فوج کا مینڈ جو راج سنگھ کی سرکردگی میں تھا دیوانہ وار آگے بڑھا۔ ادھر شہزادہ حسن نے بھی حرکت کرنے میں دیر نہیں کی۔ تھوڑی ہی دیر میں راج سنگھ خون میں تر اپنے لشکر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

شمشیر خاں نے تعاقب نہیں کیا وہ گھوڑا موڑ کر اپنے دست میں واپس آ گیا۔

دونوں لشکر کھڑے اور ہتھیاروں کی کھنا کھٹ شروع ہو گئی۔ اس ہنگامہ میں شمشیر خاں اپنے شکار کو ڈھونڈ رہا تھا لیکن کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جھلایا ہوا وہ کرناٹکی سواروں کا صفایا کرنے لگا۔

پھر دونوں میسرے بھی ایک دوسرے سے کھڑے یہ دو خوفناک بھٹیڑوں کا ٹکراؤ تھا ارگو خاں اور رادو سنگرام۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ شہزادہ حسن نے کرناٹکی فوج کے قلب کو حرکت کرتے دیکھا لیکن سلطان بدستور اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ حیران ہوا دیورائے کو روکنے کے لئے سلطان اپنا لشکر آگے کیوں نہیں بڑھاتے؟

نجانے کیوں اس وقت شہزادہ حسن کے دل میں یہ خواہش کروٹیں بدلنے لگی کہ وہ دیورائے کے مقابلہ پر خود آگے بڑھے لیکن وہ نہایت خاموشی کے ساتھ حالات کو دیکھتا رہا جو نبی مہاراجہ کا لشکر ڈیڑھ دو سو قدم کے فاصلہ پہ رہ گیا سلطان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کے ساتھ ہمکنی سوار یوں پیچھے پیچھے زچہ شیر اپنی کچھاروں سے نکلتے ہیں۔ دیورائے اپنی فوج کی کثرت کے نش میں بہت آگے نکل آیا تھا اسے اپنی خفاقت کا احساس اُس وقت ہوا جب سلطان کے خاص اشارہ پر ہمکنی لشکروں کے سینہ اور میسرہ کی پچھلی صفیں دیورائے کے قلب کی طرف ٹوٹ پڑی تھیں۔ اب شہزادہ حسن بھی سلطان کے داد کو سمجھ گیا وہ اسی لئے آگے بڑھا کہ دیورائے حملہ کے جوش میں اس خط تک آگے بڑھ آئے کہ ہمکنی فوج کے سینہ اور میسرہ کی آخری صفیں اُس کے عقب پہ آ جائیں اور اُسے با آسانی گھیر لیا جائے۔ وہ جانتا تھا جنگ کا فیصلہ قلب ہی میں ہو گا جسے دیورائے بد نصیب نہیں لڑا رہا تھا۔

شہزادہ حسن خاں نے ایک لمحہ کچھ سوچا پھر فلولاد خاں سے مخاطب ہوا جس نے ابھی ابھی ایک کرناٹکی سوار کا بیٹ پھاڑ ڈالا تھا۔

”فلولاد خاں! لشکر کو سنبھالنا۔“

”جان عالم۔“

وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ حسن خاں کا گھوڑا اُسے لے کر ہوا ہو گیا تھا پھر فلولاد خاں کی نگاہوں نے دل دہلا دینے والا نظارہ دیکھا۔ نجانے کس طرح شہزادہ حسن سواروں کو کاٹتا ہوا

کرنا کئی قلب میں گھستا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور سوار بھی تھا جس کا ہر چھانچل کی طرح کوہنہ رہا تھا۔ نولا د خاں فوراً سمجھ گیا وہ شمشیر خاں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ شاید وہ دونوں کرنا کئی مہاراج کا پیچھلا قرض بے باک کرنے جا رہے تھے۔

ایک ٹائیہ کے لئے سیتانی بہادر کانپ اٹھا۔ اُس کے نزدیک ولی عہد کا یوں تنہا دشمن کی صفوں میں گھس جانا مناسب نہیں تھا لیکن وہ حسن خاں کو کس طرح سمجھاتا جوش انتقام میں دیوانہ ہو رہا تھا پھر ولی عہد کا دھیان چھوڑ کر فوراً ہی اُسے سامنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ راج سنگھ جس کے زورہ بکتر پر خون کے دھبے جم گئے تھے اپنے غضب آلود چہرے کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا آ رہا تھا شاید اُسے شمشیر خاں کی تلاش تھی۔ اپنے گھوڑے کی پشت ہی سے سلطان نے شہزادہ حسن اور شمشیر خاں کو کرنا کئی قلب میں مہمتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے بدن پر ایک کچھی سی طاری ہوئی۔ نظام الملک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔
 ”اُدھر مہاراجہ دیورائے کے ہاتھی کی طرف بڑھو۔“

اور دونوں نے اپنے گھوڑے انسانوں کے سمندر میں ڈال دیئے۔“

شہزادہ دیورائے کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا اُس نے ایک راؤ کو تلوار کی نوک سے نیچے دھکیل کر نیزہ سنبھال لیا۔ اچانک عقب سے آواز آئی۔

”جان عالم! یہ میرا لشکار ہے۔“

لیکن حسن نے ہلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس کا نیزہ کئی سروں کے اوپر سے سیلاب کی لہر کی مانند سنسانا ہوا تیرتا چلا گیا اور دیورائے کے شانے کے نیچے عین بغل میں کھب گیا۔ حسن خاں نے دیکھا اس کے نیزے کے ساتھ ایک اور نیزہ بھی تھا اور وہ مہاراجہ کی پیٹلیوں سے ٹکرایا تھا۔

پھر اُس نے دیورائے کو لڑکھڑاتے ہوئے ہودج میں گرتے دیکھا اس کا ہاتھ جس میں ایک بھالا پکڑا ہوا تھا اوپر ہی اٹھا رہ گیا۔ نیزہ ہودج کے کناروں سے الگ ہوتا نکلتا اور تل کی کھاتا ہوا نیچے آگرا لیکن دوسرے ہی لمحے حسن خاں پر بیک وقت چندہ میں تلواریں لہرائیں۔ دیورائے کے آس پاس سوار ماراؤ اس پر بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ تھے اُس نے نیزہ گھماتا شروع کر دیا اور تین چار تلواریں فضا میں اڑتی نظر آئیں۔ شمشیر خاں اُس کے عقب ہی میں تھا لیکن وہ بھی بیک وقت کئی دشمنوں میں گھرا ہوا تھا اور ان دونوں کا اس

ہجوم سے بچ نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا تھا۔
تکواروں کا رقص جاری ہو گیا۔

اچانک شہزادے نے ہودے سے دیورائے کے کراہنے کی خیف سی آواز سنی لیکن وہ جانتا تھا کہ نیزوں کی ضرب جان لیوا نہیں تھی۔ اگر مہاراجہ گھوڑے پر سوار ہوتا تو بلاشبہ حسن خاں نے اس کا سر کاٹ کر نیز پر چڑھا لیا ہوتا۔ اس کے سر پر کچھ ایسی ہی دشت سوار تھی۔ وہ دیورائے کا لہو چائے بغیر لوٹنے والا نہیں تھا لیکن اب خود اس کے گرد موت کا طلقہ قائم ہو چکا تھا اور وہ اس دائرے میں ایک ناؤ کی طرح پھنس کے رہ گیا تھا جس کے چاروں طرف طوفان کی وحشی موجیں اڑ رہی تھیں۔

اس نے سوچا جب تک دیورائے کا ہاتھی جمار ہے گا۔ وہ موت کے منہ سے نہیں نکل سکتا پھر اس نے ہانگ موڑی اور لہرائی بجلیوں میں ہاتھی کی طرف پلٹا۔

اس کے بازوؤں میں گئی زخم آچکے تھے جن سے لہو دس دس کر پھٹنے لگا تھا۔ ممکن ہے شمشیر خاں کی حالت مزید ابتر ہو۔ جب وہ وہاں سے ہٹا تھا اس وقت شمشیر خاں دیوانہ دار برچھا چلا رہا تھا۔ ممکن ہے مرنے سے پہلے وہ زیادہ سے زیادہ دشمنوں کو ہلاک کر دینا چاہتا ہو لیکن حسن خاں دیورائے کے ہاتھی تک نہ پہنچ سکا۔ سینکڑوں برقیاتش تکواروں نے اس کا رستہ روک لیا تھا۔

وہ یوں کب تک لڑتا اور بچتا رہے گا۔ نیزہ مارنے میں بمشکل ہی اس کا کوئی حریف ہو سکتا تھا۔ یہ فن اسے امیر فضل اللہ آنجو نے سکھایا تھا مگر ہزاروں دشمنوں کے زرخیز میں صرف وہ آدمی خواہ وہ کتنے ہی بہادر اور فنون جنگ کے ماہر ہوں آخر کار ہی کیا کتے بچے۔ شہزادہ حسن نے سوچا تھا وہ آگے بڑھ کر دیورائے کے ہاتھی پر حملہ کرے اور اس کے پچھلے پاؤں نیزے کی ٹوک سے زخمی کر کے اسے کسی جتنی سمت بھگا دے۔ جب مہاراجہ کا ہاتھی بھاگ نکلے گا تو کرناٹکی فوج کے پاؤں بھی اکھڑ جائیں گے۔ یہاں سے بچ نکلنے کی بس بکری ایک تدبیر ہو سکتی تھی مگر وہ ہاتھی تک پہنچ ہی نہیں پایا تھا۔

ناگہاں ایک بھالا سروس پر حیرت ہوا آیا اور حسن خاں کے پہلو میں آکھبا۔ اس نے گھوڑے پر ایک چھری سی سی لی پھر نیزہ کھینچ کر ایک راؤ کے حلق میں دے مارا۔ میدان میں ہاؤ اور چیخوں کا اتنا شور تھا کہ راؤ کی چیخ اس میں گھل مل کر رہ گئی وہ ایک گھماکن چیل کی

لرح پھڑ پھڑاتا ہوا گھوڑے کی پیٹھ سے لڑھک گیا اور اس کا مشتعل گھوڑا جنگ سے دائرہ میں نہہتا ہوا چکر کاٹنے لگا۔ حسن خاں کے پہلو سے خون کا فوارا ابل پڑا تھا۔ سینہ بندی دو کڑیاں بھی ٹوٹ کر بدن میں کھب گئی تھیں لیکن اب اتنی مہلت ہی کہاں تھی کہ وہ زخم باعدہ ہی سکتا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر اب وہ لڑکھڑانے سا لگا تھا۔

بچے نگر کے میدان میں اس وقت موت کے فرشتے بڑی سرعت کے ساتھ انسانی رو جس قبض کر رہے تھے۔ چاروں طرف انسانوں کا طوقان لہریں مار رہا تھا اور طوقان کی ابھرتی، دودھتی اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی لہروں میں تلواریں یوں چمک رہی تھیں جیسے سیلاب کے دھارے بھوٹ رہے ہوں۔

انسان انسانوں سے جھم گھٹا تھے۔

موت کی خرفرائیں، زخموں کی چھیں، تلواروں کی کھٹا کھٹ اور نیزوں کی سنسنائی اڑائیں بس یوں لگتا تھا۔ صور محشر پھونک دیا گیا ہو۔ ڈرے ہوئے بے سوار گھوڑے پاگل کتوں کی مانند ادھر سے ادھر دوڑتے اور نہہتا پھرتے تھے۔ ان کے سموں تلے بے شمار زخمی کپکپے جا چکے تھے۔

پورے کرناٹک کی تاریخ میں اتنی خوفناک جنگ اس سے پیشتر شاید لڑی ہی نہیں گئی تھی۔ دونوں فوجیں صبح ہی صبح صف بست ہو گئی تھیں۔ اس وقت سورج سروں کے اوپر چمک رہا تھا۔ لڑنے لڑتے دوپہر آگئی تھی اور اب تک کئی ہزار انسان زخمی انسانوں کی فہرست سے خارج ہو چکے تھے۔ آسیائے مرگ نہایت تیزی کے ساتھ گردش کر رہی تھی۔

کرناٹکی فوج کا قلب چاروں طرف سے گھیر چکا تھا اور لڑائی کا زور بھی اسی حصہ میں تھا۔

راؤ سکرام نے دیکھ لیا تھا۔ بھٹی سواروں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مہاراجہ کے لشکر کو گھیر لیا تھا۔ اگرچہ چھ سات ہزار سواروں کا چالیس ہزار سپاہیوں کے گرو حلقہ ڈال لینا ایک مشکلہ خیزی بات تھی، پھر بھی وہ اپنی فوج کے قلب کے گرد یہ گھیرا توڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بہادروں کو قلب کی طرف بڑھنے کا حکم دیا لیکن ارگو خاں ایسے خونی بھیڑیے کورستہ سے بنا دینا آسان کام نہیں تھا۔

شہزادہ حسن کی حالت نازک ہو گئی تھی کیونکہ سلطان کی چٹنی ہوئی آواز میں خطرے کی

تقرقر ہاٹ چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے عین الملک اور نظام الملک کو جلد از جلد مہاراجہ دیورائے کے قریب پہنچنے کا حکم دیا تھا مگر کرنائی سور سے سیسہ پلائی ہوئی دیوار پہنچے جا رہے تھے۔ اچانک سلطان کی نگاہوں نے ایک زہرگداز اور لرزہ خیز منظر دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا پھر سپاہیوں میں پہلی مرتبہ ہمکنی حکمران کے ہونٹوں سے ایک روح فرسا چیخ نکلتی تھی۔

بے شمار آنکھیں سامنے کی طرف اٹھ نکلیں اور کرنئی سپاہیوں کے جسم کانپ اٹھے۔ شہزادہ حسن جلوہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مہاراجہ دیورائے کے جنگی ہاتھی کی سوڈ میں جکڑا فضا میں بلند ہو رہا تھا شاید کرنائی سواروں نے اس کا جسم تک چھلنی کر دیا تھا۔ سلطان نے بوکھلا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو شہزادہ حسن کے ایک بازو نے تیزی سے جنبش کی۔ سلطان چیخ اٹھا۔

”ابھی وہ زندہ ہے۔“

اچانک سرخ رنگ کا ایک حیران کے مردوں کے اوپر سے سنسانا ہوا گزر گیا اور سیدھا ہاتھی کی آنکھ میں جا بیوست ہوا۔ ایک قیامت آفریں چنگھاڑ سے سارا میدان دھل اٹھا۔ دیورائے کے ہاتھی نے بڑے زور سے بھر جھڑی لی۔ شہزادہ حسن کی سوڈ کی گرفت سے نکل کر زمین پر آ رہا۔ ہاتھی پوری وحشت کے ساتھ چنگھاڑتا ہوا اپنے اس پاس پھیلے ہوئے کرنائی سواروں پر حملہ آور ہوا۔ مہابت کے آنکس بھی اس کو قابو نہ کر سکے۔ سوار ہراسیدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگے پھر مشتعل ہاتھی اپنے ہی لشکر کی طرف پلٹ پڑا اور بے تحاشہ بھاگتا چلا گیا۔

اسی دوران میں شہزادہ حسن پنجر اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا لیکن اب شاید وہ لڑنے اور کوار چلانے کے قابل نہیں تھا اس کے بدن سے کم و بیش دو پیالے خون بہہ چکا تھا۔ ہاتھی کے مشتعل ہو جانے کی وجہ سے کرنائی سواروں کے پرے چھٹ گئے تھے۔ بھاگتے ہوئے ہاتھی پر مہاراجہ سنبھالا لے کر خود کھڑا ہوا اس نے سپاہ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا لیکن اس کے جسم کو لہو لہبان اور ہاتھی کو داپس قلعہ کی طرف بھاگتے دیکھ کر سپاہیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور سب بھاگ نکلے شاید وہ اس کے اشارہ کو داپس کا حکم سمجھتے تھے۔ اب ہمکنی سوار بھاگتے ہوئے سپاہیوں کا تعاقب کر رہے تھے۔ قلعہ کا دروازہ کھول دیا

گیا مگر جوئی شکست خوردہ فوج پہاڑی گھاٹیوں کا دامن عبور کرنے لگی۔ قباچہ خاں کے دو ہزار سپاہی جو چٹانوں میں ڈبکے اُس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے بلائے ناگہانی بن کر ٹوٹ پڑے۔ کرناٹکی سپاہی حیران و ششدر تھے۔ موت کے یہ فرشتے اچانک کہاں سے نکل آئے۔ وہ ہتھی تیر کھا کھا کر مرنے لگے اور گھوڑوں کی پشتیں جلد جلد خالی ہونے لگیں۔ سلطان اس کامیابی کو ایک معجزہ ہی سمجھتا تھا۔ صرف ایک تیر نے میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ سرخ رنگ کا تیر وہ سوچنے لگا۔ کبھی تیر اندازوں کے تیر تو سیاہ ہوتے ہیں پھر یہ سرخ تیر کس نے چلایا تھا؟ اس نے نظام الملک کو حکم دیا وہ تیر انداز کو تلاش کرے اور خود عین الملک کے ہمراہ ولی عہد کی طرف بڑھا جو بھاگتے ہوئے سپاہیوں پر جھلایا ہوا سا جھپٹ رہا تھا لیکن گھوڑے کی پیٹھ پر بھی بمشکل ہی بیٹھا تھا اس کا سارا جسم لبو سے سرخ ہو رہا تھا اور نقاہت سے بار بار جھول جاتا تھا البتہ چہرے پر وحشت اور ہاتھ میں کھوار ابھی تک موجود تھی شاید یہ کبھی خون ہی تھا جس نے اس حالت میں بھی کھوار کے قبضہ پہ اس کی گرفت ڈھلی نہ ہونے دی تھی۔ سلطان نے لپک کر اسے سنبھالا اور خود اس کے گھوڑے پہ سوار ہو گیا۔

باپ کو دیکھ کر شہزادہ حسن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی پھر ان ہونٹوں کو ہولے ہوئے جنبش ہوئی۔

”منزل سبحانی اشمیر۔۔۔ خاں۔۔۔“

اُس نے ہاتھ سے لاشوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ شمشیر خاں زخمی ہو کر ابھی لاشوں میں دب کے رہ گیا تھا جنہیں حسن خاں کی کھوار نے مار گرایا تھا۔ عین الملک گھوڑے سے کود پڑا۔ شمشیر خاں کی بغض چل رہی تھی لیکن پہنچ نہیں تھا۔

دیوار کے ایک ذلت آمیز ٹکست اٹھا کر پھر قلعہ بند ہو گیا تھا۔ ان مرتبہ شمشیر خاں کے علاوہ اُس نے شہزادہ حسن کے نیزے کا زخم بھی کھلایا تھا اُس کے تین ہزار سپاہیوں نے اپنے خون سے اُس کی شکست کی تحریر لکھی تھی جن کی لاشیں چاروں طرف پٹی کے تودوں کی طرح نکھری پڑی تھیں۔

دس ہزار کے قریب گرفتار ہوئے۔ تھے جنہیں قباچہ خاں نے لشکر گاہ کی طرف بانٹ دیا تھا ان میں زخمی بھی تھے۔

سلطان جب شہزادہ حسن خاں کو لئے اپنی بارگاہ کے دروازے پر پہنچا تو نظام الملک ایک نوجوان کے ہمراہ اس کا خطر تھا۔ جس کے کندھے پر لٹکتے ہوئے ترکش میں سرخ رنگ کے تیر دیکھ کر سلطان چونک اٹھا پھر اس نے نوجوان کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو دم بخود رہ گیا۔ شدت حیرت سے اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

”پر۔۔۔ تھا۔۔۔ ل۔۔۔“

نوجوان کے بھیس میں مدھل کی جادوگر سفید پر تھاں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے جبک کر کورٹش ادا کی۔ سلطان نے پوچھا۔

”لیکن تم بچے تکرب آئیں؟“

”کنیز آج ہی پہنچی ہے سلطان عالی!“

”تمہارے اس طرح آنے کا مقصد؟“

”عظمیٰ بھائی! کل رات آپ کی بیٹی نے ایک بھیا تک پہنا دیکھا تھا۔ بس وہی مجھے یہاں پہنچ لایا۔“

پھر پرتھالی نے بتایا۔ اس نے خواب میں جان عالم کو ایک بھیا تک اور خطرناک دیو کے منہ میں دیکھا تھا۔ جس نے اپنے لیے رانت شہزادہ کے جسم میں گاڑ دئے تھے۔ یہ وحشت ناک پہنا دیکھ کر وہ ایک چیخ مار کر جاگ اٹھی اور محل کی کنیزوں اور خواجہ سراؤں میں ایک کھرام مچ گیا۔ انہیں خیال آیا شاید بانو پر پھر کسی نے کالا ناگ چھوڑا ہے۔ وہ اسی وقت بیگم جہاں کے حضور پہنچی اور اپنا بھیا تک پہنا علیہ خام کے گوش گزار کیا اگرچہ وہ خود بھی فکر مند ہو گئی تھیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ یہ خواب صرف وہم کا نتیجہ ہے۔ اُسے اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جانا چاہیے۔ مگر یہ بہت ناک پہنا دیکھ لینے کے بعد فیروز آباد اُسی کی نظروں میں تاریک ہو گیا۔ سارے دکن اور حیدرآباد اپنے منہوں پر دم کو پھیلانے بھڑوٹوں کی طرح ناچتے ہوئے دکھائی دیے اور غم نے اُس کی آنکھوں سے نالہ توڑ لیا۔ ابھی فیروز آباد میں صبح کی لڑان گونجی تھی کہ اُس نے اسٹبل سے ایک تیز رفتار گھوڑا منگوایا اور جنگ کے خیال سے اپنی حفاظت کے لئے تیرکار لے کر بچے مکر کی طرف بھاگی۔ یہاں پہنچ کر اُسے وہ تیر جان عالم ہی کی حفاظت کے لئے چاہنا پڑا۔

سلطان، شہزادہ حسن اور دوسرے لوگ اس کی داستان سن کر جسمہ حیرت من گئے۔
 ”لیکن تمہیں تیر اندازی کس نے سکھائی تھی؟“

”میرے گورد دیو نے سلطان معظم! وہ موسیقی کے ساتھ مجھے تیر اندازی بھی سکھایا کرتے تھے ان کا خیال تھا مجھے اپنی زندگی میں عجیب و غریب واقعات سے دو چار ہونا پڑے گا اس لئے مجھے شہسواری اور تیر اندازی کی تربیت بھی دیتے رہے۔“

ان دونوں خوبیوں پر سلطان نے اُسے تحسین و آفریں کہی۔ پرتھال کو دیکھ کر دی عہد کو بھی چند لمحوں کے لئے اپنے زخم بھول گئے۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ اس کی زندگی اُس کی ”جان زندگی“ ہی نے بچائی ہے تو اس کے خون آلود چہرے پر شکر مندی کے آثار پیدا ہوئے مگر جان عالم کو اس حال میں دیکھ کر پرتھال کے دل پر کیا گزر رہی تھی؟

وہ خود اچھا کرنے والی تھی کہ ظلم سبائی! باتیں پھر ہو لیں گی۔ پہلے جان عالم کے زخم تو باندھ لیجئے میں جانتی ہوں وہ دیو رائے سے میری ہی تو ہیں کا بدلہ چکانے کے لئے موت کے من میں جا کوئے تھے لیکن بھگوان کے لئے مجھے سنبھالنے۔ جان عالم کو اس حال میں دیکھ کر میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے مگر ناگہاں سلطان کی آواز گونجی۔

”عین الملک! زخمیوں کو خیمے میں لے چلو۔ جان عالم کے بدن سے خون بہت نکل چکا ہے اور نظام الملک! تم حکیم کا زدن کو لے کر فوراً ہماری بارگاہ میں آؤ۔“

بھردہ پرتھال کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے خیمے میں داخل ہوا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے یوں چل رہی تھی جیسے اب بھی کوئی پناہی دیکھ رہی ہو۔

شہزادہ حسن کی تیمارداری پرتھال ہی کے سپرد کر دی گئی اور حسن خاں کے زخم پھولوں کی طرح مسکرا اٹھے۔

فتح کی خبریں

بدبخت دیو رائے کا ستارہ بوزھے ان کی طرح گردش میں آچکا تھا جو جہاز یوں میں ڈبکے رہنے کے باوجود ہر وقت موت کے سرد پاؤں کی دھمک پر کان لگائے رکھتا ہے۔ سپاہ کے کثرت و اقربا ہم نے بھی اس کی بگڑی ہوئی فہرہ کو سہارا نہیں دیا تھا۔ وہ ایک لاکھ کا لشکر جہاز لے کر ان ارادے سے نکلا تھا کہ بمبئی حکمران کو گرفتار کر کے بے مکر میں داخل ہو

گا پھر اس کی لاش قلعہ کے دروازے پر لٹکا دی جائے گی لیکن اس وقت وہ خود بہتر پر پڑا
 رنوں سے کراہ رہا تھا اور نیم بے ہوشی کی حالت میں اُس کی آنکھوں کے سامنے چھوٹے
 چھوٹے نیلے، پیلے اور سرخ ستارے سے ناچتے، ٹوٹتے اور بھنور کی تیز لہروں پہ چکراتے
 ڈوبتے ہی چلے جا رہے تھے۔

بچے نگر۔۔۔ کرناٹک کا عظیم شہر، وید پکشا کا ویس ماتم کی صداؤں سے گونج اٹھا تھا۔
 تیس ہزار سورے خاک و خون میں لتھڑے مہاراج دیورائے کے تصور میں بھوت بن کر
 رقص کر رہے تھے اور ان کی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں اپنے بال نوپنے اور سینہ پیٹنے
 میں مصروف تھیں ان کی جگر گداز چھین راج رنواس کی دیواروں سے نکل آتی دیورائے کے
 سینے میں اترتی جا رہی تھیں اور اس کا دماغ جہنم کی جھلیوں کی مانند دھپکنے لگا تھا۔

اُن دیورائے کی تقدیر نے کیسا چرکا کھایا تھا۔ بھئی نیزے اس کی قوت کے سینے میں
 ترازو ہو چکے۔ تھے اور بچے نگر کے در و دیوار خاموشی کی زبان سے رائے ریاں کے عبرت
 ناک زوال پہ گریبان کھان تھے۔

سلطان فیروز شاہ بھئی سکندر تالی کے بخت و اقبال کا ستارہ بچے نگر کی بلندیوں پر
 چمک رہا تھا اور سورما مہابیر اُس کا نام نہ کر سکتی شاخون کی مانند کاچھ لگے تھے۔

کرناٹک کے شہروں سے دل حراش خبریں آرہی تھیں۔ بھئی امیر امرا احمد خاں
 خانخاناں جنوب کی طرف قلعوں کو رو دیتا اور اُن پر سیاہ پرچم اڑاتا کرناٹک کے اندر گھستا جا
 رہا تھا اور کرناٹکی سرداروں کے سر سلطان کی خدمت میں چلے آ رہے تھے جو بچے نگر کے
 میدان میں شمشیر بکف ابھی تک زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ شہزادہ حسن کے مہلک رنوں
 نے اُسے غیظ و غضب کا پیکر بنا دیا تھا اور اُس نے قسم کھائی تھی وہ مہاراج دیورائے کو خون
 میں غسل دیے بغیر نہیں لوٹے گا۔ بھئی ولی عہد کے لہو کی ایک ایک بوعد کا حساب چکایا
 جائے گا جو بچے نگر کی مٹی میں جذب ہوا تھا۔

شہزادہ حسن کے زخم مندمل ہو رہے تھے اور پرتھال آسموں پہر اُس کی تار تار کی کرتی
 تھی خود سلطان نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے دیوانہ وار محبت
 کرتے تھے۔ پرتھال ساری ساری رات اپنی آنکھوں ہی میں کات و بیتی اور ہر لمحے اُس کے
 آرام کا وحیان رکھتی تھی۔ اس نے جان عالم کی صحت کے لئے درد و کراپے بھگوان سے

پراگھتا بھی کی تھی۔ وہ ہر روز اس کی آرتی اتارتی اور اپنی پوجا کے پھول اس کے چنوں پہ
 جینٹ کرتی تھی۔ محبت اور پیار کا یہ انداز کتنا مقدس اور روح نواز تھا۔ یہ پیار تو مردوں کی
 بھی میسائی کرتا ہے۔ اس کا اعجاز دیرانوں میں پھول کھلاتا اور پیاڑوں کے جگر گداز کر سکتا
 ہے پھر شہزادہ حسن کے دھم کیوں مندل نہ ہو جاتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ چلنے پھرنے لگا
 اور سلطان نے محسوس کیا یہ سب پیار کی میسائی ہے محبت کا کرشمہ اور پرتھالی کی دعاؤں اور
 تیار داری کا اعجاز ہے میدان سے لوٹتے ہی حسن کی بغضیں ڈوبتی جا رہی تھیں اور حکیم کا زونی
 کے چہرے پر زردیاں سی تھوڑھانے لگی تھیں جیسے اُس نے بہت دور۔۔۔ کہیں موت کی آواز
 سن لی ہو۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر سلطان کا دل بھی کانپ اٹھا تھا اور ہنسی امرا یوں چپ
 تھے۔ جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ خیمے میں پہنچتے ہی دلی عہد پر بے ہوٹی طاری ہو گئی تھی
 اور اپنی توتہ ارادی کی سخت جدوجہد کے باوجود وہ اُس غشی کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا
 تھا۔ جس نے ہمیشہ خیموں پر موت کی سی افسردگی طاری کر دی۔

حکیم کا زونی کے چہرے کی پریشانی سب نے دیکھ لی تھی۔ سچ مچ موت کا قافلہ اپنی
 نادیہ منزلوں سے روانہ ہو چکا تھا اور اس کے پاؤں کی دھک سے ہمیشہ سرداروں کے دلی
 کانپ اٹھے تھے لیکن یہ صرف پرتھالی تھی جس نے اپنی محبت کو اس بے کسی کے ساتھ موت
 کے سرد ہاتھوں لٹ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھار دیکھ کر
 خود سلطان کا دل بھی دو شرم ہو گیا تھا۔

کیا اُس کا فرزند۔۔۔ ہمیشہ تاج و تخت کا وارث پر دیس میں لٹ جائے گا؟

یہ خیال کس قدر امد و ہناک اور کرب آمیز تھا۔ سلطان نے کپکپا کر اپنے چہرہ کو
 ڈھانپ لیا اور تیز قدموں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا پھر دوسرے سردار بھی ہٹ آئے
 تھے اور پرتھالی صرف پرتھالی اپنے محبوب کو ایک مرتبہ پھر موت کے ہاتھوں سے جھین لائی
 تھی۔ اس نے دلی عہد کے چنوں میں بیٹھ کر کس رقت کے ساتھ ایشور سے پراگھتا کی
 تھی۔ شہزادہ کے پاؤں اس کے آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے اور چند ہی لمحوں کے بعد موت
 کا کارواں پھر اپنی منزل کی طرف لوٹ گیا تھا اس کی پراسرار گھنٹیوں کی مدھم سی آواز پرتھالی
 کی سسکیوں میں ڈوب گئی اور دوسرے کمرے میں جب سلطان اپنے سرداروں کے ساتھ
 افسردہ و غمگین کھڑا اپنے دل کو بیٹے کی موت کی خبر سننے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اس نے

پرتھال کی مسرت افزا جج سنی تھی۔ "جان عالم۔۔۔"

وہ ایک کرشنراوہ کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اُس کی روح خدا کے حضور
سربسود ہو گئی تھی کہ شہزادہ حسن موت کا مسافر پرتھال کے ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں تمہیں اس طرح بے سہارا چھوڑ کر مر بھی نہیں سکتا۔ میں نے تمہیں جو
قول دیا تھا پورا ہو گا۔ تم سلطان کی بہو بنو گی۔ دکن کی مہارانی۔"

اور پرتھال نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جان عالم! مجھے صرف آپ کی زندگی چاہیے۔ تخت و تاج نہیں میں تو صرف پیار کی
بھوک ہوں۔ آپ کے چرنوں کی دھول۔"

محبت کا یہ عجیب اور بگداز منظر دیکھ کر سلطان کی آنکھیں بھی بجج گئی تھیں آگے بڑھ
کر اُس نے پرتھال کے سر پہ اپنا ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"نہیں بانو! تم کسی کے چرنوں کی دھول نہیں۔ تم ایک پوتر دیوی ہو، سچائی کی روح،
ہم تمہیں ولی عہد کے ساتھ دکن کے تخت پر بیٹھنے کی اجازت دیں گے۔"

پھر سلطان مسرت سے جھومتا اور مسکراتا ہوا خیمے سے نکل گیا تھا اور ایک ہی ثانیہ کے
بعد ان دونوں نے لشکر کا: ہے ایک غلطہ انداز نعرے کی آواز سنی تھی۔ ساری افشار لڑائی تھی

اور قرنا کی آواز نے انہیں چونکا دیا تھا۔ وہ کچھ شاید سلطان نے لشکر لڑنے کو ولی عہد کی صحت کا
مژدہ سنایا ہے لیکن انہیں فوراً ہی معلوم ہو گیا۔ امیر فضل اللہ آنجو شیرازی نے پیکا پور کا قلعہ

فتح کر لیا تھا اور قلعہ کے راؤ کے ہمراہ قیدیوں کا ایک تانڈہ بھی روانہ کیا تھا۔ شہزادہ حسن کی
زندگی کا مژدہ اور پیکا پور کی فتح کی خوشخبری فوج نے ایک ساتھ سنی تھی اور جوش مسرت میں

ان کے نعرے اب بچے مگر کی صداؤں کو لرزا رہے تھے۔

سلطان بے حد مسرور تھا۔ اُس کے لشکروں نے کرناٹک کو روند ڈالا تھا۔ بچے مگر ان
ادوی کو چھوڑ کر تمام قلعے سر ہو گئے تھے۔ مہاراج دیورائے کی روح مدافعت زخمی ہو چکی تھی

اور اب سلطان اُس پر اپنا حکم نافذ کئے بغیر نہ رہے گا۔

اس نے پیکا پور سے آنے والے غلاموں اور کینڑوں کو قیدیوں کے خیموں میں بھیجے
حکم دیا اور خود اپنی بارگاہ میں پہنچ کر امیر فضل اللہ ابوز خان خاناں کو پیغام تکھوانے لگا۔ مفتوحہ

قلعوں پر عامل مقرر کرتے کرتے بعد اُس نے دونوں سرداروں کو بچے مگر بوت آنے کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



احکام صادر کئے تھے۔ اب وہ دیورائے سے نپٹنا چاہتا تھا۔

بھئی لشکر گاہ میں ابھی تک نعرے گونج رہے تھے اور بیچے مگر کی تفصیل پر ہزاروں کرناٹکی سپاہی کھڑے حیران و ششدر تھے۔ یہ نعرے کس خوشی میں بلند ہو رہے ہیں۔ کیا بھئی فوج کو کہیں سے ناگہانی کمک پہنچ گئی ہے؟

لیکن چند ہی لمحوں کے بعد یہ خبر بیچے مگر کے برکوپہ بازار میں گونج رہی تھی کہ کرناٹک کے قلعے پامال ہو گئے۔ دیورائے کی تقدیر ہر جگہ ہار گئی۔ رائے راباں کا درخشاں ستارہ اپنے افق سے ٹوٹ چکا اور ابھی ابھی پکا پور فتح ہونے کی خبر آئی ہے۔ ان خبروں نے بیچے مگر پر موت کی سی اندر دگی طاری کر دی اور لوگ راج رنواں کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے اُس کے دروازہ پر اڑتا ہوا زرد پھیرا اُن کا تسخیر اڑا رہا تھا۔

اب مہاراج کیا فیصلہ کریں گے۔ اُس کی ہوس ہزاروں بہادروں کو موت کے اندھیروں میں جھونک چکی ہے۔ ہزاروں گھر آج چکے ہیں۔ کیا ابھی کوئی اور متناشا باقی ہے؟ مسمری پہ دروازہ مہاراج دیورائے بظاہر اپنے زخموں کی تکلیف سے کراہ رہا تھا لیکن کرناٹک کے قلعوں کی تسخیر اور پکا پور کے سقوط کی الناک خبریں واصل اس کے سینہ کو چھریوں کی طرح کاٹ رہی تھیں اور وہ شدت غم میں بار بار صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ کیا اُس کے انجام کی ساعت آ پہنچی ہے؟

اُس کے اشارے پر حسین رنگی نے شراب کا چوٹھا پیالہ اُس کی طرف بڑھایا۔ ہمارے ہوئے سپاہی اور لٹے ہوئے جواری کا آنکھی سہارا دارو کا پیالہ ہی تو ہوتا ہے جس میں وہ اپنے غموں کو دکھوں کو گھول کر پی جاتا ہے نشے کا سرور اُسے تخیل کی اُن وادیوں کی طرف لے اڑتا ہے۔ جہاں راحت ہی راحت۔ سکون ہی سکون ہے لیکن چوٹھا پیالہ پی جانے کے باوجود دیورائے نے ابھی نشے کی ادلیں ترنگ بھٹی محسوس نہیں کی تھی۔ غم پہاڑوں کا بوجھ بن کر اُس کے سینہ پہ آگرے تھے اور نشے کی لہریں ان پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔

اچانک اُس نے قدموں کی چاپ پٹی۔ راج وید کے علاوہ جو اُس کے زخموں کا علاج کر رہا تھا اور کسی کو اُس کے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ شکست کے صدمہ اور کرناٹک کے قلعوں کی تسخیر کے غم میں بجز شراب اور کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا تھا پھر یہ

کس کے قدموں کی چاپ تھی کون آرہا تھا؟

اُس نے گردن پھیر کر دیکھا راجکمار کی چندرکلا اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”پتا جی! ابھی ابھی میں نے ایک مٹوس خبر سنی ہے۔ کیا یہ سچ ہے پکا پور بھی ہاتھ سے

جاتا رہا؟“

”ہاں چندرکلا! تمہارے باپ کی تقدیر ہار گئی۔“ دیورائے کے لہجے میں غم کے سانپ

لہرا رہے تھے۔

یہ خبر سن کر شاید چندرکلا کا دل بھی بیٹھنے لگا تھا اُس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں

پوچھا۔

”تو اب کیا ہو گا۔ بچے نگر کا کیا ہو گا؟“

”ہم نے جنگ ہاری ہے ہمت نہیں ہاری۔ سلطان ہماری لاش پر سے گزر کر ہی بچے

نکڑے میں داخل ہو سکتا ہے۔“

”تو کیا آپ ابھی تک ستالہ کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”مقابلہ تو زندگی کے آخری سال تک ہو گا۔ ہم موت کی چوکت پر دم توڑ دیں گے

یا سلطان..... بہر حال دونوں میں سے ایک کی موت ضرور ہے۔“

”نہیں پتا جی! آپ دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں بھرتا چاہیے۔ شاید سلطان صلح پر

تیار ہو جائے۔“

”چندرکلا.....“

دیورائے ایک بھیڑیے کی طرح غرایا اور چندرکلا اُسے کھٹی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے

لگی۔

”کیا تم یہ چاہتی ہو تمہارا باپ ایک قیدی کی طرح زنجیریں پہن کر فیروز شاہ کے

حضور صرف اپنی موت کا فیصلہ سننے جائے؟“

”نہیں..... نہیں میں اس ذلت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر صلح نامہ ممکن ہے۔ سلطان اپنی شرط پر قائم ہے اور دوسری صورت میں صرف

تکوار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔“

پھر اچانک وہ نرم لہجے میں بولا۔

”لیکن تم پریشان کیوں ہو۔ راجکورو کوئی دن میں آیا ہی چاہتے ہیں۔ مہجرات، خانہ بس اور مالوہ کے راسخے ضرور ہماری مدد کو آئیں گے اور فیروز شاہ خود زنجیروں میں جکڑا ہوا ہمارے سامنے پیش کیا جائے گا۔ تم اپنے ذہن کو ان کیمیزوں میں نہ الجھاؤ۔ جا کر آرام کرو۔ کرناٹک کے مہاراج مٹی کے پتکے نہیں۔ اُن کا دل لوہے سے بنا ہے اور ارادہ پہاڑوں کی طرح ٹھل ہے۔ بس اب جاؤ ورنہ تمہاری پریشان سی صورت ہمیں بھی پریشان کر دے گی۔ ہمیں سوچنے دو۔ جنگ خطرے کی چالوں کی مانند اپنا رخ بدلتی رہتی ہے۔“

نجانے چند رکھا کیا کیا باتیں کرنے آئی تھی۔ شاید مایوسی کے گھمبیر اندھیروں میں اُس نے روشنی کی کوئی کرن لرزتی دیکھ لی تھی اور وہ مہاراج کو بھی وہی روشنی دکھانا چاہتی تھی لیکن وہ تو تنہائی اور شراب کے سوا اور کچھ نہ چاہتا تھا۔

چند رکھا جھکے جھکے سے قدموں کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ اُس کا ذہن دھوئیں کی لہر بن کر اڑ جانا چاہتا تھا۔ اس کے جاتے ہی دیوارے نے دارو کا پانچواں پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور اس کا دماغ طوفانی اندھیروں میں اترتا چلا گیا۔

جشن فتح

راجکورو کی سفارت ناکام و نامراد لوٹ آئی اور دیوارے کے سینہ پر ایک نیا کوہ غم اُٹھ پڑا۔ پڑوسی راجوں میں سے کسی نے بھی یمنی حکمران کے خلاف سکوار اٹھانے کی جرات نہیں کی بلکہ انہوں نے سلطان کی خدمت میں دوستی کے نذرانے ارسال کئے۔

یقیناً یہ تیمور اعظم کے اُس نامہ مملکت کا اعجاز تھا جو اُس نے قیام ہند کے دوران سلطان فیروز شاہ کو بھیجا اور اُسے جنوبی ہند کا با اختیار بادشاہ تسلیم کیا تھا۔ اُس سے بغاوت اور سرکشی کا مطلب ایشیا کو اپنے گھوڑوں کے سموں سے روک ڈالنے والے عظیم قارتح تیمور صاحب قران کے حکم کی نافرمانی تھی لیکن تیمور اُن سے دور بہت دور اس وقت ایشیائے کوچک کے اُس پار سگولیا کے صحراؤں کو عبور کر رہا تھا اور فیروز شاہ کی تلوار اُن سے دور نہ تھی۔ کیا اُس کی کھینچی ہوئی تلوار انہیں سحاف گزدے گی؟

بھروسہ ایک قارتح سلطان سے دشمنی کیوں سول لیتے؟

دیوارے کے ستارے گردش میں آ گئے۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ راجکورو سے

سفارت کی ناکامی کے حالات سنے اور دل شکن آواز میں بولا۔
 "تو کوئی بھی ہمیں سہانہ دینے پر تیار نہیں۔ کسی نے بھی دکھ کے سے ہماری دوستی کا ہاتھ نہیں تھاما۔"

"وہ فیروز شاہ سے دُرتے ہیں مہاراج!"
 "تو پھر فیصلہ اب تقدیر پر رہا۔۔۔۔۔ ہم دیکھیں گے وہ ہمیں اور کیا کیا دکھاتی ہے۔
 کرناٹک کے قلعے پہنچی سواروں نے پامال کر دیئے۔ بچے مگر محاصرے میں ہے۔ پڑوسی
 راجاؤں نے دوستی کا ہاتھ جھٹک دیا اور اس وقت انسانوں کے جنگل میں ہم یکا دکھا کھڑے
 ہیں۔"

راجکو روایہ ہماری قسمت کی سیاحی ہے جو پہنچی سلطان کے سیاہ پرچم کی شکل اختیار کر
 گئی ہے۔ اب ہم سلطان سے نہیں اپنی قسمت سے جنگ کریں گے۔"
 اور وہ افسردہ و شکستہ دل اپنے کمرۂ خاص میں چلا گیا۔



پکا پور کے قلعہ پر میاں سدھو سر توڑی لگو عالم سقر کر گئے اور مفتوحہ علاقہ کا انتظام
 درست کرنے کے بعد امیر فضل اللہ نے اپنے گھوڑے کی باگ بجے نگر کی طرف موڑی۔
 چار ماہ کے طویل محاصرہ اور شکستوں کی مسلسل خبروں نے مہاراج دیورائے کی کر
 دہست توڑ دی تھی بچے نگر کے میدان میں آٹھ لڑائیاں، آٹھ شکستیں اس کی قسمت میں لکھی جا
 چکی تھیں اور ہر معرکہ میں ذلت آمیز ناکامی کے بعد وہ گیدڑ کی طرح قلعہ میں روپوش ہو
 جاتا رہا۔

سلطان بھی شاید اُسے تھکا تھکا کر مارنا چاہتا تھا۔ اُس نے محاصرے کی گرفت ڈھیلی
 نہیں ہونے دی اور اس دوران میں سارا کرناٹک روغنڈالا۔

امیر فضل اللہ کئی ہزار لوہڑی غلاموں کے ہمراہ بچے نگر پہنچا اور لشکر گاہ میں خوشی کے
 شادیانے بچ اُٹھے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر اپنے بہادر سردار کا شایانِ شان استقبال کیا
 اور بچے نگر کی فضا میں "یا نصیر" اور "اللہ اکبر" کے نعروں سے گونج اٹھیں۔

یہ آوازیں قلعہ کی فصیلوں کے جگڑ میں شکافت کرتی ہوئی راج کو اس سے گہرائیں اور
 دیورائے کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے جیسے وہ

ان نغروں کی آواز بھی سننا پسند نہیں کرتا تھا۔

مگر تقدیر اُس پہ قبضہ زن تھی۔۔۔

چوتھے روز سلطان کے فاتح بھائی امیر الامرا خانخاناں کی سواری بھی آ پہنچی۔ اُس نے جنوب مشرقی کرناٹک کے سب حصار توڑ ڈالے اور تمام قلعے فتح کر لئے تھے۔ ان علاقوں پہ ہمیشی عامل چھوڑ کر سلطان کے حکم کے مطابق اُس نے بجے مگر کا رخ کیا تھا۔

صدر جہاں امیر فضل اللہ کی طرح سلطان نے امیر الامرا احمد خاں خانخاناں کا استقبال بھی بڑے رُک و احتشام سے کیا اور بھائی کے اعزاز میں پیدل چلتا ہوا آگے بڑھا۔ احمد خاں نے سلطان کو پیدل آتے دیکھا تو گھوڑے سے چلاٹنگ لگائی اور اپنی کھوار گلے میں ڈال کر بھرموں کی طرح گھٹنے ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ تمام سردار اور خود سلطان احمد خاں کے اس رویہ پہ متحیر رہ گئے۔

”احمد خاں۔۔۔ اس حرکت کا مطلب ہم نہیں سمجھ کرناٹک کے فاتح کا بھرموں کی طرح کھوار گلے میں ڈال کر ہمارے حضور آنے کا مقصد کیا ہے؟“

”ظن سبحانی!“ احمد خاں کہنے لگا۔ ”ہیگم شیرازی کی بغاوت میں میرا نام بھی سننے میں آیا ہے۔ آپ نے اگرچہ راز واری سے کام لیا اور کسی کے کانوں میں میرے نام کی بھٹک بھی نہیں پڑنے دی لیکن میں اپنے قادر خدا کی قسم کھا کر سلطان کو یقین دلانا ہوں مجھے اس سازش کا قطعی علم نہیں۔ واللہ! اگر میں ہیگم شیرازی کے کسی منصوبے سے آگاہ ہوتا تو سب سے پہلے میری کھوار اُس کا سر قلم کرتی اور سلطان کو شاید اتنی پریشانی بھی نہ اٹھانا پڑتی۔ فیروز آباد سے روانگی کے وقت ہیگم شیرازی نے جان عالم کے بارے میں ایک شکایت ضرور کی تھی اور میں نے وعدہ کیا تھا کرناٹک سے واپسی کے بعد میں جان عالم سے خود باز پرس کروں گا۔ آخر وہ میرے بھتیجے ہیں۔ مجھ سے چھوٹے ہیں اور آپ ہی کی طرح میرا احترام بھی کرتے ہیں۔ چاہوئے کی حیثیت میں مجھے ان سے باز پرس کا حق حاصل ہے لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہیگم شیرازی کی غیبت میں فخر تھا۔ جان عالم کے خلاف، سلطان معظم کے خلاف، ہمیشی سلطنت کے خلاف بغاوت کی آگ لگا رہی تھی۔ بس اس کے علاوہ میں اپنی صفائی میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اگر سلطان مجھے معاف کر دیں تو ان کی کرم گشتی ہے۔“

سلطان نے احمد خاں کو شانوں سے تھام کر کھڑا کیا اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی

چمک دیکھ کر خانخاناں لرز اٹھا۔ سلطان گلوگیر آواز میں بولا۔

”جانا برادر! تمہارے لئے ہم سلطان کبھی نہیں بنے اور نہ ہمیں تم سے کوئی شکایت ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا تم بھی شریک جرم ہو تو سلطان کی حیثیت میں ہم تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے جو سردار داؤد خاں کے ساتھ کیا گیا۔ مگر ایک بھائی کی حیثیت میں ہم تمہاری لاش پر آنسو بھی بہاتے کیونکہ تم ہمارے باپ کی یادگار ہو۔ ہمارا دایاں بازو ہو۔“

احمد خاں کے ہونٹ تھر تھرنے لگے۔ فیروز شاہ کہہ رہا تھا۔

”ہم نے جاننا عالم کو اپنا جانشین ضرور مقرر کیا ہے اور یہ ہماری شفقت پوری کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر کسی روز تمہارے دل میں حکومت کی طلب پیدا ہو تو کوار نہ اٹھانا احمد خاں! ہم سے درخواست کرنا ہم تمہارے حق میں تخت و تاج سے دست بردار ہو جائیں گے۔ تمہارے جسدِ سر تسلیم خم کر دیں گے اور جاننا عالم بھی تمہارا بھتیجا ہے۔ ہم نے اُسے سرکشی کی تعلیم نہیں دی۔ وہ تمہارے ہر فیصلے کو قبول کرے گا۔“

”سلطان عالی“

احمد خاں کی چیخ نکل گئی۔ آنسو ٹپک پڑے اور وہ بے اختیار سلطان کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔

”غل سبانی! کیا احمد خاں کی زندگی میں کبھی ایسا دن بھی آ سکتا ہے؟“

”ہوں کا شمار نہ کرو جان برادر! تاریخ لے پنے مضمون بدلتی رہتی ہے اور ایام کی گردش کبھی نہیں لیکن ہم جو کہہ چکے اُس پر عمل کرنا اور خون نہ بہانا۔ ہمارے پچاس سالہ تجربے کی دہائی تمہیں ایک اصول نصیحت کر رہی ہے اسے دامن میں باندھ لو۔“

بھائیوں کے بلاپ کا یہ جگر گداڑ منظر دیکھ کر کئی ہزاروں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ کڑیل تخت گیر اور ورشت چروں والے امیر جو ششیرستان سے کھیلنے اور میدانِ جنگ میں انسانی لاشوں پر گھوڑے دوڑاتے تھے۔ اس وقت پتھر کے مجسموں کی مانند دم بخود کھڑے تھے۔

پھر سلطان کے اشارہ پر شہزادہ حسن خاں آگے بڑھا اور خانخاناں کے سامنے جھک گیا۔

”بیجا حضور! خدا اور سلطانِ عالی کے سوا میری یہ گردن کسی کے حضور نہیں جھکی تھی۔“

”نہیں جان عالم! یہ گردن اب بھی کسی کے سامنے نہیں جھکے گی۔ مگر مجھے آپ کی سعادت مندی پر فخر ہے۔“

پھر سلطان نے احمد خاں کو گھوڑے پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ خانخاناں پیدل ہی چلنا چاہتا تھا۔ مگر سلطان کے اصرار پر وہ سوار ہو گیا اور سلطان اپنے ذی مرتبت سرداروں، صدر جہاں اور ولی عہد کی معیت میں بھائی کی سواری کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگا۔ اسی عالم میں وہ لشکر گاہ تک آئے اور بچے نگر کا میدان ایک مرتبہ پھر فلک شکاف نعروں سے گونج اٹھا۔ وہ نعرے بچے نگر کی پہاڑیوں سے کمرائے اور اُن کی صدائے بازگشت راج رتوں کے سُرخ ایوانوں میں تھر تھرنے لگی۔

خانخاناں اپنے ہمراہ سات ہزار غلام لڑکے اور لڑکیاں بھی لے کر آیا تھا جنہیں سلطان کے حضور پیش کر دیا گیا اور حسب سابق وہ بھی قیدیوں کے خیموں میں پہنچا دیئے گئے۔ اس وقت پہنچی لشکر گاہ میں قیدیوں کی تعداد سپاہیوں سے بھی تجاوز کر چکی تھی مگر سلطان کا حکم تھا انہیں وہی کھانا دیا جائے جو ہمارے لشکر کی کھاتے ہیں۔

اسی روز سلطان نے جشن فتح منانے کا فیصلہ کیا اور لشکر گاہ آراستہ ہونے لگی۔

سپاہیوں کو اپنے مخصوص فوجی رقص و سرود کی محفلیں پکا کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ پھر تلواردوں اور خنجرروں کے ناچ سے لشکر گاہ کی فضا میں گونج اٹھیں۔ روشنیوں کے سائے قلعہ کی فصیل پر بھی منعکس ہو رہے تھے اور ہمہ تن سپاہیوں کے نعروں کی صدائیں دور دور تک تیر رہی تھیں لیکن بچے نگر کی عمارتیں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

سلطان کی بارگاہ خاص اہتمام سے سجائی گئی تھی۔ دور دور تک زرغینی شامیانے نصب تھے اور ان شامیانوں کے ارد گرد اونچی تانیں نصب کر کے دربار کا نقشہ بنا دیا گیا تھا۔

ان شامیانوں کے نیچے بے دو مشعلیں روشن تھیں۔ تمام امراء سردار اور خوانین حاضر تھے۔ سلطان نے امیر فضل اللہ آنجو شیرازی، امیر الامراء احمد خاں خانخاناں ان کے سرداروں اور سالاروں کو بہادری کے صلہ میں اعزاز و خطابات بخشے پھر ولی عہد شہزادہ حسن خاں، ارگو خاں، نولاد خاں سیستانی، شمشیر خان، کوسل رائے، قباچہ خاں اور ان کے بہادروں کو انعامات دیئے۔ کوسل رائے کو راجہ کا خطاب دیا گیا۔ اُن بہادر کھتریوں، راجپوتوں اور تلکی سوامیوں کو بھی خلعت و خطابات دیئے گئے جنہوں نے سلطان کے پرچم تلے جانبازی کے جوہر

دکھائے تھے۔

اس تقریب میں سب سے انوکھا انعام پر قہال کو عطا ہوا۔ وہ سلطان کی بیٹی کا شرف پہلے ہی حاصل کر چکی تھیں۔ اُسے ”دکن کی شہزادی“ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

ساری رات فتح کی خوشی میں جشن ہوتا رہا۔ سلطان نے دل کھول کر اپنے امیروں، سرداروں اور سپاہیوں پر زرو جواہر برسائے اور انہیں ایک ہی رات میں مالا مال کر دیا۔ ساری رات قص جاری رہے۔

ساری رات فحشوں کی صدا اُنیں بلند ہوتی رہیں۔

ساری رات مشطوں میں تل جلتا رہا۔

اور۔۔۔ ساری رات بچے مگر اندھیرے میں ڈوبا قص و نغہ کی صدا اُنیں سنتا رہا۔

سحری کے وقت جب اکثر سپاہی نیند کے خمار میں ڈوب گئے تھے اور اکثر خیموں کے اندر نگوں کی صدا اُنیں تھم گئی تھیں۔ سلطان نے خانخاناں کو اپنے حضور طلب کیا امیر فضل اللہ اور شہزادہ حسن پہلے ہی موجود تھے۔ سلطان نے انہیں اپنے نئے فیصلے سے آگاہ کیا۔

”ابھو خاں! ہم امیر فضل اللہ کے ساتھ اودنی کے قلعہ کا رخ کرتے ہیں۔ تم اور جانیہ عالم بچے مگر کا محاصرہ جاری رکھو۔ کرناٹک کی تغیر میں اب صرف اودنی کا قلعہ ہی حائل ہے اس کے فتح ہوتے ہی ہم پورے کرناٹک پر قابض ہو جائیں گے اور دایسی پر دیورائے کی نظدیر کا فیصلہ کریں گے۔ ارگو خاں، کوسل رائے اور قباچہ خاں ہمارے ساتھ جائیں گے۔ ہمارے بعد خانخاناں کی حیثیت سے تم صاحب اختیار ہو گے۔“

دوسرے روز جب سپاہی نیند سے بیدار ہوئے تو سلطان کے لشکر خاص کے ساتھ امیر فضل اللہ، ارگو خاں، کوسل رائے اور قباچہ خاں کے لشکروں کو بھی اودنی کے قلعہ کی طرف کوچ کا حکم مل چکا تھا اور روانگی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔



صلح کی شرطیں

مہاراجہ دیورائے پر یہ خبر نکلی کہ کرگری کے سلطان اپنے خاص لشکروں کے ہمراہ اودنی کی طرف کوچ کرنے والا ہے۔ راجہ کوسل رائے اور قباچہ خاں کے ہر اول دستے روانہ بھی

ہو چکے تھے۔

اودنی کرناٹک کی کئی تصویر کیا جاتا تھا۔ اس کی تسخیر کے بعد سلطان پورے ملک پر قابض ہو سکتا تھا۔ اردگرد کے قلعے پہلے ہی سر کر لیے گئے تھے اور اب سلطان دیورائے کا بازو کاٹنے جا رہا تھا۔ اودنی اور بیجے مگر، کرناٹک کے دو ہی بازو تھے۔ ایک عاصیہ میں تھا اور دوسرا اب بھٹی سواروں کی زد میں آنے والا تھا اور دیورائے جانتا تھا مغلوب اقتضاب سلطان اسے تباہ و برباد کئے بغیر نہ ملے گا۔

اس نے فوراً اپنے تمام راؤ، فوجی سوارے، مہماتر اور اہل اطرائے لوگوں کو راج دربار میں طلب کیا۔ راجکو رو پنڈت گورکھ ناتھ، سینا پتی راج سنگھ، راؤ سنگرام مہاشتری اور دوسرے ممتاز سردار مہاراجہ کے آس پاس بیٹھے تھے اور وہ خود اپنے روایتی چتر کے زیر سایہ سنگھاسن پر جلوہ آرا تھا اس کے چہرے پر اُداسی اور دکھ کے سائے کانپ رہے تھے۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہ مفلتوں نے اُسے پہلے سے کہیں زیادہ بوڑھا کر دیا تھا۔

اودنی کے قلعہ کی شکست کرناٹک کی شکست میں جانے لگی پھر سلطان ہر فیصلہ تلوار کی نوک سے نافذ کرے گا۔

یہ بات ہر کوئی جانتا تھا۔ لیکن اودنی کو کس طرح بچایا جائے؟ شاید اسی امر کا فیصلہ کرتے کے لئے مہاراجہ نے اپنے وزیروں اور مشیروں کو طلب کیا تھا۔

وہ گائی ویر تک غراتے اور آپس میں جھگڑتے رہے۔ مسلسل تا کاہیوں سے اُن کے حراج کچھ چڑھنے سے ہو گئے تھے۔ خود مہاراج کا انداز گفتگو ناقابل فہم تھا۔ کبھی وہ تلوار کے دست پر ہاتھ رکھتا اور کہتا "ہمارے اور سلطان کے درمیان اب تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔" لیکن وہ تلوار کے فیصلہ سے ڈرتا تھا کیونکہ چار ماہ کی مدت میں تلوار کا ہر فیصلہ سلطان ہی کے حق میں صادر ہوا تھا۔ پھر وہ خود بخود بڑبڑاتا۔

"صلح کی کوئی تدبیر نکل آئے تو بہتر ہے۔ جنگ نے ہمارے پیادوں کو تھکا دیا ہے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم فیروز شاہ سے نشے کے قابل ہو جائیں گے۔" سلطان اب ایسی کسی صلح کے لئے تیار نہ تھا جو کسی نئی جنگ کے لئے "تیاری کا وقفہ" بن سکے لیکن اودنی کو بچانے کی خاطر صلح کے بغیر اور کوئی راستہ نہ تھا۔ دیورائے کے تمام دنوں نے یہی مشورہ دیا۔ "مہاراج کو جھک جانا چاہیے ورنہ کرناٹک ہاتھ سے نکل چکا۔"

دیورائے نے اپنے ذہن کو شکست کے دردازے پہ لا کھڑا کیا۔ اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا پھر راج دربار کے فیصلے کے مطابق راجکو رو کی معیت میں صلح کی درخواست روانہ کر دی گئی۔ سلطان اپنے خیر میں روانگی کے لئے تیار ہو رہا تھا جب نظام الملک نے حاضری کی اجازت طلب کی اور عرض کیا کہ بیچے مگر کے راجکو رو صلح کی درخواست لے کر آئے ہیں۔

”صلح۔۔۔“

سلطان چلایا۔ ”نظام الملک! کہیں تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ اب ہمیں صلح سے دلچسپی نہیں رہی۔ راجکو رو سے کہو اپنے مہاراج کو تقدیر کے فیصلے پر چھوڑ دیں۔“

نظام الملک مایوس لوٹ گیا اور راجکو رو دل تھام کر رو گیا۔ وہ جانتا تھا دیورائے کی بدبختی اسے اعمال کی سزا دیئے بغیر نہیں مل سکتی پھر اس نے سلطان سے ذاتی طور پر ملنے کی درخواست کی جسے قبول کر لیا گیا۔

جب پنڈت گورکھ ناتھ اپنے مہاتروں کے ساتھ زریخت کے شامیانہ میں داخل ہوا تو اس کی آنکھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ پر تھاں سلطان کے قریب ایک زرنگار مسند پر جلوہ آرا تھی اور تمام شاندار سلطنت شہ نشین کے سامنے دو درویش مقرب کھڑے تھے۔ اچانک پنڈت گورکھ ناتھ کو اپنا وہ پہنا یاد آ گیا جو اس نے کاشی کی یادرا سے لسنے وقت اس سے دیکھا تھا جب وہ لکھپت منار کے گھر مہمان تھا اور پر تھاں کو راگ دیا سکھا رہا تھا اس نے پر تھاں کے ماتھے پر اقبال کو چپکتے دیکھا تھا اور آج صرف ڈیڑھ ہی سال کے بعد اس کی تعبیر بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سلطان کو سلام کیا پھر پر تھاں کی طرف دیکھ کر بھی سر جھکا دیا۔ سلطان کی اجازت سے پر تھاں ناتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنے گورو دیو کو منہ کا دیا پھر شامیانہ میں سلطان کی آواز گونجنے لگی۔

”راجکو رو! ہم جانتے ہیں بانو تمہاری شاگردی ہے۔ اسی لیے ہم نے اپنے دربار میں اسے تمہاری تعظیم کی اجازت دی ہے۔ مگر اب وہ محض ایک زرنگری لڑکی نہیں سلطان دکن کی بیٹی ہے اور ہم اپنی بیٹی کو دیا ہوا قول پورا کرنے کے لئے بیچے مگر میں بیٹھے ہیں اس نے ہم سے مہاراج دیورائے کا سر طلب کیا تھا اور ہم وہ سر اپنی بیٹی کے قدموں میں ڈالے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ اب کہو تم کیا درخواست لے کر آئے ہو؟“

راجگروہ اور اس کے ساتھیوں نے حیرت کے ساتھ سلطان کا بیان سنا پھر وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”میں سلطان عالی کے حضور صرف صلح کی عرض لے کر آیا ہوں۔ اس کے سوا میرے دامن میں اور کچھ نہیں۔“

”ہم تمہارے دکھ سے واقف ہیں مگر کھ پاتھ! بانو دوشی کے متعلق ہمیں سب کچھ بتا چکی ہے۔ اب مجرم کے حساب کی ساعت آئی تو تم صلح کی درخواست لے کر آچھپے۔“

”سلطان عالی! مجھے شام کیجئے۔“

”جاؤ۔۔۔ دیورائے سے کہہ دو اگر وہ صلح چاہتا ہے تو ہماری ضد پوری کرے اور زنجیریں پہن کر ہمارے حضور چلا آئے۔ صلح کی گفتگو اس کے بعد ہوگی اور اس کی زندگی کا فیصلہ ہماری جلی کرے گی۔“

سلطان کا جواب فیصلہ کن تھا۔ راجگروہ نے شاعی آداب کے مطابق کورٹس کی رسم ادا کی اور لوٹ گیا۔

دیورائے نے صلح کی شرط سنی تو کانپ گیا۔ تو اس کی زندگی کی ڈور پر تھال کے ہاتھ میں ہے؟ پھر اُسے وہ خبر یاد آیا جو پر تھال نے اُس کے پیغام کے جواب میں بھیجا تھا اور دیورائے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ خنجر اُس کا جگر چیرتا ہوا سینے میں اترا جا رہا ہے۔۔۔ وہ دیوانہ دار بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور اندھے منہ مسدھی پر گر پڑا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے راؤ سنگرام کو طلب کیا اور امیر فضل اللہ شیرازی کی طرف ددڑایا جو ادونی کے قلعہ کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

گھنٹی لشکروں نے جاتے ہی قلعہ کے گرد محاصرہ ڈال لیا تھا۔ راؤ سنگرام ادونی کے میدان ہی میں امیر کے سامنے حاضر ہوا اور مہاراجہ کی درخواست پیش کی۔ اس نے یقین دلا لیا تھا کہ وہ اپنی گزشتہ حرکتوں پر سخت نادم ہے اور سچے دل سے معافی کا طلب گار ہے۔ امیر سلطان سے سفارش کر کے معافی دلا دیں۔ پابہ زنجیر حاضری کے علاوہ وہ سلطان کی ہر شرط قبول کرے گا۔

مہاراج دیورائے نے امیر کو سابقہ تعلقات کا واسطہ دیا تھا اور انتخابی عداوت کا اظہار کرتے ہوئے آئندہ کے لئے سلطان کا شکنجہ بانگزار رہنے کا وعدہ کیا تھا اس نے یہ بھی کہا

تھا۔ وہ پچاس ہزار سپاہی موت کی بھٹی میں جھونک چکا ہے اور کم دیش اتنے ہی قیدی بنائے جا چکے ہیں۔ کیا اس کی غلطی اور سرکشی کی یہ سزا کچھ کم ہے؟ راجہ سنگرام نے ذاتی طور پر بھی امیر کو صلح کے لئے مجبور کیا اور اس نے راجہ کو صلح رائے کو محاصرہ کا تکرار مقرر کر کے اپنے گھوڑے کی باگ بچے بھر کی طرف موڑ دی۔

امیر فضل اللہ کو اپنے حضور دیکھ کر سلطان حیران رہ گیا۔

"تو تم اس بد بخت کی سفارش لے کر آئے ہو جس نے اس کے کلیان میں چنگاری ڈالی اور انسانوں کا لہو پانی سمجھ کر بہلایا۔ جس نے ہماری مملکت کی لڑکیوں کی عزت لوٹنا چاہی۔ نہیں امیر! ہمیں کسی غلط فیصلے پر مجبور نہ کرو۔ ورنہ رائے کو اپنی سرکشی کی سزا بھگتنا ہی پڑے گی۔"

دو شرمندہ ہے سلطان عالی! اس نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا ہے اور وہ کہتا ہے پر تعالٰیٰ اب سلطان علی کی بیٹی نہیں میری بھی بیٹی ہے اور میں اس سے معافی کا طلب گار ہوں۔"

سلطان کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔ اس نے جواب دیا لیکن تم جانتے ہو دیورائے کی قسمت کا فیصلہ اب ہمارے اختیار میں نہیں۔ بانو علی اس کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتی ہے۔" پھر امیر فضل اللہ نے پر تعالٰیٰ کے خیمے پر حاضری دی اور مہاراجہ دیورائے کی طرف سے خود معافی کا طلب گار ہوا۔ ہماری سلطنت کا صدر جہاں امیر فضل اللہ آنجو شیرازی حرم کی کوار سے بہادروں کے جگر کانپ اٹھے تھے ایک سار زادی کے سامنے معافی کا طلب گار تھا اپنا یہ مقام اور سلطان کی یہ عزت افزائی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔

"دیورائے اس قابل نہیں تھا کہ اس کی جان بخش کی جاتی مگر صدر جہاں کے حضور مجھے انکار کی جرات نہیں۔ اب مجھے دیورائے کا سر نہیں چاہیے لیکن معافی کے ساتھ سلطان کو ایک مشورہ ضرور دوں گی۔"

امیر فضل اللہ خوش خوشی لوت گیا۔ کم از کم دیورائے کی جان بخش تو ہو گئی۔

سہ پہر کے وقت راجہ کو رو پیڈت گورکھ ناتھ سلطان کے حضور راجکاری چند کلا کا ایک ذاتی سندیس لے کر آیا۔ راجہ کی طرف سے اپنے باپ کے گناہوں کی معافی

طلب کی تھی اور درخواست کی تھی کہ سلطان حضور اپنی کرم گستری سے کام لیتے ہوئے زنجیریں پہن کر حاضری کی شرط عائد نہ کریں۔ مہاراج اپنے نگے میں کھوار لٹکائے شاہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔

چندر کلانے دوسرا پیغام پر قتال کے نام بھیجا تھا اور اس میں بھی باپ کے جرم کی خود معافی مانگ کر یہ درخواست کی تھی کہ وہ ان کو بخش کرے۔

راجا دودا راؤ سنگرام اور امیر فضل اللہ شیرازی ایک ساتھ سلطان کے حضور پیش ہوئے۔ پر قتال اس سے پہلے ہی سلطان سے ملاقات کر چکی تھی اور اس نے دیورائے سے صلح کی ایک ایسی عجیب و غریب شرط پیش کی تھی۔

جسے سن کر خود سلطان بھی چونک اٹھا تھا۔۔۔۔۔ راجا کی چندر کلا۔۔۔۔۔

سلطان نے امیر فضل اللہ اور بے نگر کے ایلچیوں کو شرف باریابی بخشا ان کی درخواستیں سنیں اور چند لمحے غور کرنے کے بعد نرم آواز میں کہتے لگے۔

”بانو! مہاراج دیورائے کی جان بخشی کر چکی ہے اس لئے ہمیں بھی اُس کی جان لینے پر اصرار نہیں رہا۔ راجا کی چندر کلا کی درخواست پر اسے ہم حاضری پر بھی مجبور نہیں کرتے لیکن عین الملک ہماری طرف سے صلح کی شرائط سنائے دیتے ہیں۔ اگر مہاراج کو یہ شرطیں منظور ہوں تو ہم بھی اُس کو معاف کرتے ہیں۔

فضا پر سناٹا چھا گیا۔ پھر عین الملک کھڑے ہو کر صلح کی شرطیں پڑھنے لگے۔

1۔ ”سلطان عالی کے نزدیک مہاراج دیورائے نے بار بار صلح کی خلاف ورزی کر کے اور معاہدے توڑ کر اپنا اعتبار کھو دیا ہے اور اُس کی کسی بات پر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا لیکن مہاراج نے چونکہ اپنی اطاعت گزاری کا یقین دلایا ہے اس لئے اس یقین کو مزید مستحکم اور ناقابل شکست بنانے کے لئے پہلی شرط یہ عائد کی جاتی ہے کہ وہ اپنی لڑکی راجا کی چندر کلا سلطان معظم کی عذر دکرے۔ سلطان اُسے اپنے عقد میں لائیں گے۔

2۔ مہاراج اپنی بیٹی کے سکھ پال کے ساتھ دس من چاندی، پانچ من موتی، پچاس کوہ پیکر ہاتھی دو ہزار خاندہ غلام اور دانیان اور دھن و سرو و میں باکمال دیوداسیاں پیش کرے۔

- 3- ٹپکا پورا گرچہ سلطان ہی کے قبضہ میں ہے اور اس پر پہنچی پرچم لہرا رہا ہے۔ مگر دیورائے اسے باقاعدہ راجکاری کے جہیز میں دولت ہمینہ کے سپرد کر دے۔
- 4- اگر اسے صلح کی یہ شرطیں قبول ہوں تو سلطان کی طرف سے اُن کی منہ بولی بیٹی پر تھال دہن کے لئے جوڑا لے کر آئے گی۔ مہاراج دیورائے نصف کوس پیدل چل کر اس کا استقبال کرے اور اس کے سامنے شاہانہ آداب کے ساتھ جھک کر کورنش بجالائے پھر ضروری رسوم ادا کرنے کے بعد دیورائے اُسی طرح پر تھال کی سواری کے ساتھ پیدل چل کر اسے قلعہ کے دروازہ تک چھوڑنے آئے۔
- 5- بچے نگر کے دروازے سے لے کر پہنچی لشکر گاہ تک سات فرسخ کے فاصلہ میں بچے نگر کے سوداگر دو روپہ بازار لگائیں اور ہندو مسلمان مل کر اس بازار میں گھومیں اور مال فروخت کریں۔
- 6- یہ میلہ بازار کی شکل میں مسلسل چالیس روز تک قائم رہے تاکہ باہمی کدورت دور ہو جائے اور دونوں لشکروں کے سپاہی ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔
- 7- شادی کی رات سارے بچے نگر راج بکس اور راج رتو اس میں نہ صرف چڑیاں کیا جائے بلکہ شہر بھر میں خوشی کی محفلیں بجا ہوں اور راج رتو اس میں بھی رقص و موسیقی کے جلے منعقد کئے جائیں۔
- 8- اس خوشی میں راتے سجائے جائیں اور جب سلطان دہن لے کر شہر میں داخل ہوں تو مہاراج اپنے امرا اور وزیروں مشیروں کے ساتھ تین فرسخ کی مسافت سے اُن کا استقبال کرے اور واپسی پر بھی وہ راجکاری کی سکھ پال کے ساتھ پیدل چلے اور اسے ہمارے خیمے تک چھوڑنے آئے۔
- 9- تمام ہمینی قیدی فی الفور رہا کر دیئے جائیں۔
- 10- مہاراج دیورائے ہر سال دولت دکن کو خراج ادا کرے اور سلطان جب اسے طلب کریں وہ فوراً اُن کے حضور چلا آئے۔ اس کے مقابلہ میں سلطان بھی زبردیہ لے کر قیدیوں کو رہا کر دیں گے اور کرناٹک کے جو قلعے فتح کئے گئے ہیں وہ مہاراج کو لوٹا دیئے جائیں گے۔
- سب نے ان شرائط کو تعجب کے ساتھ سنا راجا سکرام کے ہاتھ پر راجکاری پینڈ

کے بیاہ کی شرطیں سن کر ٹیش کی ٹیکریں ابھریں لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

سلطان تو پرتھال کے مشورہ پر دراصل دیورائے کو ایک ایسا سبق دینا چاہتا تھا جو اسے ساری عمر یاد رہتا یہی اس کی بے عزتی کا انتقام تھا۔ یہی دوشی کی بے گناہ آتما کی پکار تھی۔ راجگورو پنڈت گوکھ ناٹھ کے ہونٹوں کے کناروں پر لرزش پیدا ہوئی اور اس نے مسکرا کر پرتھال کی طرف دیکھا پھر وہ سب کے سب خیمے سے باہر آ گئے۔

راجگورو واپسی سے پہلے پرتھال کو اس کے خیمے خاص میں ملا۔ اس نے کہا۔
 ”بیٹی! دوشی مہاراج دیورائے کی ہوس کی بھیبت چڑھی تھی۔ سلطان نے چندر کلا کا مطالبہ کر کے میری آتما کو سکون بخش دیا ہے۔ میں خود یہی چاہتا تھا اور شاید چندر کلا بھی۔“

پھر وہ خوشی خوشی بچے نگر کی طرف لوٹ گئے اور پرتھال اپنے خیمہ میں گھس گئی مگر فوراً جھکی۔ سامنے شہزادہ حسن کھڑا مسکرا رہا تھا۔

روح کی روشنی

بیچانگر کی بلند اور مہیب فسیل سے کچھ ادھر ہی پرتھال نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور ہاتھ اٹھا کر اپنے پیچھے آنے والے سواروں کو رک جانے کا اشارہ کیا۔

شہزادیوں کی طرح زرق برق لباس پہنے اور سر پر کھنی لگائے وہ اس وقت سلطان کے خامن سفید گھوڑے پر سوار ایک شہزادی ہی معلوم ہو رہی تھی۔ ہمکنی سپاہ کے منتخب بہادر سپاہی جن کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس کی رکاب میں تھے۔ ہشیار عین الملک، نور نظام الملک، دائیں بائیں نظر آرہے تھے جس طرح وہ سلطان کے ہمراہ رہتے تھے۔ عقرب میں اور گو خاں، نولاد خاں، سیٹانی، قباچہ خاں، شہباز خاں، شمشیر خاں اور کوہیل رائے ایسے جنگجو سردار لوہے کا لباس پہنے گھوڑے بڑھائے چلے آ رہے تھے۔

ان کے کھردرے چہروں پر اس ردا جی تنگنی کی چمک تھی جس نے ان کے کردار تنگ و آہن کے پیکر بنا دیئے تھے۔

جونہی پرتھال نے گھوڑا روکا فسیل کا دروازہ کھلا اور کرناٹک کا مہاراج دیورائے اپنے راجگورو، مہاستری، سیناپاتی، راج دربار کے راؤں اور مہاتاروں کے ساتھ سواگت کو آ گئے

بڑھا۔ وہ نیگے سر اور نیگے پاؤں تھا۔ سلطان نے اس پر بیجا نگر سے باہر پر تھاں کے استعمال اور کورٹس بجالانے کی پابندی ضرور عائد کی تھی لیکن مجرموں کی طرح نیگے سر اور نیگے پاؤں آنے کا حکم نہیں لگایا تھا۔ یہ زیورائے کی اپنی روح کا فیصلہ تھا۔ شاید وہ گناہوں کا بوجھ ہٹا کر نا چاہتا تھا۔ جوئیہ وہ قریب آیا۔ پر تھاں یہ دیکھ کر چونک اٹھی کہ اس نے وہ خنجر اپنے گلے میں لٹکا رکھا تھا جو اس نے راجہ کے سندیس کے جواب میں بیجا تھا تو اس کا یہ مطلب ہے اس کی روح نے مدہنی قبول کر لی ہے وہ سچے دل سے معافی کا طلب گار ہوا ہے؟

قریب آتے ہی وہ کمر تک جھک گیا تھا پھر اس نے ایک حقیر معاصی کی طرح تین مرتبہ ہاتھ کی جھٹس سے کورٹس ادا کی۔ اس کے ہر ایسی بھی اس کے ساتھ ہی کر خید ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں کو جنبش نہیں دی مہاراج کے ساتھ ان کا جھک جانا ہی کافی تھا۔ پر تھاں کو یوں محسوس ہوا جیسے کائنات کی گردش رک گئی ہو جیسے دھرتی اپنے محور پر گھومنے کے کانتپ دھکا ہو جیسے آسمان کے ستارے اس کے قدموں پہ آپڑے ہوں اور کرناٹک کی زمین، کرناٹک کا آسمان اس کے حضور جھک گیا ہو۔

یہ بیجا نگر کا وہ پر عظمت، پر جلال اور پر شکوہ مہاراج تھا جس کے ہاتھ کے صرف ایک اشارے پر ہزاروں سر لکھاروں کی وجہ پر اچھل جاتے تھے۔ یہ وہ با اختیار اور با جبروت حکمران تھا جس کے جلو میں بجلیاں چلتی تھیں۔ رائے راجا کا وہ منور اور عالم انسان جس کے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے دیود پکشا کی دھرتی کانتپ اٹھتی تھی۔ جس کے اشارے پر کمانوں کے چلے جڑھتے تھے۔ لکھاروں کا رقص ہوتا تھا اور جھانکوں کے پھل انسانوں کے جگر میں اتر جاتے تھے جو اپنی رکاب میں آتش و خون اور موت کے ہنگامے لے کر چلا تھا۔ جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ موت کے فرمان کی طرح اٹل تھا۔ جس کے راج روئیں میں کرناٹک کی کنواریاں اپنی ستارے زبیت لٹا کر یوں مہر بلب ہو جاتی تھیں جیسے یہی ان کا مقدر تھا۔ جس نے جھکا تو درکنار چکناٹک نہیں سیکھا تھا۔ آج وہ ایک ستار زادی کے سامنے سر جھکا کر کورٹس ادا کر رہا تھا۔ لاکھوں انسانوں کا ان داتا، کرناٹک کا مہالئی، ایک ایسی عورت کے سامنے سر خیدہ تھا۔ جسے وہ اپنے حضور زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنے کا مہتی تھا۔ آج آسمان کا شام غرور، سب جاہ و جلال ایک بے مایہ و کبر در لڑکی کے قدموں پہ اُدعا پڑا تھا۔ ہمہنی سلطان نے اس کے دس کی صفیں الٹ دی تھیں۔ دکن کے بہادرؤں نے اس

کی تمناؤں کو لبو میں قفل دیا تھا موت نے بھیا یک تہہ لگا کر اس کے دروازہ پر دستک دی تھی اور دیو دوائے اس دروازہ کے پٹ بھیڑ کر یوں دہک گیا تھا جیسے اس کے جسم سے زندگی کی حرارت چھین لی گئی ہو۔ اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا تھا اور سلطان کی موت کی طرح کھینچی ہوئی تلوار سے پناہ طلب کی تھی۔

یہ کیسا عجیب واقعہ رونما ہوا تھا۔ ایک کمزور و حقیر لڑکی کے مقدر نے بیجانگر کے راتے رایاں کو اپنے پاؤں پہ جھکا لیا تھا۔

شاید احساس کے یہی وہ کوئے تھے جو پرتھال کے ذہن و شعور پر لپک رہے تھے اور وہ اپنے بدن پر ایک غم انگیزی لرزش محسوس کر رہی تھی۔ اُسے دشمن کی شکست پر خوش ہونا چاہیے تھا لیکن وہ اس کے لئے اپنے دل کے گوشوں میں ایک دم کو کوڑھ لیتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

جب کوڈلش کے بعد مہاراجہ دیو دوائے نے اپنا سر اُپر اٹھایا تو سب لوگ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ پانی کی موٹی موٹی دو لکیریں آنکھوں سے نکل کر اس کے ہونٹوں کے کناروں کی طرف بہہ رہی تھیں۔ وہ صاحب شکوہ مہاراج جس کی سواری کے تیل بھی چتر زریں کے سائے میں چلتے تھے۔ اس وقت پرتھال کے سامنے مجرموں کی طرح نیگے پاؤں اور نیگے سر کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

تقدیر نے اس کی روح پر کیسے کوڑے برسائے تھے۔

پرتھال نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا شاید وہ بیجانگر کے مہاراج کو اس بے کسی کی حالت میں دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ بے شک وہ اس وقت سلطان کے کوتل گھوڑے پر سوار تھی جو خون کے دریا میں تیر جاتا تھا لیکن اپنے سینے میں فیروز شاہ کا دل کہاں سے لاتی۔ وہ ایک عورت تھی۔ ایسا عورت جس نے نفرت کرنا نہیں صرف محبت کرنا سیکھا تھا۔ زلزلوں اور طوفانوں میں بھی اس کے پیادے قدم نہیں ڈلگائے تھے مگر اس کا دل اپنے دشمن کی بے بسی پر کانپ کے وہ گیا اور دیو دوائے کے آنسو دیکھ کر وہ خود بھی شمع کی طرح پگھلنے لگی۔

مہاراجہ نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی رکاب تھام لی تھی۔ آنسو بدستور وداں تھے اور ہونٹ بڑی تیزی سے کپکپا رہے تھے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن الفاظ کہیں رستے ہی میں دم توڑ جاتے تھے۔

اچانک پرتھال نے ایک ڈوبی ہوئی آواز سنی جیسے کوئی روح اُسے بہت دور سے پکار رہی ہو۔ بے شک وہ آواز دیورائے کی نہیں تھی۔ اس لرزتی ہوئی آواز میں ایک عجیب سا رس تھا۔ پیار، محبت اور شفقت تھی۔ پھر وہ آواز دیورائے کی کس طرح ہو سکتی تھی۔ ہاں ہونٹ اسی کے تھر تھرائے تھے زبان اسی کی کانپی تھی۔ اب اُسی کے کھلے تھے مگر آواز شاید اُس روح کی تھی جو زندگی کے دالانوں میں دیوالوں کی طرح بھٹکتی پھر رہی تھی۔ وہ آواز جو کہہ رہی تھی۔

”پرتھال دیوی..... پرتھال..... بیٹی.....“

اور اس کے آگے کچھ بھی سنائی نہ دے سکا۔ مہاراج دیورائے کی پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو بھر کر نونے اور ہونٹوں میں جذب ہو گئے۔ اس کا لہجہ ڈوبتا ہی چلا گیا اور وہ آواز بھی کہیں گم ہوتی گئی۔

”پرتھال بیٹی!“ یہ آواز سن کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ الفاظ دیورائے نے نہیں لکھپت سارے کے تھے۔ اُس کے گوردیو پنڈت گوروکھ ناتھ نے اُسے پکارا تھا اور وہ تھرا کر رہ گئی۔ اس کا جتنی چاہا وہ گھوڑے سے کود جائے اور دیورائے کے سینہ پر سر رکھ دے اور کہے۔

”میرے ناسک پتا! تم کہاں بھٹک گئے تھے۔ کیا کبھی کسی باپ نے بیٹی کے لئے کٹوار بھی اٹھائی ہے لیکن میری ہلکتی دیکھو میں نے لہ کا در باپاٹ کر تھیں ڈھوٹا اور تمہاری آتما کو ہلاک ہونے سے بچا لیا۔“

لیکن گھوڑے کی پشت پر وہ صرف اپنے ہونٹ بھیج کر رہ گئی تو کیا وہ بہمنی روایات کو دھکا دے گی۔ ایک مجرم کے سامنے کبھی کمزوری کا اظہار کر کے دنیا کو یہ کہنے کا موقع دینی کہ فیروز شاہ بہمنی کے سینہ میں ایک عورت کا دل ہے۔ اس وقت وہ فیروز شاہ کی عظمت کا بہروپ بدل آئی تھی۔ پھر..... پھر..... اُس کے سینہ میں یہ کچکا ایشی سی کسی ہیں..... اس کا دل اتنی تیزی سے کیوں پھل رہا ہے؟ یہ خیال آتے ہی وہ اپنے آپ پر قابو پانے لگی اور دوسرے ہی لمحہ وہ ہلک و آہن کا ایک بیکر سامنے گئی۔ دیورائے کی آواز ایک بار پھر اس کی سماعت سے نکل کر اڑی تھی۔

”پرتھال بیٹی! تمہارا مجرم، تمہارا گناہگار باپ تمہارے سامنے حاضر ہے۔ تم اسے جو

مزا چاہو دے سکتی ہو۔“

اچانک پرتھال کے ہونٹوں کو خنش ہوئی۔ وہ بولی۔

”جی باب کو سزا نہیں صرف جزا ہی دے سکتی ہے مہاراج!“

پھر وہ ہشیار عین الملک سے مخاطب ہوئی۔

”عین الملک! مہاراج کو نذر بھینٹ کی جائے۔“

مگر اس کی آواز میں لرزش کی بجائے ایک ٹھہراؤ، ایک حکم، ایک شاہی جلال چمک

رہا تھا۔

عین الملک نے گھوڑے سے اتر کر ایک کوار مہاراجہ کی طرف بڑھائی۔ جس کے

چاندی کے دستہ پر یہ عبارت کندہ تھی۔

”دختر سلطان کی طرف سے مہاراجہ دیورائے کی نذر۔۔۔۔۔“

دیورائے نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کوار اٹھائی اور شاہی دستور کے مطابق اسے

بوسہ دے کر بولا۔

”ہم اس بھینٹ پر ہمیشہ فخر کریں گے۔“

”مہاراج!“ پرتھال کہنے لگی۔ ”یہ کوار آپ کو اس لئے بھینٹ کی گئی ہے کہ یہ

ستونوں کی سہارا میں صرف ظالموں کے خلاف بلند ہوگی۔ یہ ایک ایسی بیٹی کا تھنہ ہے جس

نے آبلں پر جان کی بازی لگا دی تھی۔ اگر آپ نے یہ بات یاد رکھی تو کہنا۔“ کی تقدیر بدل

جائے گی۔ دیس کی کنیا میں آپ پر فخر کریں گی پھر کوئی کنواری دن کے اقبالے یا رات کے

اندھیرے میں اپنی بے بسی پر خون کے آنسو نہیں روئے گی۔ کوئی دوش موت کا امرت نہیں

پئے گی۔ کوئی باب جی کا ختم سینے پر لئے نہیں پھرے گا۔“

دوش کا نام ہی سننے دیورائے اور پنڈت گوکھ ناتھ نے ایک ساتھ چونک کر اس کی

طرف دیکھا۔ بڑھنے راجگورو کی آنکھیں بھی جھپک رہی تھیں۔

”ہاں مہاراج! راجہ اپنی پر جا کا باپ ہوتا ہے۔ دیس کی عزت کا رکھوالا، بے کسوں کا

حافظ میں اس کے ہوا اور کچھ نہیں۔“

دیورائے کے ہونٹ پھر کپکپائے۔ وہ بگڑ کر آواز میں بولا۔

”تم عورت نہیں بچے کے ایک دیوی ہو۔ ایک ساؤتری لیکن ہماری بدبختی دیکھو ہم تنہی

کو زنجیریں پہنانے پر مل گئے۔ بیٹھے بیٹھے ہمارے ستاروں کی چال بگڑی اور ہماری تقدیر ہمیں مدھل کی طرف گھیر کر لے گئی۔ ہم نے تمہارے خلاف نہیں اپنی قسمت کے خلاف تلواریں اٹھائی اور سلطان سے لڑ بیٹھے۔ ہم بیجا نگر سے تمہیں گرفتار کرنے کا ارادہ لے کر نکلے۔ لیکن یہ بھول گئے ہم سے اوپر ایک اور طاقت بھی ہے جو ہماری عظمت، ہمارے تمام جاہ و جلال کو تمہاری ٹھوکروں میں لا پھینکے گی۔ کاش ہم نے اُس اونچی عدالت کے فیصلے کا انتظار کیا ہوتا جس کے اشارے پر نرگ اور سورگ کے دروازے کھلتے ہیں۔ جو کزور سے کزور انسان کے دل کو بھی پہاڑوں کی تختی اور دیوتاؤں کی تختی عطا کرتی ہے۔ آج ہم شرمندہ ہیں۔ لیکن اگر ہم ٹھوکر نہ کھاتے تو اپنی آنکھوں میں تمہارے لئے آنسوؤں کی بجائے کیاں سے لاتے۔ تمہیں اپنی بیٹی کہہ کر کس طرح یاد کرتے۔ تم نے ہماری آتما کو روشنی بخشی اور ہماری آنکھوں کو عداوت کا پانی عطا کیا ہے۔ جس نے ہمارے من کی آلودگی دھو ڈالی ہے۔ تم نے ہمیں پھر سے انسان کا جنم دیا ہے۔ ہم نے سلطان کو اپنی بیٹی دے کر تمہیں اپنی بیٹی بنا لیا ہے یہ سودا مہنگا نہیں۔ آؤ میرے ساتھ آؤ راج محل میں چند رکنا تمہاری ہی راہ دیکھ رہی ہے۔“

پھر دیورائے بیجا نگر کی طرف پلٹا اور گھوڑے کی رکاب تھامے ہوئے ہوئے اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب راجکو رو بھی قریب آ گیا تھا۔ جب وہ محل کے دروازے پر آئے تو انسانوں کا ایک جھوم پرتھال کی سواری کو دیکھنے کے لئے اُٹھ آیا۔ نظارہ دیکھ کر سب لوگ حیران رہ گئے کہ کرناٹک کا مہاراج ان کا مہالئی پرتھال کی سواری کے ساتھ بٹکے پاؤں چل کر آیا تھا۔

پھر پرتھال۔۔۔۔۔ عین الملک، نظام الملک اور ارگو خاں کے ساتھ راج محل میں داخل ہوئے باقی سوار قلعہ کی طرف لوٹ گئے۔ یہاں راجا ونگرام نے ان کا سواگت کیا۔ پرتھال نے دو سلاطین ہی نہیں دو قوسوں کو بغل گیر کر دیا تھا۔

جونہی اُس نے راج محل کی دہلیز پر قدم رکھا ایک لڑکی بھاگ کر اس کے پاؤں پہ ڈھیر ہو گئی اور اس کے چرن چھو بنے لگی۔ پرتھال اچھل کر پیچھے ہٹی اس نے بے قیاس لگانے میں غلطی نہیں کی کہ وہ راجکمار کی چند رکنا کے سوا اور کوئی نہیں۔

”راجکمار! یہ تم نے کیا کیا۔ تمہارے چرن تو مجھے چھونے چاہئیں۔ تم اب سلطان

.....

مگر چدرکا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی وہ یولی۔

”پر تھاں دیوی! تم سچ دہوی ہو۔۔۔۔۔“

اچانک عجب سے ایک مہین مگر تیز آواز سنائی دی۔

”پر تھاں دیوی کی جے ہو۔“

جب پر تھاں نے گردن گھما کر دیکھا تو راج محل کے برآمدے میں طوطے کا بچہ نظر آیا اور اس کے ہونٹوں پہ ایک عجیب سی مسکراہٹ تیر گئی۔ شاید طوطے کو یہ فہرہ چدرکا ہی نے سکھایا تھا۔



تیسرے روز جب پر تھاں اپنے رستے کے ہمراہ بچا مگر سے لوٹی تو طوطے کا بچہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ معاہدہ کے مطابق دیورائے نے چدرکا کو رخصت کرنے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں اور بچا مگر کے دروازے سے لے کر سلطانی لشکر گاہ تک سات فرخ کے طویل فاصلہ میں دونوں طرف دکانیں سج رہی تھیں اور بھنی لشکری کرنا لگی سپاہیوں کے ساتھ اس بازار میں گھوم رہے تھے۔

جنگ خواب و خیال ہو کے رہ گئی تھی۔

پر تھاں یہ منظر دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی۔ اُسے کیا خبر تھی صرف تین ہی دن کے اندر بچا مگر کے باہر ایک عظیم الشان بازار بھی سج رہا ہوگا۔

لوگ رستے سے بچے گئے اور وہ اپنے جنگی بہادروں کے ہمراہ اس بازار کو طے کرتی ہوئی لشکر گاہ تک آ پہنچی۔ سلطانی خیمہ سرا پر صدر جہاں امیر فضل اللہ شیرازی اور امیر الامراء احمد خاں خانخاناں نے اس کا استقبال کیا۔ امیر فضل اللہ کے استفسار پر اُس نے بتایا۔ مہاراجہ دیورائے راج محل میں سلطان عالی کی سواری کا منتظر ہے اور چدرکا کا سکھ پال تیار ہو رہا ہے۔

پھر وہ سلطان کی بارگاہ میں داخل ہوئی۔ وہ ایک چوبی ستون کے سہارے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پر تھاں نے اُسے چدرکا کا سلام پیش کیا۔

”بانو! اب تم ہزاری بارگاہ میں رہو گی اور دو روز کے لئے ان خیموں سے باہر نہیں نکلو گی۔“

”کیوں سلطان معظم.....“

اُس کے چہرے پر حیرت کروٹیں بدل رہی تھی۔

”بہنئی شہزادیوں کا یہی دستور ہے۔ حسن خاں رونق بیگ کے ہمراہ پرسوں ہی فیروز

آباد روانہ ہو گیا تھا۔ وہ بیگم جہاں، بیگم عالیہ اور تمہارے ماں باپ کو ساتھ لے کر آج شام

یہاں پہنچ جائے گا پھر ہماری بیٹی..... ہماری بہو بن جائے گی۔“

پر تعالٰیٰ ایک لمحہ سکتہ کی حالت میں کھڑی رہی۔ پھر طوطے کا بنجرہ اٹھائے اچانک پردہ

سرا کی طرف بھاگ گئی۔

”ہانو..... یاد رکھو کہیں جانن عالم کو بھی بنجرے میں بند نہ کر لیتا، اور دور سے طوطے

کی آواز سنائی دی۔

”جے ہو.....“

ختم شد

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام